از احسان علم القرآن

حصہ ہفتم (۷)

خزینۃ العرفان

فی

تفسیر القرآن

سورۃ حج سے سورۃ عنکبوت تک کی ان آیات کی تفسیر وغیرہ جو

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تصانیف میں بیان فرمائی ہے

خاکسار محمد فخر الدین احمدی ملتانی مہتمم کتاب گھر قادیان نے مرتب کر کے

عام پریس لاہور میں باہتمام منظور الزمان پرنٹر چھپوا کر شائع کیا

قیمت دو روپے — یکم اپریل ۱۹۳۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اظہار حقیقت

پورے چار سال کے طویل عرصہ کے گذرنے پر آج پھر اپنا اظہار مقصد اس مقدس کام کے متعلق لکھنے کا موقعہ پا رہا ہوں احباب کی مسلسل بے توجہی اور میری مالی مشکلات کا تسلسل ہرگز اس حرکات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ بقیہ حصہ تفسیر مسیح موعود کو مکمل کر سکوں بلکہ میں اپنی طرف سے اپنی اولاد کو وصیت کر چکا تھا کہ جب کبھی توفیق ملے میرے اس شروع کردہ کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دینا شاید کہ یہی ایک کام ہی پسندیدہ درگاہ رب العالمین ہو کر میرے لئے وسیلہ نجات بنے مگر قربان جاؤں اپنے مالک حقیقی کے کہ اس حی قیوم نے ایکدفعہ اور سہارا بخشا۔ اور اس تفسیر کے وہ چار خاص قدردان دوستوں نے جنمیں سے ایک معزز غیر احمدی بھی ہیں اس تعویق میں گھبرا گھبرا کر مجھے بعد اصرار کہا اور بعض دفعہ غیرت بھی دلائی کہ خواہ کچھ ہی ہو اس کام کو جب شروع کیا ہے تو اسکو پورا کرو مگر اپنی غیر معمولی مالی مشکلات کو دیکھ کر جرأت نہیں پڑ رہی تھی۔ کیونکہ پہلے حصص جو صرف پانچ پانچ سو چھپے رہے ان میں سے بعض حصص تین سو تک کی تعداد میں باقی پڑے ہیں۔ اسلئے میں کس برتے پر اس کام کو سرانجام دیتا۔ پھر بھی بنے اس معیت کے زیر اصرار کے ماتحت اپنے محسن حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ بنصرہ کی خدمت میں عرض کیا۔ تو حضور نے ازراہ لطف مندرجہ ذیل چٹھی اپنے خاص دوستوں کے نام تحریر فرمائی جسکا اثر میری شومئی قسمت سے چند گنتی کے دوستوں تک محدود رہا۔ اور میری وہ امیدیں جو اس پیارے نام سے وابستہ تھیں مایوسی سے بدل گئیں ممکن ہے کہ مجھ سے اس گشتی چٹھی کے پہنچانے میں کوئی کوتاہی واقع ہو گئی ہو۔ تاہم میری اپنی کسی غلطی کے نتیجہ میں ایسی پرزور سفارش بے اثر رہی وہ چٹھی یہ تھی۔

"برادران جماعت احمدیہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ میاں فخر الدین صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تفسیر قرآن مختلف کتب سے اکٹھی کر کے شائع کر رہے ہیں۔ یہ کام نہایت مفید اور بابرکت ہو مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک احباب نے اسکی طرف پوری توجہ نہیں کی جسکی وجہ سے وہ ادھورا رہ گیا ہے۔ احباب کو چاہئے کہ اس کام میں انکا ہاتھ بٹائیں۔ میں بھی انشاء اللہ پانچ جلدیں اس کتاب کی جوں جوں چھپتی جائنگی لیتا جاؤنگا۔ والسلام خاکسار مرزا محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی [illegible]

مگر اس چٹھی نے میری اپنی ذات پر کیمیاوی رنگ میں بجلی کا اثر کیا۔ اور وہ طاقت پیدا کر دی کہ جسکا نتیجہ یہ حصہ ہفتم ہے محض اسی مقدس چٹھی کی بنا پر نہ کہ خریداروں کے بہم پہنچنے کی بنا پر میں نے توکل علی اللہ اس کام کو شروع کر دیا۔ اور آج دو تین ماہ کے قلیل عرصہ میں اس حصہ کو طیار کر دینے کا فخر حاصل کر رہا ہوں آگے قدردانی یا ناقدری دوستوں کے ہاتھ ہے۔ باقی صرف دو تین پارے رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی انشاء اللہ جلسہ [illegible] تک طیار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس تفسیر کے [illegible] خریدار [illegible] میری اس [illegible] قبول فرما کر موجب سعادت دارین بنائے آمین!

خاکسار فخر الدین ملتانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

۱/۲۲ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○

ساعت سے مراد قیامت بھی ہوگی ہم کو اس سے انکار نہیں مگر اس میں سکرات الموت بھی مراد ہے کیونکہ انقطاع تام کا وقت ہوتا ہے۔ انسان اپنے محبوبات و مرغوبات سے یکدفعہ الگ ہوتا ہے۔ اور ایک عجیب قسم کا زلزلہ اس پر طاری ہوتا ہے۔ گویا اندر ہی اندر وہ ایک شکنجہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کی تمامتر سعادت یہی ہے کہ وہ موت کا خیال رکھے۔ اور دنیا اور اسکی چیزیں اسکی ایسی محبوبات نہ ہوں۔ جو اس آخری ساعت میں علیحدگی کے وقت اس کی تکلیف کا موجب ہوں۔ دنیا اور اسکی چیزوں کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے ؎

ایں ہمہ در گفت آہنگ ۔۔۔ گاہ بصلح کشند گاہ بجنگ

الحکم ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء

۶/۲۲ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ط

یعنی اے بنی آدم تم دو گروہ ہو۔ ایک وہ جو پیرانہ سالی سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں۔ یعنے

پیر فرتوت ہو کر نہیں مرتے۔ بلکہ پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ دوسرا وہ گروہ جو اس قدر بڈھے ہو جاتے ہیں جو ایک ارذل حالت زندگی کی جو قابل نفرت ہو۔ ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عالم اور صاحب عقل ہونے کے بعد سراسر نادان بچے کی طرح بن جاتے ہیں۔ اور تمام عمر کا آموختہ یکدفعہ سب بھول جاتے ہیں ؎

اب چونکہ خدا تعالیٰ نے طرز حیات کے بارے میں بنی آدم کے صرف دو گروہوں میں تقسیم محدود کر دی۔ تو بہر حال حضرت مسیح ابن مریم خدا تعالیٰ کے تمام خاکی بندوں کی طرح اس تقسیم سے باہر نہیں رہ سکتے۔ یہ حکیمار کا قانون قدرت نہیں جو کوئی اسکو رد کر دے گا۔ یہ تو سنت اللہ ہے جسکو خود اللہ جلشانہ نے تصریح سے بیان فرما دیا ہے ؎

سو اس تقسیم الٰہی کی رو سے لازم آتا ہے۔ کہ یا تو حضرت مسیح مِنْكُم مَّنْ يُتَوَفَّىٰ میں داخل ہوں اور وفات پا کر بہشت بریں میں اس تخت پر بیٹھے ہوں۔ جسکی نسبت انہوں نے آپ ہی انجیل میں بیان فرمایا ہے اور یا اس قدر مدت تک فوت نہیں ہوئے تو زمانہ کی تاثیر سے اس ارذل عمر تک پہنچ گئے ہوں۔ جسمیں بباعث بیکاری حواس ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ؎ ازالہ صفحہ ۳۲۶

"یعنی تم پر دو ہی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ بعض تم میں سے قبل از پیرانہ سالی فوت ہو جاتے ہیں اور بعض ارذل عمر تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ صاحب علم ہونے کے بعد بعض نادان ہو جاتے ہیں اب اگر خلاف اس نص صریح کے کسی کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاوے کہ باوجود اس کے عمر طبعی سے صدہا حصہ زیادہ اس پر زمانہ گذر گیا مگر وہ نہ مرا۔ اور نہ ارذل عمر کو پہنچا۔ اور نہ ایک ذرہ امتداد زمانہ نے اس پر اثر کیا۔ تو ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا اس شخص کے ذمہ ثبوت ہوگا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے۔ یا ایسا عقیدہ رکھتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے تو کسی جگہ انسانوں کے لئے یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ بعض انسان ایسے بھی ہیں۔ جو معمولی انسانی عمر سے صدہا درجہ زیادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور زمانہ اس پر اثر کر کے انکو ارذل عمر تک نہیں پہنچاتا۔ اور نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کا مصداق نہیں ٹھیراتا۔ پس جبکہ یہ عقیدہ ہمارے آقا و مولا کی عام تعلیم سے صریح مخالف ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو شخص اسکا مدعی ہو۔ ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ غرض تعلیم قرآنی عمر طبعی کے اندر اندر مر جانا اور زمانہ کے اثر سے

عمر کے مختلف حصوں میں گوناگون تغیرات کا لحاظ ہونا یہاں تک کہ بشرط زندگی ارذل عمر تک پہنچنا ایک فطرتی اور اصلی امر ہے۔ جو انسان کی فطرت کو لگا ہوا ہے۔ جس کے بیان میں قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ الحق دہلی صد ۶۰

"اس آیت سے حضرت عیسٰے کی موت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں باوجود تکرار مضمون اس آیت کے یہ فقرہ کہیں نہیں آیا۔ کہ مِنْكُمْ مَنْ صَعِدَ اِلَى السَّمَاءِ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ یعنی تم میں سے ایک وہ بھی ہے۔ جو جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چڑھ گیا آخری زمانہ میں دنیا میں واپس آئے گا۔ پس اگر یہ سچ ہے۔ کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام بجسم عنصری آسمان پر چلے گئے تو قرآن شریف کی یہ آیت ناتمام رہیگی۔ کیونکہ آسمان پر چڑھنے کی نسبت خدا نے اس آیت یا کسی دوسری آیت میں ذکر نہیں کیا۔ اور اگر در حقیقت خدا کی یہ بھی سنت تھی۔ تو تکمیل بیان کیلئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ اور جبکہ کئی دفعہ قرآن شریف میں جوان یا بوڑھا کر کے مارنے کا ذکر آچکا ہے۔ تو اس کے ساتھ اس عادت اللہ کا بیان نہ کرنا کہ کسی کو آسمان پر آباد بھی کیا جاتا ہے۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی کو مع جسم آسمان پر آباد کرنا خدا تعالیٰ کی سنتوں میں سے نہیں ہے۔ ایام الصلح صفحہ ۱۴۰

۱۹ ع ۱ / ۲۲ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْاۤ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

اہل اسلام جو ایمان لائے ہیں۔ جنہوں نے توحید خالص اختیار کی اور یہود جنہوں نے اولیاء اور انبیاء کو اپنا قاضی الحاجات ٹھیرا لیا۔ اور مخلوق چیزوں کو کارخانۂ خدائی میں شریک مقرر کیا اور صابئین جو ستاروں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور نصاریٰ جنہوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے اور مجوس جو آگ اور سورج کی پرستار ہیں۔ اور باقی تمام مشرک جو طرح طرح کے شرک میں گرفتار ہیں۔ خدا ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ خدا ہر ایک چیز پر شاہد ہے اور خود مخلوق

پرستوں کا باطل ہونا کچھ پوشیدہ بات نہیں۔ یہ امر نہایت بدیہی ہے۔ اور ہر ایک شخص ذاتی توجہ سے دیکھ سکتا ہے۔ کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں اجرام فلکی اور اجسام ارضی و نباتات اور جمادات اور حیوانات اور عناصر اور چاند اور سورج اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور طرح طرح کے جاندار اور انسان ہیں جن کی مشرک لوگ پوجا کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں خدا کو سجدہ کرتی ہیں یعنی اپنی ہستی اور بقا اور وجود میں اسکی محتاج پڑی ہوتی ہیں۔ اور بہ تذلل تمام اسکی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ اور ایکدم اس سے بے نیاز نہیں پس انہیں چیزوں سے جو آپ ہی حاجتمند ہیں۔ حاجتیں مانگنا صریح گمراہی ہے۔ اور بعض انسان جو سرکش ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی تذلل سے خالی نہیں۔ کیونکہ اسی دنیا میں طرح طرح کے آلام اور اقسام اور افکار اور ہموم کا عذاب ان پر نازل ہوتا رہتا ہے اور آخرت کا عذاب بھی ان کے لئے طیار ہے۔ پھر بجز خدا کے کونسی چیز ہے جس کے وجود پر نظر کرنے سے صفت غنی اور بے نیاز ہونے کی اس میں پائی جاتی ہے۔ تا کوئی اسکو اپنا معبود ٹھیراوے اور جبکہ کوئی چیز بجز خدا کے غنی اور بے نیاز نہیں۔ تو تمام مخلوق پرستوں کا باطل ہونا ثابت ہے۔

براہین احمدیہ صہ ۴۳۸

۲۷/۲۲ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ

خدا تعالیٰ کا یہ قول کر یاد کر جب ہم نے ابراہیم کو دوبارہ بنانے کے لئے وہ مکان دکھلایا جہاں ابتدا میں بیت اللہ تھا۔ یہ قول صاف بتلا رہا ہے کہ مکہ دنیا میں پہلی عمارت ہے۔ پس مردہ کی طرح چپ مت ہو اور جاگنے والوں کیطرح ہو۔ پس حاصل کلام یہ کہ مکہ دنیا میں پہلی عمارت تھی۔ منن الرحمان صفحہ ۸۹

۳۱/۲۲ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝

سو اس پلیدی سے جو بت ہیں پرہیز کرو۔ اور دروغگوی سے باز آؤ۔ براہین صہ ۴۳۷

؍؍ یعنے اس وقت اس نصیحت کی حاجت نہیں کہ تم خون نہ کرو۔ کیونکہ بجز نہایت شریر آدمی کے

کون ناحق کے خون کیطرف قدم اٹھاتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ نا انصافی پر ضد کرکے سچائی کا خون نہ کرو۔ حق کو قبول کرلو۔ اگرچہ ایک بچہ سے اور اگر مخالف کی طرف حق پاؤ۔ تو پھر فی الفور اپنی خشک منطق کو چھوڑ دو۔ سچ پر ٹھیر جاؤ۔ اور سچی گواھی دو۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ھے اِجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ یعنی بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹ سے بھی کہ وہ بت سے کم نہیں۔ جو چیز قبلہ حق سے تمہارا منہ پھیرتی ہے وہی تمہارے راہ میں بت ہیں۔ ازالہ صفحہ ۸۳۱

” بتوں کی پرستش اور جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو یعنی جھوٹ بھی ایک بت ہے جس پر بھروسہ کرنے والا خدا کا بھروسہ چھوڑ دیتا ہے۔ سو جھوٹ بولنے سے خدا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ فلاسفی اسلام صفحہ ۱۲۶

” قرآن شریف نے دروغگوئی کو بت پرستی کے برابر ٹھیرایا ھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ یعنی بتوں کی پلیدی اور جھوٹ کی پلیدی سے پرہیز کرو۔ نور القرآن جلد دوم صـ۱۱

۲۸/۲۲ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

راستباز لوگ روح اور روحانیت کی رو سے خدا تعالےٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ نہ یہ کہ ان کا گوشت اور پوست اور انکی ہڈیاں خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ خدا تعالےٰ خود ایک آیت میں فرماتا ہے۔ کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ الآیۃ یعنی خدا تعالیٰ تک گوشت اور خون قربانیوں کا ہرگز نہیں پہنچتا۔ بلکہ اعمال صالحہ کی روح جو تقویٰ اور طہارت ہے۔ وہ تمہاری طرف سے پہنچتی ہے۔ ازالہ اوہام صـ۲۲۵

"پس ہم اس نجات کے لئے نہ کسی خون کے محتاج ہیں۔ اور نہ کسی صلیب کے حاجتمند اور نہ کسی کفارہ کی ہمیں ضرورت ہے۔ بلکہ ہم صرف ایک قربانی کے محتاج ہیں۔ جو اپنے نفس کی قربانی ہے جسکی ضرورت کو ہماری فطرت محسوس کر رہی ہے۔ ایسی قربانی کا دوسرے لفظوں میں نام اسلام ہے۔ اسلام کے معنی ہیں ذبح ہونے کے لئے گردن آگے رکھ دینا۔ یہ پیارا نام تمام شریعت کی روح اور تمام احکام کی جان ھے۔ ذبح ہونے کے لئے اپنی دلی خوشی اور رضا سے گردن آگے رکھ دینا کامل محبت اور کامل عشق کو چاہتا ہے۔ اور کامل محبت کامل معرفت کو چاہتی ھے۔

پس اسلام کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ صریح کرتا ہے کہ حقیقی قربانی کے لئے کامل معرفت اور کامل محبت کی ضرورت ہے۔ نہ کسی اور چیز کی ضرورت۔ اس کی طرف خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے۔ لن ینال اللّٰہ لحومہا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔ یعنی تمہاری قربانیوں کے نہ گوشت میرے تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ خون بلکہ یہ قربانی میرے تک پہنچتی ہے کہ تم مجھ سے ڈرو۔ اور میرے لئے تقویٰ اختیار کرو۔ لیکچر لاہور صفحہ

"راستباز لوگ روح اور روحانیت کی رو سے خدا تعالیٰ کیطرف اُٹھائے جاتے ہیں۔ نہ یہ کہ ان کا گوشت اور پوست اور اُنکی ہڈیاں خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ خود ایک آیت میں فرماتا ہے۔ لن ینال اللّٰہ الآیۃ۔ یعنی خدا تک گوشت اور خون قربانیوں کا ہرگز نہیں پہنچتا۔ بلکہ اعمال صالحہ کی روح جو تقویٰ اور طہارت ہے وہ تمہاری طرف سے پہنچتی ہے۔

ازالہ اوہام صفحہ ۲۸۸

پ ۱۷ ع ۱۳ ۳۹-۴۰ / ۲۲ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۝ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّہُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ

عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝

خدا کا ارادہ ہے کہ کفار کی بدی اور ظلم کو مومنوں سے دفع کرے یعنی مومنوں کو دفاعی جنگ کی اجازت دے بتحقیق خدا خیانت پیشہ ناشکر لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ خدا ان مومنوں کو لڑنے کی اجازت دیتا ہے جن پر کافر قتل کرنے کے لیے چڑھ چڑھ کے آتے ہیں۔ اور خدا حکم دیتا ہے کہ مومن بھی کافروں کا مقابلہ کریں۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور خدا انکی مدد پر قدرت رکھتا ہے یعنی اگرچہ تھوڑے ہیں۔ مگر خدا انکی مدد پر قادر ہے۔ یہ قرآن شریف میں وہ پہلی آیت ہے۔ جس میں مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ آپ خود سوچ لو کہ اس آیت سے کیا نکلتا ہے۔ کیا لڑائی کے لئے خود سبقت کرنا یا مظلوم ہونے کی حالت میں اپنے بچاؤ کیلئے بمجبوری مقابلہ کرنا۔ چشمہ معرفت ص۱۹۰

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝

یعنی جن مسلمانوں پر ناحق قتل کرنے کے لئے چڑھائی کی جاتی ہے۔ خدا نے دیکھا کہ وہ مظلوم ہیں اسلئے خدا بھی انکو مقابلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ چشمہ معرفت ص۱۹۱

" اب ہم ایک اور بات ان جاہلوں کو سناتے ہیں کہ جو خواہ نخواہ جبر کا الزام خدا کے کلام پر دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مکہ کے رہنے والے کل کفار اور نیز دیہاتی اور گرد و نواح کے لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے اس زمانہ میں کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے۔ اور کوئی جنگ شروع نہ تھا، کئی مسلمان ناحق قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور ان مظلوموں کا خون انکی گردن پر تھا۔ اور درحقیقت وہ سب اس گناہ میں شریک تھے کیونکہ بعض قاتل اور بعض ہمراز اور بعض معاون تھے۔ اس وجہ سے وہ لوگ خدا کے نزدیک قتل کے لائق تھے۔ کیونکہ اس قسم کی شرارتیں حد سے گذر گئی تھیں۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا گناہ ان کا یہ تھا۔ کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اقدام قتل کے مرتکب تھے۔ اور

انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دیں پس ان گناہوں کیوجہ سے وہ خدا کی نظر میں واجب القتل ٹھیر چکے تھے۔ اور ان کا قتل کرنا عین انصاف تھا کیونکہ وہ جرم قتل اور اقدام قتل کے مرتکب ہو چکے تھے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جو برابر تیرہ برس رہ کر ان میں وعظ کرتے رہے۔ اور نیز آسمانی نشان دکھلاتے رہے اس صورت میں خدا کی حجت ان پر پوری ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے خدا نے جو رحیم و کریم ہے انکی نسبت یہ حکم دیا تھا۔ کہ وہ اگرچہ اپنے جرائم کیوجہ سے بہر حال قتل کرنے کے لائق ہیں لیکن اگر کوئی ان میں سے خدا کی کلام کو سنکر اسلام قبول کرے تو یہ قصاص اس کو معاف کیا جاوے۔ ورنہ اپنے گناہوں کی سزا میں جو قتل اور اقدام قتل ہے۔ وہ بھی قتل کئے جائینگے اب بتلاؤ اس میں کونسا جبر ہے؟ جس حالت میں وہ لوگ جرم قتل اور اقدام قتل کیوجہ سے بہر حال قتل کے لائق تھے۔ اور یہ رعایت قرآن شریف نے ان کو دی۔ کہ اسلام لانے کی حالت میں وہ قصاص دور ہو سکتا ہے۔ تو اس میں جبر کیا ہوا۔ اور اگر یہ رعایت نہ دی جاتی تو ان کا قتل کرنا بہر حال ضروری تھا۔ کیونکہ وہ قاتل اور اقدام قتل کے مرتکب تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ھے۔ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا۔ وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر یعنی ہم ان لوگوں کو جو ناحق قتل کئے جاتے ہیں۔ اجازت دیتے ہیں۔ کہ اب وہ بھی قاتلوں کا مقابلہ کریں۔ یعنی ایک مدت تک تو مومنوں کو مقابلہ کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور وہ مدت تیرہ برس تھی۔ اور جب بہت سے مومن قتل ہو چکے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقدام قتل کے بھی کافر لوگ مرتکب ہوئے تب تیرہ برس کے مصائب اٹھانے کے بعد مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ چشمہ معرفت صفحہ ۲۲۵

” وشما شنیدہ اید کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم تا مدتے بر گردن کشی کافران فاجران صبر کردید واز ایشاں بسیارے از ظلم و اذیت گوناگون سختی و صعوبت دید تا آنکہ اورا از مکہ معظمہ بیروں کردند۔ باز لطور تعاقب بہ نیت قتل سوئے او بتمامتر غضب شتافتند پس آنحضرت صلے اللہ علیہ آلہ وسلم آن صبر اختیار کرد۔ کہ نظیر آں در پیغمبران پیشین یافتہ

نمیشود۔ تا آنکہ ایذا بنہایت رسید۔ و مدت آں دراز کشید پس درآں وقت ایں آیت از خدائے سمیع و خبیر نازل شد و مضمون آیت ایں است۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ ۝

کہ آں گروہے را اجازت مقابلہ میدہیم۔ کہ مظلوم اند۔ و خدا قادر است کہ ایشاں را مدد دہد۔

پس بنگرید کہ چگونہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بر ظلم کافراں تا روزگارے دراز صبر کرد۔ و جواب بدی بہ نیکی داد۔ تا آنکہ حجت خدائے جزا دہندہ با تمام رسید۔ و ہمہ عذر کافراں منقطع شد۔ پس بدانید کہ خدا تعالیٰ مثل آں قصاب نیست کہ بغیر جرمے گوسپندرا مے کشد۔ بلکہ او حلیم و عادل است کہ بغیر اتمام حجت ہیچکس را نمیگیرد۔

انجام آتھم صفحہ ۱۳۹

"سارا قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ اور صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے کہ جن لوگوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ آلہ وسلم کے وقت لڑائیاں کی گئیں۔ وہ لڑائیاں دین کو جبراً شائع کرنے کے لئے نہیں تھیں۔ بلکہ یا تو بطور سزا کے تھیں یعنی ان لوگوں کو سزا دینا منظور تھا۔ جنہوں نے ایک گروہ کثیر مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ اور بعض کو وطن سے نکال دیا تھا۔ اور نہایت سخت ظلم کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیرہ

یعنی ان مسلمانوں کو جن سے کفار جنگ کر رہے ہیں۔ بسبب مظلوم ہونے کے مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور خدا قادر ہے کہ جو انکی مدد کرے۔ کشتی نوح صفحہ ۶۸

۴۲ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝

" لڑائی کے سلسلہ کو دیکھنا از بس ضروری ہے۔ اور جبتک آپ سلسلہ کو نہ دیکھیں گے

اپنے تئیں عمداً یا سہواً بڑی غلطی میں ڈالو گے۔ سلسلہ تو یہ ہے کہ اول کفار نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر کے آخر اپنے حملوں کی وجہ سے ان کو مکہ سے نکالدیا۔ اور پھر تعاقب کیا۔ اور جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو پہلا حکم جو لڑائی کے لئے نازل ہوا وہ یہ تھا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ یعنی ان لوگوں کو مقابلہ کی اجازت دیگئی جن کے قتل کے لئے مخالفوں نے چڑھائی کی۔ اس وجہ سے اجازت دی گئی۔ کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور خدا مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے وطنوں سے ناحق نکالے گئے۔ اور ان کا گناہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ انہوں نے کہا جو ہمارا رب اللہ ہے۔

جنگ مقدس صفحہ ۱۴۴

" پہلے کفار نے ابتدا کر کے صدہا مومنوں کو تکلیفیں دیں۔ قتل کیا۔ وطنوں سے نکالا۔ اور پھر تعاقب کیا۔ اور جب ان کا ظلم حد سے بڑھ گیا۔ اور ان کے جرائم خدا تعالیٰ کی نظر میں سزا دہی کے لائق ٹھیر گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل کی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝ یعنی جن لوگوں پر یعنی مسلمانوں پر ظلم ہوا اور ان کے قتل کے لئے اقدام کیا گیا۔ اب اللہ تعالیٰ بھی انہیں مقابلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ پھر چونکہ عرب کے لوگ بباعث ناحق کی خونریزیوں کے جو وہ پہلے کر چکے تھے اور بری بری ایذاؤں سے مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ اس لئے ایک شخصی قصاص کے وہ مستحق ہو گئے تھے۔ اور اس لائق تھے کہ جیسا انہوں نے مسلمانوں کو اپنے وطنوں سے نکال کر تباہی میں ڈالا۔ اور ان کے مالوں اور جائیدادوں اور گھروں پر قبضہ کر لیا۔ ایسا ہی ان کے ساتھ

بھی کیا جاوے لیکن خدا تعالیٰ نے رحم کے طور پر جیسی اور رعایتیں کی ہیں۔ کہ ان کے بچے نہ مارے جائیں اور ان کی عورتیں نہ قتل ہوں۔ ایسا ہی یہ بھی رعایت کردی۔ کہ اگر ان میں سے مقتول ہونے سے پہلے خود بخود ایمان لے آوے۔ تو وہ اس سزا سے بچایا جاوے۔ جو بوجہ اس کے پہلے جرائم اور خونریزیوں کے اس پر واجب ہوئی تھی۔ اس بیان سے سارا قرآن شریف بھرا ہوا ہے جیسا ہی آیت جو پیش کر چکا ہوں صاف صاف بیان فرما رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ دوسری آیت بھی یعنے الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ یعنی وے مظلوم جو اپنے وطنوں سے بیگناہ نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ جنگ مقدس ص ۱۵۱

" اللہ تعالیٰ بعض مصالح کے رو سے ایک فعل کرتا ہے۔ اور آئندہ جب وہ فعل معرض اعتراض ٹھیرتا ہے۔ تو پھر وہ فعل نہیں کرتا۔ اولاً ہمارے رسول نے کوئی تلوار نہ اٹھائی۔ مگر ان کو سخت سے سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ تیرہ سال کا عرصہ ایک بچے کو بالغ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور مسیح کی میعاد تو اگر اس میعاد میں سے دس نکال دیں۔ تو بھی کافی ہوتی ہے۔ غرض اس لمبے عرصے میں کوئی یا کسی رنگ کی تکلیف نہ تھی جو اٹھانی نہ پڑی۔ آخر کار وطن سے نکلے۔ تو تعاقب ہوا۔ دوسری جگہ پناہ لی۔ تو دشمن نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ جب یہ حالت ہوئی۔ تو مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے یہ حکم ہوا۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ جن لوگوں کے ساتھ لڑائیاں خواہ مخواہ کی گئیں

اور گھروں سے نکالے گئے صرف اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب ہے۔ سو یہ ضرورت تھی کہ تلوار اٹھائی گئی۔ ورنہ آنحضرت کبھی تلوار نہ اُٹھاتے۔ ہاں ہمارے زمانہ میں ہمارے برخلاف قلم اُٹھائی گئی اور قلم سے ہم کو اذیت دی گئی۔ اور سخت ستایا گیا۔ ان کے مقابل قلم ہی ہمارا حربہ ہے۔ تحفہ سالانہ صفحہ ۵۵۔

" آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جنگ کئے وہ صرف دفاعی تھے۔ جب آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہ کی تکالیف حد سے بڑھ گئیں اور بہت ستائے گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے مقابلہ کا حکم دیا۔ چنانچہ پہلی آیت جو جہاد کے متعلق ہے وہ یہ ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ۟ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ یعنی ان لوگوں کو مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ جن کے مقابلہ پر قتل کے لئے مخالفوں نے چڑھائی کی۔ (اسلئے اجازت دی گئی) کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔ ان کا گناہ بجز ان کے اور کوئی نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ غرض آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لڑائیاں اُسوقت تھیں جبکہ کفار کے ظلم انتہا تک پہنچ گئے۔ الحکم ۲۴۔ دسمبر ۱۹۰۲ء صہ ۹

" وہ لوگ جو تمہارے ناحق کے جنگوں اور قتل کے ارادوں سے ظلم رسیدہ ہیں۔ ان کی نسبت مدد دینے کا حق ہو چکا ہے۔ اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ براہین صہ ۲۳۸

۱۹۰۷/۴/۲۲ بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے۔ جب ایسی تعلیم سنتے ہیں۔ تو اور کچھ نہیں تو یہی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں اگر ہمدردی کی تعلیم ہوتی۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

لڑائیاں کیوں کرتے وہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے جو جنگ کئے وہ تیرہ برس تک خطرناک دُکھ اور تکلیف پر تکلیف اُٹھانے کے بعد کئے اور وہ بھی صرف مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک ان کے ہاتھوں سے آپ تکلیف اُٹھاتے رہے۔ ان کے عزیز دوست اور یاروں کو سخت سخت عذاب دیا جاتا رہا اور جور و ظلم کا کوئی بھی ایسا پہلو نہ رہا جو کہ مخالفوں نے ان کے لئے نہ برتا ہو۔ یہاں تک کہ کئی مسلمان مرد اور کئی مسلمان عورتیں ان کے ہاتھ سے شہید بھی ہو گئے۔ اور ان کے ہر وقت کے ایسے شدید ظلموں سے تنگ آکر بحکم الٰہی شہر بھی چھوڑنا پڑا۔ جب مدینہ منورہ کو تشریف لیگئے اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جب ان کے ظلموں اور شرارتوں کی بات انتہا تک پہنچ گئی۔ تو خدا تعالےٰ نے مظلوم قوم کو اس مظلومانہ حالت میں مقابلہ کا حکم دیا۔ اور وہ بھی اسلئے کہ شریر اپنی شرارت سے باز آجائیں۔ اور ان کی شرارت سے مخلوق خدا کو بچایا جائے۔ اور ایک حق پرست قوم اور دین حق کے لئے راہ کھُل جاوے۔ ورنہ کوئی بتلاوے کہ مکّہ میں تیرہ سال تک رہ کر کیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کا باپ مارا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ آلہ وسلم نے کبھی بھی کسی کے لئے بدی نہیں چاہی۔ آپ تو رحم مجسّم تھے۔ اگر بدی چاہتے۔ تو جب آپ نے انہی ظالموں پر پورا تسلّط حاصل کر لیا تھا اور شوکت اور غلبہ آپ کو مل گیا تھا۔ تو آپ ان تمام ظالم آئمّتہ الکفر کو جو ہمیشہ آپ کو دکھ دیتے رہتے۔ اور بغاوت پر تلے رہتے تھے۔ قتل کروا دیتے تو کون پوچھتا تھا۔

تقریر ص ۲۸

حاشیہ

الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ○

ترجمہ :- اجازت دی گئی ہے ان لوگوں کو جن کے ساتھ لڑائی کی جاتی ہے (جنکو شریر بیگناہ ستاتے ہیں۔ اسلئے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ انکی مدد پر اندازہ کر چکا ہے جو لوگ نکالے گئے اپنے

" چونکہ مسلمان اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھوڑے تھے۔ اس لئے ان کے مخالفوں نے بباعث اس تکبر کے جو فطرتاً ایسے فرقوں کے دل اور دماغ میں جاگزین ہوتا ہے۔ جو اپنے تئیں دولت میں مال میں کثرت جماعت میں عزت میں مرتبت میں دوسرے فرقوں سے برتر خیال کرتے ہیں۔ اُس وقت کے مسلمانوں یعنے صحابہ سے سخت دشمنی کا برتاؤ کیا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ آسمانی پودہ زمین پر قائم ہو۔ بلکہ وہ راستبازوں کے ہلاک کرنے کے لئے اپنے ناخنوں تک زور لگا رہے تھے۔ اور کوئی دقیقہ آزار رسانی کا اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ اور ان کو خوف یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مذہب کے پیر جم جائیں۔ اور پھر اسکی ترقی ہمارے مذہب اور قوم کی بربادی کا موجب ہو جائے۔ سو اسی خوف سے جو ان کے دلوں میں ایک رعبناک صورت میں بیٹھ گیا تھا۔ نہایت جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیاں ان سے ظہور میں آئیں۔ اور انہوں نے دردناک طریقوں سے اکثر مسلمانوں کو ہلاک کیا اور ایک زمانہ دراز تک جو تیرہ برس کی مدت تھی انکی طرف سے یہی کارروائی رہی اور نہایت بیرحمی کی طرز سے خدا کے وفادار بندے اور نوع انسان کے فخر ان شریر درندوں کی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ اور یتیم بچے اور عاجز اور مسکین عورتیں کوچوں اور گلیوں میں ذبح کئے گئے۔ اسپر بھی خدا تعالےٰ کیطرف سے قطعی طور پر یہ تاکید تھی۔ کہ شر کا ہرگز مقابلہ نہ کرو۔ چنانچہ ان برگزیدہ راستبازوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے خونوں سے کوچے سُرخ ہو گئے۔ پر انہوں نے دم نہ مارا وہ قربانیوں کیطرح ذبح کئے گئے۔ پر انہوں نے آہ نہ کی۔ خدا کے پاک اور مقدس رسول کو جسپر زمین اور آسمان سے بیشمار سلام ہیں۔ بارہا پتھر مار مار کر خون سے آلودہ کیا گیا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳

گھروں سے سوائے کسی حق کے۔ مگر یہ کہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے۔ اور اگر اللہ تعالےٰ بعض آدمیوں کے ذریعہ دوسروں کی شرارت کی مدافعت نہ کرتا تو تمام گرجے اور کلیسے اور عبادت گاہ اور مسجدیں گرائی جاتیں۔ تقریریں صـ ۲۶

مگر اس صدق استقامت کے پہاڑ نے ان تمام آزاروں کی دلی انشراح اور محبت سے برداشت کی اور ان صابرانہ اور عاجزانہ روشوں سے مخالفوں کی شوخی دن بدن بڑھتی گئی اور انہوں نے اس مقدس جماعت کو اپنا ایک شکار سمجھ لیا۔ تب اس خدا نے جو نہیں چاہتا تھا کہ زمین پر بے رحمی حد سے گذر جائے۔ اپنے مظلوم بندوں کو یاد کیا۔ اور اس کا غضب شریروں پر بھڑکا اور اس نے اپنی پاک کلام قرآن شریف کے ذریعہ سے اپنے مظلوم بندوں کو اطلاع دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں میں تمہیں آج سے مقابلہ کی اجازت دیتا ہوں۔ اور میں خدائے قادر ہوں۔ ظالموں کو بے سزا نہیں چھوڑونگا یہ حکم تھا جس کا دوسرے لفظوں میں جہاد نام رکھا گیا۔ اور اس حکم کی اصل عبارت جو قرآن شریف میں اب تک موجود ہے۔ یہ ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۝ یعنی خدا نے ان مظلوم لوگوں کی جو قتل کئے جاتے ہیں۔ اور ناحق اپنے وطن سے نکالے گئے۔ فریاد سن لی۔ اور ان کے مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ اور خدا قادر ہے۔ جو مظلوم کی مدد کرے۔ مگر یہ حکم مختص الزمان والوقت تھا ہمیشہ کیلئے نہیں تھا۔ بلکہ اس زمانہ کے متعلق تھا۔ جبکہ اسلام میں داخل ہونے والے بکریوں اور بھیڑوں کیطرح ذبح کئے جاتے تھے۔ لیکن افسوس کہ نبوت اور خلافت کے زمانہ کے بعد اس مسئلہ جہاد کے سمجھنے میں جسکی اصل جڑ آیت کریمہ مذکورہ بالا ہے۔ لوگوں نے بڑی غلطیاں کھائیں۔ اور ناحق مخلوق خدا کو تلوار کے ساتھ ذبح کرنا دینداری کا شکار سمجھا گیا۔ جہاد صـ۳ـ۵

۲۲/۴۱ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

یعنی اگر خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہ ہوتی کہ بعض کو بعض کے ساتھ دفع کرتا۔ تو ظلم کی نوبت یہاں تک پہنچتی کہ گوشہ گزینوں کے خلوت خانے ڈھائے جاتے۔ اور عیسائیوں کے

گرجے مسمار کئے جاتے اور یہودیوں کے معبد نابود کئے جاتے۔ اور مسلمانوں کی مسجدیں جہاں کثرت سے ذکرِ خدا ہوتا ہے۔ منہدم کیجاتیں۔ اس جگہ خدا تعالیٰ یہ ظاہر فرماتا ہے کہ ان تمام عبادت خانوں کا میں ہی حامی ہوں۔ اور اسلام کا فرض ہے کہ اگر مثلاً کسی عیسائی ملک پر قبضہ کرے۔ تو ان کے عبادت خانوں سے کچھ تعرض نہ کرے۔ اور منع کر دے کہ ان کے گرجے مسمار نہ کئے جائیں۔ اور یہی ہدایت احادیث نبویہ سے مفہوم ہوتی ہے۔ کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ کوئی اسلامی سپہ سالار کسی قوم کے مقابلہ کے لئے مامور ہوتا تھا۔ تو اس کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے عبادت خانوں اور فقراء کے خلوت خانوں سے تعرض نہ کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کسقدر تعصب کے طریقوں سے دُور ہے۔ کہ وہ عیسائیوں کے گرجاؤں اور یہودیوں کے معبدوں کا ایسا ہی حامی ہے۔ جیسا کہ مساجد کا حامی ہے۔ ہاں البتہ اس خدا نے جو اسلام کا بانی ہے یہ نہیں چاہا کہ اسلام دشمنوں کے حملوں سے فنا ہو جائے۔ بلکہ اس نے دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے۔ اور حفاظت خود اختیاری کے طور پر مقابلہ کرنے کا اذن دے دیا ہے

(دیکھیے چشمہ معرفت صد ۲۲)

" وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ بعض کے شر کو بعض کی تائید کے ساتھ دفع نہ کرتا تو زمین فاسد ہو جاتی۔ جنگ مقدس صفحہ ۱۴۲ لہ۔

" وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ

یعنے وہ جو خدا تعالیٰ کی مدد کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ اُس کی مدد کرتا ہے۔ اب لغت دیکھیے۔ آیت کے لفظ لَيَنْصُرَنَّ کے آخر میں نون ثقیلہ ہے لیکن اگر اس آیت کے یہ معنے کریں کہ آئندہ کسی زمانہ میں اگر کوئی مدد کرے گا تو ہم اس کی مدد کریں گے۔ تو یہ معنی بالکل فاسد اور خلاف سنت مستمرہ الٰہیہ ٹھیریں گے۔ کیونکہ اللہ جلشانہ کی قدیم سے اور اسی زمانہ کہ جب بنی آدم پیدا ہوئے یہی سنت مستمرہ ہے۔ کہ وہ مدد کرنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ یوں کیونکر کہا جائے

کہ پہلے تو نہیں مگر آیندہ کسی نامعلوم زمانہ میں اس قاعدہ کا پابند ہو جائیگا۔ اور اب تک صرف وعدہ ہی ہے۔ عمل درآمد نہیں۔ سبحانک ھذا بھتانٌ عظیم الحق دہلی صـ۳۴

۴۸/۲۲ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ

خدا کے سات دنوں میں سے ہر ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔ حقیقۃ الوحی صـ۲۰۱

" یعنی ایک دن خدا کے نزدیک ہزار سال کے برابر ہے۔ تتمہ حقیقۃ الوحی صـ۲۵

" احادیث صحیحہ متواترہ کے رو سے عمر دنیا یعنی حضرت آدم سے لیکر اخیر تک سات ہزار برس قرار پائی تھی۔ اور قرآن شریف میں بھی آیت اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ میں اسی کیطرف اشارہ فرمایا۔ تحفہ گولڑویہ صـ۱۵۱

" ایک علامت قرآن شریف نے مسیح موعود کے زمانہ کے لئے قرار دی ہے۔ کہ ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ یعنی ایکدن خدا کا ایسا ہے کہ جیسا تمہارا ہزار برس ہے۔ پس چونکہ دن سات ہیں۔ اس لئے اس دنیا کی عمر سات ہزار برس قرار دی گئی ہے۔ لیکن عمر اس آدم کے زمانہ سے ہے۔ جس کی ہم اولاد ہیں خدا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دنیا تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ کون تھے۔ اور کس قسم کے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سات ہزار برس میں دنیا کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اور اسی امر پر نشان قرار دینے کے لئے دنیا میں سات دن مقرر کئے گئے۔ تا ہر ایک دن ایک ہزار برس پر دلالت کرے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دنیا پر اس طرح سے کتنے دور گذر چکے ہیں۔ اور کتنے آدم اپنے اپنے وقت میں آ چکے ہیں۔ چونکہ خدا قدیم سے خالق ہے۔ اس لئے ہم مانتے اور ایمان لاتے ہیں کہ دنیا اپنی نوع کے اعتبار سے قدیم ہے۔ لیکن اپنے تشخص کے اعتبار سے قدیم نہیں ہے۔ افسوس کہ حضرات عیسائیان یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ صرف چھ ہزار برس ہوئے کہ جب خدا نے دنیا کو پیدا کیا۔ اور زمین و آسمان بنائے
اور اس سے پہلے خدا ہمیشہ کیلئے معطل اور بیکار تھا۔ اور ازلی طور پر معطل چلا آتا تھا۔ یہ
ایسا عقیدہ ہے کہ کوئی صاحب عقل اس کو قبول نہیں کرے گا۔ مگر ہمارا عقیدہ جو قرآن
شریف نے ہمیں سکھلایا ہے یہ ہے کہ خدا ہمیشہ سے خالق ہے۔ اگر چاہے تو کروڑوں مرتبہ
زمین و آسمان کو فنا کر کے پھر ایسے ہی بناوے۔ لیکچر لاہور صہ۳۰ و لیکچر سیالکوٹ صہ۵

" یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۔ اور تجھ سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں۔
تصدیق صفحہ ۱۸

۵۳/۲۲ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا
تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا
یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امت کے لئے بشارت دے چکے ہیں۔ کہ اس امت
میں بھی پہلی امتوں کیطرح محدث پیدا ہوں گے۔ اور محدث بفتح دال وہ لوگ ہیں۔ جنے
مکالمات و مخاطبات الہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرأت میں
آیا ہے۔ وما ارسلنا من قبلک من رسولٍ ولا نبی ولا محدث الا اذا تمنی
القی الشیطان فی امنیته فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ
ایاته۔ پس اس آیت کی رو سے بھی جسکو بخاری نے بھی لکھا ہے۔ محدث کا الہام
یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جسمیں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔ براہین صہ۵۴۸

" اور اس میں کیا شک ہے کہ محدثیت بھی ایک شعبہ قویہ نبوت کا اپنے اندر
رکھتی ہے جس حالت میں رویا صالحہ نبوت کی چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ
ہے۔ تو محدثیت جو قرآن شریف میں نبوت کے ساتھ اور رسالت کے ہم پہلو بیان

کی گئی ہے۔ جس کے لئے صحیح بخاری میں حدیث بھی موجود ہے۔ اس کو اگر ایک مجازی نبوت قرار دیا جاوے۔ یا ایک شعبہ قویہ نبوت کا ٹھیرایا جائے تو کیا اس سے نبوت کا دعویٰ لازم آگیا۔ قرآن شریف کی وہ قرأت یاد کرو۔ کہ جو ابن عباس نے لی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَمَا ارسلنا من قبلك من رسولٍ ولا نبيٍّ ولا محدث الا اذا تمنّىٰ الاية وحی الٰہی پر صرف نبوت کاملہ کی حد تک کہاں مہر لگ گئی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر اس آیت کے کیا معنے ہیں۔ انزل من السّماء ماءً فسالت اودية بقدرها۔ اے غافلو اس امت مرحومہ میں وحی کی نالیاں قیامت تک جاری ہیں۔ مگر حسب مراتب۔ ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۲

" آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ملفوظات مبارکہ اشارت فرما رہے ہیں کہ محدث نبی بالقوۃ ہوتا ہے۔ اور اگر باب نبوت مسدود نہ ہوتا تو ہر ایک محدث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہو جانے کی رکھتا تھا۔ اور اس قوت اور استعداد کے لحاظ سے محدث کا محل نبی پر جائز ہے۔ یعنی کہہ سکتے ہیں کہ المحدث نبی۔ جیسا کہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ العنب خمر نظرًا علی القوۃ والاستعداد ومثل هذا الحمل شایع متعارف فی عبارات القوم وقد جرت المحاورات علیٰ ذالك كما لا يخفى على كل ذكيّ عالم مطلع على كتب الادب والكلام والتّصوف اور اسی محل کیطرف اشارہ ہے۔ جو اللہ جل شانہ نے اس قرأت کو جو وما ارسلنا من رسولٍ ولا نبيٍّ ولا محدث ہے۔ مختصر کرکے قرأت ثانی میں صرف یہ الفاظ کافی قرار دئے کہ وما ارسلنا من رسولٍ ولا نبيٍّ۔

آئینہ کمالات ص ۲۳۹

" پس نبی کیلئے اس کے دعوی اور تعلیم کی ایسی مثال ہے۔ جیسا کہ قریب سے آنکھ چیزوں کو دیکھتی ہے۔ اور ان میں غلطی نہیں کرتی۔ اور بعض اجتہادی امور میں غلطی

کی ایسی مثال ہے۔ جیسے دور و دراز کی چیزوں کو آنکھ دیکھتی ہے۔ تو کبھی ان کی تشخیص میں غلطی کر جاتی ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ کو جو یہودیوں کی بھلائی کیلئے اپنی بادشاہت کا خیال تھا۔ اس لئے بموجب آیت کریمہ الا اذا تمنّٰی القی الشیطان فی امنیتہٖ شیطان نے آپ کو دھوکا دیا۔ اور داؤد کے تخت کا لالچ دل میں ڈال دیا۔ مگر چونکہ مقرب اور خدا کے پیارے تھے۔ اس لئے وہ شیطانی وسوسے قائم نہ رہ سکے۔ اور جلد آپ نے سمجھ لیا۔ کہ میری آسمان کی بادشاہت ہے نہ زمین کی۔ اعجاز احمدی ص ۲۵

۶۴/۲۲ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝

یعنی ایسا پانی اتارا جس سے گلی سڑی ہوئی چیز سر سبز ہو گئی۔ تصدیق النبی ص ۴ مکتوبات نمبر ۲ ص ۳۶

۷۲/۲۲ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ

یعنی عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ کے ایسی چیز کی جنکی خدائی پر اللہ تعالیٰ نے کوئی نشان نہیں بھیجا۔ یعنی نبوت پر تو نشان ہوتے ہیں۔ مگر وہ خدائی کے کام میں نہیں آسکتے اور پھر فرماتا ہے۔ کہ اس عقیدہ کے لئے ان کے پاس کوئی علم بھی نہیں۔ یعنی کوئی ایسے معقول دلائل بھی نہیں۔ جن سے کوئی عقیدہ پختہ ہو سکے۔ جنگ مقدس صفحہ ۸۱

۷۴، ۷۳/۲۲ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۗ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ

اے لوگو ایک مثال ہے۔ تم غور کر کے سنو۔ جن چیزوں سے تم مرادیں مانگتے ہو۔ وہ چیزیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔ اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے۔ تو اس سے چھوڑا نہیں سکتیں۔ طالب بھی ضعیف ہیں۔ اور مطلوب بھی ضعیف ہیں۔ یعنی مخلوق چیزوں سے مرادیں مانگنے والے ضعیف العقل ہیں۔ اور مخلوق چیزیں جو معبود ٹھیرائی گئیں وہ ضعیف القدرت ہیں۔ مشرک لوگوں نے جیسا چاہیے تھا۔ خدا کو شناخت نہیں کیا۔ وہ ایسا سمجھتے ہیں۔ کہ گویا خدا کا کارخانہ بغیر دوسرے شرکاء کے چل نہیں سکتا۔ حالانکہ خدا اپنی ذات میں صاحب قوت تامہ اور غلبۂ عامہ ہے۔ براہین صفحہ ۳۳

"جن لوگوں کو تم خدا بنائے بیٹھے ہو۔ وہ تو ایسے ہیں کہ اگر سب ملکر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں تو کبھی پیدا نہ کر سکیں۔ اگرچہ ایکدوسرے کی مدد بھی کریں۔ بلکہ اگر مکھی انکی چیز چھین کر لیجائے تو انہیں طاقت نہ ہوگی کہ وہ مکھی سے چیز واپس لے سکیں۔ ان کے پرستار عقل کے کمزور اور وہ طاقت کے کمزور ہیں۔ کیا خدا ایسے ہوا کرتے ہیں۔ خدا تو وہ ہے کہ سب قوتوں والوں سے زیادہ قوت والا اور سب پر غالب آنیوالا ہے۔ نہ اس کو کوئی پکڑ سکے۔ نہ مار سکے ایسی غلطیوں میں جو لوگ پڑتے ہیں۔ وہ خدا کا قدر نہیں پہچانتے۔ اور نہیں جانتے کہ خدا کیسا ہونا چاہیئے۔ اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۵۷

پارہ ۱۸ بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُورۃُ المُؤمِنُونَ مَکِّیَّۃٌ وَھِیَ مِائَۃٌ وَثَمَانَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ ھُمۡ فِیۡ صَلٰوتِھِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ لِفُرُوۡجِھِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِھِمۡ اَوۡمَا

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ
ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ
عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝
الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ
جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ
عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ
عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا
اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کے ابتدا میں جو سورۃ المومنون ہے جس میں فتبارک اللہ احسن الخالقین ہے۔ اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ کیونکر انسان مراتب ستہ کو طے کر کے جو اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ اپنے کمال روحانی اور جسمانی کو پہنچتا ہے سو خدا نے دونوں قسم کی ترقیات کو چھ چھ مرتبہ پر تقسیم کیا ہے۔ اور مرتبہ ششم کو کمال ترقی کا مرتبہ قرار دیا ہے۔ اور یہ مطابقت روحانی اور جسمانی وجود کی ترقیات کی ایسے خارق عادت طور پر دکھلائی ہے۔ کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے کبھی کسی انسان کے ذہن نے اس نکتہ معرفت کی طرف سبقت نہیں کی۔ اور اگر کوئی دعویٰ کرے کہ سبقت کی ہے تو یہ بار ثبوت اس کی گردن پر ہوگا۔ کہ یہ پاک فلاسفی کسی انسان کی کتاب میں سے دکھلاوے۔ اور یاد رہے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیگا۔ پس بدیہی طور پر یہ معجزہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے وہ عمیق مناسبت جو روحانی اور جسمانی وجود کے ان ترقیات میں ہے جو وجود کامل کے مرتبہ تک پیش آتے ہیں۔ ان آیات مبارکہ میں ظاہر کر دی ہے۔ اور باطنی صنعت ایک ہی ہاتھ سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جو خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔

بعض نادانوں نے یہ بھی اعتراض کیا تھا۔ کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے نطفہ کی حالت سے لیکر

اخیر تک جسمانی وجود کا قرآن شریف میں نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نقشہ اس زمانہ کی جدید تحقیقات طبی کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ لیکن انکی حماقت ہے کہ ان آیات کے معنی انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ خدا تعالےٰ رحم کے اندر انسانی وجود کو اس طرح بناتا ہے کہ پہلے بکلی ایک عضو سے فراغت کرلیتا ہے۔ پھر دوسرا بناتا ہے یہ آیات الٰہیۃ کا منشا نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے بچشم خود ملاحظہ کرلیا ہے۔ اور مضغہ سے لیکر ہر ایک حالت کے بچے کو دیکھ لیا ہے خالق حقیقی رحم کے اندر تمام اعضاء اندرونی و بیرونی کو ایک ہی زمانہ میں بناتا ہے یعنی ایک ہی وقت میں سب بنتے ہیں۔ تاخیر تقدیم نہیں۔ البتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تمام وجود انسان کا ایک جما ہوا خون ہوتا ہے۔ اور پھر سارے کا سارا ایک ہی وقت میں مضغہ بن جاتا ہے۔ اور پھر ایک ہی وقت میں کچھ حصّہ اس کا اپنے اپنے موقعہ پر ہڈیاں بنجاتا ہے۔ اور پھر ایک ہی وقت میں اس تمام مجموعہ پر ایک زائد گوشت چڑھ جاتا ہے۔ جو تمام بدن کی کھال کہلاتی ہے۔ جس سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس مرتبہ پر جسمانی بناوٹ تمام ہو جاتی ہے۔ اور پھر جان پڑ جاتی ہے۔ یہ وہ تمام حالتیں ہیں جو ہم نے بچشم خود دیکھ لی ہیں ؎

اب ہم روحانی مراتب ستّہ کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

(۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔

(۲) وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۳) وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ (۴) وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعَادُوْنَ (۵) وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ۔

اور ان کے مقابل جسمانی ترقیات کے مراتب بھی چھ قرار دیئے ہیں۔ جیسا کہ وہ ان آیات کے بعد فرماتا ہے:۔

(۱) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ (۲) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً (۳) فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً (۴) فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۵) فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا (۶) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ۝

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا مرتبہ روحانی ترقی کا یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ یعنی وہ مومن نجات پا گئے۔ جو اپنی نماز اور یاد الٰہی میں خشوع اور فروتنی اختیار کرتے ہیں۔ اور رقت اور گداز ش سے ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل پر پہلا مرتبہ جسمانی نشو و نما کا جو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ہے یعنی ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ یعنے پھر ہم نے انسان کو نطفہ بنایا۔ اور نطفہ ایک محفوظ جگہ میں رکھا سو خدا تعالےٰ نے آدم کی پیدائش کے بعد پہلا مرتبہ انسانی وجود کا جسمانی رنگ میں نطفہ کو قرار دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نطفہ ایک ایسا تخم ہے۔ جو اجمالی طور پر مجموعہ اُن تمام قوی اور صفات اور اعضاء اندرونی اور بیرونی اور تمام نقش و نگار کا ہوتا ہے۔ جو پانچویں درجہ پر مفصل طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور چھٹے درجہ پر اتم اور اکمل طور پر ظہور ہوتا ہے۔ اور باایں ہمہ نطفہ باقی تمام درجات سے زیادہ زمعرض خطر میں ہے۔ کیونکہ ابھی وہ اس تخم کی طرح ہے۔ جس نے ہنوز زمین سے کوئی تعلق نہیں پکڑا اور ابھی وہ رحم کی کشش سے بہرہ ور نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ اندام نہانی میں پڑ کر ضائع ہو جائے۔ جیسا کہ تخم بعض اوقات پتھریلی زمین پر پڑ کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ نطفہ بذاتہا ناقص ہو لیعنے اپنے اندر ہی کچھ نقص رکھتا ہو۔ اور قابل نشو و نما نہ ہو۔ اور یہ استعداد اس میں نہ ہو کہ رحم اسکو اپنی طرف جذب کرے اور صرف ایک مردہ کی طرح ہو۔ جس میں کچھ حرکت نہ ہو جیسا کہ ایک بوسیدہ تخم زمین میں بو یا جائے۔ اور گو زمین عمدہ ہو۔ مگر

تاہم تخم بوجہ اپنے ذاتی نقص کے قابل نشوونما نہیں ہوتا۔ اور ممکن ہے کہ بعض اور عوارض کیوجہ سے جنکی تفصیل کی ضرورت نہیں نطفہ رحم میں تعلق پذیر نہ ہو سکے اور رحم اسکو اپنی کشش سے محروم رکھے جیسا کہ تخم بعض اوقات پیروں کے نیچے کچلا جاتا ہے یا پرندے اُس کو چگ جاتے ہیں۔ یا کسی اور حادثہ سے تلف ہو جاتا ہے۔

یہی صفات مومن کے روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کے ہیں اور اوّل مرتبہ مومن کی روحانی وجود کا وہ خشوع اور رقت اور سوز و گداز کی حالت ہے جو نماز اور یاد الٰہی میں مومن کو میسر آتی ہے یعنی گدازش اور رقت اور فروتنی اور عجز و نیاز اور روح کا انکسار اور ایک تڑپ اور قلق اور تپش اپنے اندر پیدا کرنا اور ایک خوف کی حالت اپنے پر وارد کر کے خدائے عزوجل کیطرف دل کو جھکانا جیسا کہ اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ یعنی وہ مومن مراد پا گئے جو اپنی نماز میں اور ہر ایک طور کی یاد الٰہی میں فروتنی اور عجز و نیاز اختیار کرتے ہیں۔ اور رقت اور سوز و گداز اور قلق اور کرب اور دلی جوش سے اپنے رب کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ خشوع کی حالت جس کی تعریف کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ روحانی وجود کی تیاری کے لئے پہلا مرتبہ ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ پہلا تخم ہے۔ جو عبودیت کی زمین میں بویا جاتا ہے۔ اور وہ اجمالی طور پر ان تمام قوٰی اور صفات اور اعضائے اور تمام نقش و نگار اور حسن و جمال اور خط و خال اور شمائل روحانیہ پر مشتمل ہے۔ جو پانچویں اور چھٹے درجہ میں انسان کامل کے لئے نمودار

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۴

درجات سے مراد وہ درجے ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں پانچواں درجہ وہ ہے جب قدرت خالق مطلق سے انسانی قالب تمام و کمال رحم میں تیار ہو جاتا ہے اور ہڈیوں پر ایک خوشنما گوشت چڑھ جاتا ہے اور چھٹا درجہ وہ ہے جب اس قالب میں جان پڑ جاتی ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ حالت خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز ہے۔ اور درحقیقت وہ بھی اجمالی طور پر مجموعہ ان تمام امور کا ہے۔ جو بعد میں کھلے طور پر انسان کے روحانی وجود میں نمایاں ہوتے ہیں۔ منہ

طور پر ظاہر ہوتے اور اپنے دلکش پیرایہ میں تجلی فرماتے ہیں۔[1] اور چونکہ وہ نطفہ کیطرح روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے۔ اس لئے وہ آیت قرآنی میں نطفہ کی طرح پہلے مرتبہ پر رکھا گیا ہے اور نطفہ کے مقابل پر دکھلایا گیا ہے۔ تا وہ لوگ جو قرآن شریف میں غور کرتے ہیں۔ سمجھ لیں کہ نماز میں خشوع کی حالت روحانی وجود کے لئے ایک نطفہ ہے اور نطفہ کی طرح روحانی طور پر انسان کامل کے تمام قویٰ اور صفات اور تمام نقش و نگار اس میں مخفی ہیں۔ اور جیسا کہ نطفہ اُسوقت تک معرضِ خطر میں ہے جبتک کہ رحم سے تعلق نہ پکڑے ایسا ہی روحانی وجود کی یہ ابتدائی حالت یعنی خشوع کی حالت اس وقت تک خطرہ سے خالی نہیں جبتک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑے۔

یاد رہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا۔ یہ سب فیض رحمانیت سے ظہور میں آیا۔ لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کے عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے۔ یہی سنت اللہ بنی آدم کے لئے جاری ہے۔ پس جبکہ انسان نماز اور یاد الٰہی میں خشوع کیحالت اختیار کرتا ہے۔ تب اپنے تئیں رحیمیت کے فیضان کے لئے مستعد بناتا ہے۔ سو نطفہ میں اور روحانی وجود کے پہلے مرتبہ میں جو حالت خشوع ہے صرف فرق یہ ہے کہ نطفہ رحم کی کشش کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ رحیم کی کشش کیطرف احتیاج رکھتا ہے۔ اور جیسا کہ نطفہ کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحم کی کشش سے پہلے ہی ضائع

---

[1] پانچویں درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اور چھٹا درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اور یہ پانچواں درجہ جسمانی درجات کے پنجم درجہ کے مقابل پر ہوتا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے یعنی فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا اور چھٹا درجہ جسمانی درجات کے ششم درجہ کے مقابل پر پڑا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ منہ۔

ہو جائے۔ ایسا ہی روحانی وجود کے پہلے مرتبہ کیلئے یعنے حالت خشوع کے لئے ممکن ہے۔ کہ وہ رحیم کی کشش اور تعلق سے پہلے ہی برباد ہو جائے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ ابتدائی حالت میں اپنی نمازوں میں روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور خدا کی محبت میں طرح طرح کی دیوانگی ظاہر کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کی عاشقانہ حالت دکھلاتے ہیں۔ اور چونکہ اس ذات ذوالفضل سے جس کا نام رحیم ہے۔ کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس کی خاص تجلی کے جذبہ سے اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ان کا تمام سوز و گداز اور تمام وہ حالت خشوع بے بنیاد ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات ان کا قدم پھسل جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی حالت سے بھی بدتر حالت میں جا پڑتے ہیں۔ پس یہ عجیب دلچسپ مطابقت ہے۔ کہ جیسا کہ نطفہ جسمانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جبتک رحم کی کشش اس کی دستگیری نہ کرے۔ وہ کچھ چیز ہی نہیں۔ ایسا ہی حالت خشوع روحانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے۔ اور جب تک رحیم خدا کی کشش اس کی دستگیری نہ کرے۔ وہ حالت خشوع کچھ بھی چیز نہیں اسی لئے ہزار ہا لوگوں کو پاؤ گے کہ اپنی عمر کے کسی حصہ میں یاد الٰہی اور نماز میں حالت خشوع سے لذت اُٹھاتے اور وجد کرتے اور روتے تھے۔ اور پھر کسی ایسی لعنت نے انکو پکڑ لیا کہ ایکمرتبہ نفسانی امور کیطرف گر گئے اور دنیا اور دنیا کی خواہشوں کے جذبات سے وہ تمام حالت کھو بیٹھے۔ یہ نہایت خوف کا مقام ہے۔ کہ اکثر حالت خشوع رحیمیت کے تعلق سے پہلے ہی ضائع ہو جاتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ رحیم خدا کی کشش اس میں کچھ کام کرے۔ وہ حالت برباد اور نابود ہو جاتی ہے۔ اور ایسی صورت میں وہ حالت جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اس نطفہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ کہ جو رحم سے تعلق پکڑنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتا ہے

غرض روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالت خشوع ہے۔ اور جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنے نطفہ بغیر کشش رحم کے ہیچ ہے۔ اور روحانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنی حالت خشوع بغیر جذب رحیم کے ہیچ۔ اور جیسا کہ دنیا میں ہزار ہا نطفے تباہ ہوتے ہیں۔ اور نطفہ ہونے کی حالت میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور رحم سے تعلق نہیں پکڑتے۔ ایسا

ہی دنیا میں ہزارہا خشوع کی حالتیں ایسی ہیں۔ کہ رحیم خدا سے تعلق نہیں پکڑتیں۔ اور ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہزارہا جاہل اپنے چند روزہ خشوع اور وجد اور گریہ وزاری پر خوش ہو کر خیال کرتے ہیں۔ کہ ہم ولی ہو گئے۔ غوث ہو گئے۔ قطب ہو گئے۔ اور ابدال میں داخل ہو گئے اور خدارسیدہ ہو گئے۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ہنوز ایک نطفہ ہے۔ ابھی تو نام خدا ہے غنچہ۔ صبا تو چھو بھی نہیں گئی ہے۔ افسوس کہ انہی خام خیالیوں سے ایک دنیا ہلاک ہو گئی

اور یاد رہے کہ یہ روحانی حالت کا پہلا مرتبہ جو حالت خشوع ہے طرح طرح کے اسباب سے ضائع ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ نطفہ جو جسمانی حالت کا پہلا مرتبہ ہے۔ انواع اقسام کے حوادث سے تلف ہو سکتا ہے۔ منجملہ ان کے ذاتی نقص بھی ہے۔ مثلاً اس خشوع میں کوئی شرک طونی ہے۔ یا کسی بدعت کی آمیزش ہے۔ اور لغویات کے ساتھ اشتراک ہے۔ مثلاً نفسانی خواہشیں اور نفسانی ناپاک جذبات بجائے خود زور مار رہے ہیں۔ یا سفلی تعلقات نے دل کو پکڑ رکھا ہے۔ یا جیفۂ دنیا کی لغو خواہشوں نے زیر کر دیا ہے۔ پس ان تمام ناپاک عوارض کے ساتھ حالت خشوع اس لائق نہیں ٹھیرتی۔ کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ جائے جیسا کہ اس نطفہ سے رحم تعلق نہیں پکڑ سکتا۔ جو اپنے اندر کسی قسم کا نقص رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو جوگیوں کی حالت خشوع اور عیسائی پادریوں کی حالتِ انکسار انکو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اور گو وہ سوز وگداز میں اس قدر ترقی کریں کہ اپنے جسم کو بھی ساتھ ہی استخوانِ بے پوست کر دیں تب بھی رحیم خدا ان سے تعلق نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کی حالت خشوع میں ایک ذاتی نقص ہے۔ ایسا ہی وہ بدعتی فقیر اسلام کے جو قرآن شریف کی پیروی چھوڑ کر ہزاروں بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھنگ چرس اور شراب پینے سے بھی شرم نہیں کرتے۔ اور دوسرے فسق و فجور بھی ان کے لئے شیر مادر ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ایسی حالت رکھتے ہیں۔ کہ رحیم خدا سے اور اس کے تعلق سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ بلکہ رحیم خدا کے نزدیک وہ تمام حالتیں مکروہ ہیں۔ اس لئے باوجود اپنے طور کے وجد اور رقص اور اشعار خوانی اور سرود وغیرہ کے رحیم خدا کے تعلق سے سخت بے نصیب ہوتے ہیں۔ اور اس نطفہ کی طرح ہوتے ہیں جو آتشک کی بیماری

اور جذام کے عارضہ سے جل جائے۔ اور اس قابل نہ رہے کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے۔ پس رحم اور رحیم کا تعلق ایک ہی بنا پر ہے۔ صرف رُوحانی اور جسمانی عوارض کا فرق ہے اور جیسا کہ نطفہ بعض اپنے ذاتی عوارض کی رُو سے اس لائق نہیں رہتا کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے۔ اور اس کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ ایسا ہی حالتِ خشوع جو نطفہ کے درجہ پر ہے بعض اپنے عوارض ذاتیہ کی وجہ سے جیسے تکبر اور عجب اور ریاء اور کسی قسم کی ضلالت کی وجہ سے یا شرک سے اس لائق نہیں رہتی۔ کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ سکے۔ پس نطفہ کی طرح تمام فضیلت روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کی جو حالتِ خشوع ہے رحیم خدا سے حقیقی تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے۔ جیسا کہ تمام فضیلت نطفہ کی رحم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے۔ پس اگر اس حالت خشوع کو اس رحیم خدا سے حقیقی تعلق پیدا ہو سکتا ہے۔ تو وہ حالت اس گندے نطفہ کی طرح ہے۔ جس کو رحم کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔

اور یاد رکھنا چاہئے کہ نماز اور یادِ الٰہی میں جو کبھی انسان کو حالتِ خشوع میسر آتی ہے۔ اور وجد اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ یا لذت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس انسان کو رحیم خدا سے حقیقی تعلق ہے۔ جیسا کہ اگر نطفہ اندام نہانی کے اندر داخل ہو جائے۔ اور لذت بھی محسوس ہو۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس نطفہ کو رحم سے تعلق ہو گیا ہے۔ بلکہ تعلق کے لئے علیحدہ آثار اور علامات ہیں پس یادِ الٰہی میں ذوق شوق جس کو دوسرے لفظوں میں حالت خشوع کہتے ہیں نطفہ کی اس حالت سے مشابہ ہے۔ جب وہ ایک صورت انزال پکڑ کر اندام نہانی کے اندر گر جاتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ وہ جسمانی عالم میں ایک کمال لذت کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن تاہم اس قطرہ منی کا اندر گرنا اس بات کو مستلزم نہیں کہ رحم سے اس نطفہ کا تعلق بھی ہو جائے اور وہ رحم کی طرف کھینچا جائے۔ پس ایسا ہی روحانی ذوق شوق اور حالت خشوع اس بات کو مستلزم نہیں کہ رحیم خدا سے ایسے شخص کا تعلق ہو جائے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ بلکہ جیسا کہ نطفہ کبھی حرامکاری کے طور

پر کسی رنڈی کے اندام نہانی میں پڑتا ہے۔ تو اس میں بھی وہی لذت نطفہ ڈالنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ اپنی بیوی کے ساتھ۔ پس ایسا ہی بت پرستوں اور مخلوق پرستوں کا خشوع وخضوع اور حالت ذوق اور شوق رنڈی بازوں سے مشابہ ہے یعنی خشوع اور خضوع مشرکوں اور ان لوگوں کا جو محض اغراض دنیویہ کی بنا پر خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ اس نطفہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ جو حرام کار عورتوں کے اندام نہانی میں جا کر باعث لذت ہوتا ہے بہرحال جیسا کہ نطفہ میں تعلق پکڑنے کی استعداد ہے حالت خشوع میں بھی تعلق پکڑنے کی استعداد ہے۔ مگر صرف حالت خشوع اور رقت اور سوز اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ وہ تعلق ہو بھی گیا ہے۔ جیسا کہ نطفہ کی صورت میں اس روحانی صورت کے مقابل یہی مشاہدہ ظاہر کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے صحبت کرے۔ اور منی عورت کے اندام میں داخل ہو جائے اور اس کو اس فعل سے کمال لذت حاصل ہو۔ تو یہ لذت اس بات پر دلالت نہیں کرے گی۔ کہ حمل ضرور ہو گیا ہے پس ایسا ہی خشوع[1] اور سوز و گداز کی حالت گو وہ کیسی ہی لذت اور سرور کے ساتھ ہو۔ خدا سے تعلق پکڑنے کیلئے کوئی لازمی علامت نہیں ہے۔ یعنی کسی شخص میں نماز اور یاد الٰہی کی حالت میں خشوع اور سوز و گداز اور گریہ و زاری پیدا ہونا لازمی طور پر اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس شخص کو خدا سے تعلق بھی ہے۔ ممکن ہے

[1] ابتدائی حالت میں خشوع اور رقت کے ساتھ ہر طرح کے لغو کام جمع ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بچہ میں رونے کی عادت بہت ہوتی ہے اور بات بات میں ڈر جانا اور خشوع اور انکسار اختیار کرتا ہے مگر باایں ہمہ بچپن کے زمانہ میں طبعی انسان بہت سے لغویات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور سب سے پہلے لغو باتوں اور لغو کاموں کی طرف ہی رغبت کرتا ہے اور اکثر لغو حرکات اور لغو طور پر کودنا اور اچھلنا ہی اس کو پسند آتا ہے جیسے بسا اوقات اپنے جسم کو بھی کوئی صدمہ پہنچا دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کی راہ میں فطرتاً پہلے لغویات ہی آتے ہیں اور بغیر اس مرتبہ کے طے کرنے کے دوسرے مرتبہ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتا پس طبعاً پہلا مرتبہ طلوع کا بچپن کے لغویات سے پرہیز کرنا ہے سو اس سے ظاہر کہ سب سے پہلا تعلق انسانی سرشت کو لغویات سے ہی ہوتا ہے۔ منہ

کہ یہ سب حالات کسی شخص میں موجود ہوں۔ مگر ابھی اس کو خدا تعالےٰ سے تعلق نہ ہو جیسا کہ مشاہدہ صریحہ اس بات پر گواہ ہے کہ بہت سے لوگ پند و نصیحت کی مجلسوں اور وعظ و تذکیر کی محفلوں یا نماز اور یاد الٰہی کی حالت میں خوب روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں اور آنسو ان کے رخساروں پر پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض کا رونا تو منہ پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بات سنی اور وہیں رو دیا۔ مگر تاہم لغویات سے وہ کنارہ کش نہیں ہوتے اور بہت سے لغو کام اور لغو باتیں اور لغو سیر و تماشے ان کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ جن سے سمجھا جاتا ہے کہ کچھ بھی ان کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں۔ اور نہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ پس یہ عجیب تماشا ہے۔ کہ ایسے گندے نفسوں کے ساتھ بھی خشوع اور سوز و گداز کی حالت جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبرت کا مقام ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ مجرد خشوع اور گریہ و زاری گو بغیر ترک لغویات ہو۔ کچھ فخر کرنے کی جگہ نہیں۔ اور نہ یہ قرب الٰہی اور تعلق باللہ کی کوئی علامت ہے۔ بہت سے ایسے فقیر بچشم خود میں نے دیکھے ہیں۔ اور ایسا ہی بعض دوسرے لوگ بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہ کسی دردناک شعر کے پڑھنے یا دردناک نظارہ دیکھنے یا دردناک قصہ کے سننے سے اس جلدی سے ان کے آنسو گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ بعض بادل اس قدر جلدی سے اپنے موٹے موٹے قطرے برساتے ہیں۔ کہ باہر سونے والوں کو رات کے وقت فرصت نہیں دیتے۔ کہ اپنا بستر بغیر تر ہونے کے اندر لے جا سکیں۔ لیکن میں اپنی ذاتی شہادت سے گواہی دیتا ہوں کہ اکثر ایسے شخص میں نے بڑے مکار بلکہ دنیا داروں کے آگے بڑھے ہوئے پائے ہیں۔ اور بعض کو میں نے ایسے خبیث طبع اور بد دیانت اور ہر پہلو سے بد معاش پایا ہے۔ کہ مجھے انکی گریہ و زاری کی عادت اور خشوع و خضوع کی خصلت دیکھ کر اس بات سے کراہت آتی ہے کہ کسی مجلس میں ایسی رقت اور سوز و گداز ظاہر کروں۔ ہاں کسی زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ نیک بندوں کی علامت تھی مگر اب تو اکثر یہ پیرایہ مکاروں اور فریب دہ لوگوں کا ہو گیا ہے۔ سبز کپڑے بال سر

کے لبے۔ ہاتھ میں تسبیح۔ آنکھوں سے دمبدم آنسو جاری لبوں میں کچھ حرکت گویا ہر وقت ذکر الٰہی زبان پر جاری ہے۔ اور ساتھ اس کے بدعت کی پابندی۔ یہ علامتیں اپنے فقر کی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر دل مجذوم محبت الٰہی سے محروم اِلّا ماشاء اللہ راست باز لوگ میری اس تحریر سے مستثنےٰ ہیں جن کی ہر ایک بات بطور جوش اور حال کے ہوتی ہے نہ بطور تکلف اور قال کے۔

بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ گریہ وزاری اور خشوع اور خضوع نیک بندوں کیلئے کوئی مخصوص علامت نہیں۔ بلکہ یہ بھی انسان کے اندر ایک قوت ہے۔ جو محل اور بے محل دونوں صورتوں میں حرکت کرتی ہے۔ انسان بعض اوقات ایک فرضی قصہ پڑھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ فرضی اور ایک ناول کی قسم ہے مگر تاہم جب اس کے ایک دردناک موقعہ پر پہنچتا ہے۔ تو اس کا دل اپنے قابو سے نکل جاتا ہے۔ اور بے اختیار آنسو جاری ہوتے ہیں جو تھمتے نہیں۔ ایسے دردناک قصے یہاں تک موثر پائے گئے ہیں۔ کہ بعض وقت خود ایک انسان ایک پُرسوز قصہ بیان کرنا شروع کرتا ہے۔ اور جب بیان کرتے کرتے اس کے ایک پُر درد موقعہ پر پہنچتا ہے۔ تو آپ ہی چشم پُرآب ہو جاتا ہے۔ اور اس کی آواز بھی ایک رونے والے شخص کے رنگ میں ہو جاتی ہے۔ آخر اس کا رونا اچھل پڑتا ہے اور جو رونے کے اندر ایک قسم کی سرور اور لذت ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جس بنا پر وہ روتا ہے۔ وہ بناہی غلط اور ایک فرضی قصہ ہے پس کیوں اور کیا وجہ ایسا ہوتا ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ سوز و گداز اور گریہ زاری کی قوت جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اس کو ایک واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے سے کچھ کام نہیں۔ بلکہ جب اس کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اس قوت کو حرکت دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ تو خواہ نخواہ وہ قوت حرکت میں آجاتی ہے۔ اور ایک قسم کا سرور اور لذت ایسے انسان کو پہنچ جاتا ہے۔ گو وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی وجہ سے غیر مشروع مجالس میں بھی جو طرح طرح کی بدعات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بے قید لوگ جو فقیروں کے لباس میں اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں۔ مختلف قسم کی کافیوں اور شعروں کے

سننے اور سرود کے تاثیر سے رقص اور وجد اور گریہ وزاری شروع کر دیتے ہیں۔ اور اپنے رنگ میں لذت اُٹھاتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں۔ کہ ہم خدا کو مل گئے ہیں۔ مگر یہ لذت اس لذت سے مشابہ ہے۔ جو ایک زانی کو حرامکار عورت سے ہوتی ہے ؎

اور پھر ایک اور مشابہت خشوع اور نطفہ میں ہے اور وہ یہ کہ جب ایک شخص کا نطفہ اس کی بیوی یا کسی اور عورت کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس نطفہ کا اندام نہانی کے اندر داخل ہونا اور انزال کی صورت پکڑ کر رواں ہو جانا بعینہٖ رونے کی صورت پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ خشوع کی حالت کا نتیجہ بھی رونا ہی ہوتا ہے۔ اور جیسے بے اختیار نطفہ اچھل کر صورت انزال اختیار کرتا ہے یہی صورت کمال خشوع کے وقت رونے کی ہوتی ہے۔ کہ رونا آنکھوں سے اُچھلتا ہے۔ اور جیسے انزال کی لذت کبھی حلال طور پر ہوتی ہے۔ جبکہ اپنی بیوی سے انسان صحبت کرتا ہے۔ اور کبھی حرام طور پر جبکہ انسان کسی حرامکار عورت سے صحبت کرتا ہے۔ یہی صورت خشوع اور سوز و گداز اور گریہ وزاری کی ہے۔ یعنی کبھی خشوع اور سوز و گداز محض خدائے واحد لاشریک کے لئے ہوتا ہے جس کے ساتھ کسی بدعت اور شرک کا رنگ نہیں ہوتا۔ پس وہ لذت سوز و گداز کی ایک لذت حلال ہوتی ہے۔ مگر کبھی خشوع اور سوز و گداز اور اس کی لذت بدعات کی آمیزش سے یا مخلوق کی پرستش اور بتوں اور دیویوں کی پوجا میں بھی حاصل ہوتی ہے مگر وہ لذت حرامکاری کے جماع سے مشابہ ہوتی ہے۔

غرض مجرد خشوع اور سوز و گداز اور گریہ وزاری اور اسکی لذتیں تعلق باللہ کو مستلزم نہیں۔ بلکہ جیسا کہ بہت سے ایسے نطفے ہیں جو ضائع جاتے ہیں۔ اور رحم ان کو قبول نہیں کرتا۔ ایسا ہی بہت سے خشوع اور تضرع اور زاری ہیں۔ جو محض آنکھوں کو کھونا ہے۔ اور رحیم خدا ان کو قبول نہیں کرتا۔ غرض حالت خشوع جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے۔ ایک کھلی کھلی مشابہت ہے۔ جس کو ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور یہ مشابہت کوئی معمولی امر نہیں ہے۔ بلکہ صانع قدیم جلشانہٗ کے خاص ارادہ سے ان دونوں میں اکمل اور اتم مشابہت ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں بھی لکھا

گیا ہے۔ کہ دوسرے جہان میں بھی یہ دونوں لذتیں ہونگی۔ مگر مشابہت میں اس قدر ترقی کر جائینگی۔ کہ ایک ہی ہو جائینگی۔ یعنی اُس جہان میں جو ایک شخص اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرے گا۔ وہ اس بات میں فرق نہیں کر سکیگا۔ کہ وہ اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرتا ہے۔ یا محبت آلٰہیہ کے دریائے بے پایان میں غرق ہے۔ اور واصلان حضرت عزت پر اسی جہان میں یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اہل دنیا اور محجوبوں کے لئے ایک امر فوق الفہم ہے ؎

اب ہم یہ تو بیان کر چکے کہ روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالت خشوع ہے۔ جسمانی وجود کے پہلے مرتبہ سے جو نطفہ ہے۔ مشابہت تام رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ سے مشابہ اور مماثل ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے۔ جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنے مومن وہ ہیں جو لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں اور لغو تعلقات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جسکو خدا تعالیٰ اپنے کلام عزیز میں عَلَقَة کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً یعنے پھر ہم نے نطفہ کو علقہ بنایا یعنے ہم نے اس کو لغو طور پر ضائع ہونے سے بچا کر رحم کی تاثیر اور تعلق سے علقہ بنا دیا۔ اس سے پہلے وہ معرض خطر میں تھا۔ اور کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ انسانی وجود بنے یا ضائع جائے لیکن وہ رحم کے تعلق کے بعد ضائع ہونے سے محفوظ ہو گیا۔ اور اس میں ایک تغیر پیدا ہو گیا۔ جو پہلے نہ تھا یعنی وہ ایک منجمد ہوئے خون کی صورت میں ہو گیا۔ اور قوام بھی غلیظ ہو گیا۔ اور رحم سے اس کا ایک علاقہ ہو گیا۔ اس لئے اس کا نام علقہ رکھا گیا۔ اور ایسی عورت حاملہ کہلانے کی مستحق ہو گئی۔ اور بوجہ اس علاقہ کے رحم اس کا سرپرست بن گیا۔ اور اس کے زیر سایہ نطفہ کا نشوونما ہونے لگا۔ مگر اس حالت میں نطفہ نے کچھ زیادہ پاکیزگی حاصل نہیں کی صرف ایک خون جما ہوا بن گیا۔ اور رحم کے تعلق کیوجہ سے ضائع ہونے سے بچگیا

اور جس طرح اور صورتوں میں ایک نطفہ لغو طور پر اور بیہودہ طور پر اندر سے بہ نکلتا اور کپڑوں کو پلید کرتا تھا۔ اب اس تعلق کی وجہ سے بیکار جانے سے محفوظ رہ گیا لیکن ہنوز وہ ایک جما ہوا خون تھا جس نے ابھی نجاست خفیفہ کی آلودگی سے پاکی حاصل نہیں کی تھی۔ اگر رحم سے یہ تعلق اس کا پیدا نہ ہوتا۔ تو ممکن تھا کہ اندام نہانی میں داخل ہو کر بھی رحم میں قرار نہ پا سکتا۔ اور باہر کی طرف بہ نکلتا۔ مگر رحم کی قوت مدرکہ نے اپنے خاص جذبے اس کو تھام لیا۔ اور پھر ایک جمے ہوئے خون کی شکل پر بنا دیا۔ تب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس تعلق کی وجہ سے علقہ کہلایا۔ اور اس سے پہلے رحم نے اس پر کوئی اپنا خاص اثر ظاہر نہیں کیا تھا۔ اور اسی اثر نے اس کو ضائع ہونے سے روکا۔ اور اسی اثر سے نطفہ کی طرح اس میں رقت بھی باقی نہ رہی۔ یعنی اس کا قوام رکیک اور پتلا نہ رہا بلکہ کسیقدر گاڑھا ہوگیا۔

اور اس علقہ کے مقابل پر جو جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ ہے روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کا ابھی ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں جس کی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی رہائی یافتہ مومن وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں اور لغو باتوں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں سے اور لغو تعلقات سے اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور ایمان انکا اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس قدر کنارہ کشی ان پر سہل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بوجہ ترقی ایمان کے کسیقدر تعلق ان کا خدائے رحیم سے ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ علقہ ہونے کی حالت میں جب نطفہ کا تعلق کسی قدر رحم سے ہو جاتا ہے۔ تو وہ لغو طور پر گر جانے یا بہ جانے یا اور طرح پر ضائع ہو جانے سے امن میں آجاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

سو روحانی وجود کے اس مرتبہ دوم میں خدائے رحیم سے تعلق بعینہٖ اس تعلق سے مشابہ ہوتا ہے۔ جو جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر علقہ کو رحم سے تعلق ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ قبل ظہور دوسرے مرتبہ پر وجود روحانی کے لغو تعلقات اور لغو شغلوں سے رہائی پانا غیر ممکن ہوتا ہے۔ اور صرف وجود روحانی کا پہلا مرتبہ یعنے خشوع اور عجز و نیاز کی حالت اکثر برباد بھی چلی جاتی ہے۔ اور انجام بد ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی نطفہ

بھی جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے علقہ بننے کی حالت سے پہلے بسا اوقات صدہا مرتبہ لغو طور پر ضائع جاتا ہے۔ پھر جب ارادہ الٰہی اس بات کے متعلق ہوتا ہے کہ لغو طور پر ضائع ہونے سے اس کو بچائے تو اس کے امر اور اذن سے وہی نطفہ رحم میں علقہ بنجاتا ہے۔ تب وہ وجود جسمانی کا دوسرا مرتبہ کہلاتا ہے۔ غرض دوسرا مرتبہ روحانی وجود کا جو تمام لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا اور لغو باتوں اور لغو تعلقات اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہونا ہے۔ یہ مرتبہ بھی اسی وقت میسر آتا ہے۔ کہ جب خدائے رحیم سے انسان کا تعلق پیدا ہو جائے۔ کیونکہ یہ تعلق میں ہی طاقت اور قوت ہے۔ کہ دوسرے تعلق کو توڑتا ہے اور ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اور گو انسان کو اپنی نماز میں حالت خشوع میسر آجائے جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے۔ پھر بھی وہ خشوع لغو باتوں اور لغو کاموں اور جوشوں سے روک نہیں سکتا۔ جب تک کہ خدا سے وہ تعلق نہ ہو۔ جو روحانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ گویا ایک انسان اپنی بیوی سے ہر روز کئی دفعہ صحبت کرے تاہم وہ نطفہ ضائع ہونے سے رُک نہیں سکتا۔ جبتک کہ رحم سے اس کا تعلق پیدا نہ ہو جائے ۔

پس خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ اس کے یہی معنے ہیں کہ مومن وہی ہیں۔ جو لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرتے ہیں۔ اور لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرنا خدا تعالےٰ کے تعلق کا موجب ہے[۱]۔ گویا لغو باتوں سے دل کو چھڑانا خدا سے دل کو لگا لینا ہے۔ کیونکہ انسان تعبد ابدی کیلئے پیدا کیا گیا ہے

[۱] لغو تعلقات سے الگ ہونا خدا تعالےٰ کے تعلق کا اسلئے موجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی آیات میں افلح کے لفظ کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ کہ جو شخص خدا کی طلب میں کوئی کام کریگا وہ بقدر محنت کشی اور بقدر اپنی سعی کے خدا کو پائیگا۔ لہذا اس سے تعلق پیدا کر لیگا۔ پس جو شخص خدا کا تعلق حاصل کرنے کے لئے لغو کام چھوڑتا ہے۔ اسکو اس وعدہ کے موافق جو لفظ افلح میں ہے ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو اس نے کام کیا ہے۔ وہ بھی بڑا بھاری کام نہیں

اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالےٰ کی محبت موجود ہے۔ پس اسی وجہ سے انسان کی روح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ازلی ہے جیسا کہ آیۃ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلق جو انسان کو رحیمیت کے پرتوے کے نیچے آکر یعنی عبادات کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے جس تعلق کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان لاکر ہر ایک لغویات اور لغو کام اور لغو مجلس اور لغو حرکت اور لغو تعلق اور لغو جوش سے کنارہ کشی کی جائے۔ وہ اسی ازلی تعلق کو ممکن قوۃ سے حیز فعل میں لانا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نماز اور یاد الٰہی میں حالت خشوع اور رقت اور سوز و گداز ہے یہ مرتبہ اپنی ذات میں صرف اطلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی نفس خشوع کے لئے یہ لازمی امر نہیں ہے کہ ترک لغویات بھی ساتھ ہو۔ یا اس سے بڑھ کر کوئی اخلاق فاضلہ اور عادات مہذبہ ساتھ ہوں بلکہ ممکن ہے کہ جو شخص نماز میں خشوع اور رقت اور سوز اور گریہ وزاری اختیار کرتا ہے خواہ اس قدر کہ دوسرے پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے ہنوز لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو تعلقوں اور لغو نفسانی جوشوں سے اس کا دل پاک نہ ہو یعنی ممکن ہے کہ ہنوز معاصی سے اس کو رستگاری نہ ہو کیونکہ خشوع کی حالت کا کبھی کبھی دل پر وارد ہونا یا نماز میں ذوق اور سرور حاصل ہونا یہ اور چیز ہے۔ اور طہارت نفس اور چیز ہے۔ اور گو کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶

صرف ایک خفیف تعلق کو جو اس سے لغویات سے تھا چھوڑ دیا ہے۔ اور یاد رہے کہ جیسا کہ لفظ فلح اول آیۃ میں موجود ہے۔ یعنی اس آیۃ میں کہ قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون یہی لفظ عطف کے طور پر تمام آئندہ آیتوں سے وعدہ کے طور پر متعلق ہے پس آیت کہ والذین ہم عن اللغو معرضون یہ بھی معنی رکھتی ہے کہ قد افلح المومنون الذین ہم عن اللغو معرضون اور افلاح یعنی فلح کا لفظ ہر ایک مرتبہ ایمان پر ایک خاص معنے رکھتا ہے اور ایک خاص تعلق کا وعدہ دیتا ہے منہ

سالک کا خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز بدعت اور شرک کی آمیزش سے پاک بھی ہو تاہم ایسا آدمی جس کا وجود روحانی ابھی مرتبہ دوم تک نہیں پہنچا۔ ابھی صرف قبلۂ روحانی کا قصد کر رہا ہے۔ اور راہ میں سرگرداں ہے۔ اور ہنوز اس کی راہ میں طرح طرح کے دشت و بیابان اور خارستان اور کوہستان اور بحر عظیم پر طوفان اور درندگان دشمن ایمان و دشمن جان قدم قدم پر بیٹھے ہیں تاوقتیکہ وجود روحانی کے دوسرے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے ؂

یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے۔ کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے۔ بلکہ بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی کوئی نمونہ قہر الٰہی دیکھکر خشوع پیدا ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ سے ان کو کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اور نہ لغو کاموں سے ابھی رہائی ہوتی ہے مثلاً وہ زلزلہ جو چار اپریل ۱۹۰۵ء کو آیا تھا اس کے آنے کے وقت لاکھوں دلوں میں ایسا خشوع اور سوز و گداز پیدا ہوا تھا۔ کہ بجز خدا کے نام لینے اور رونے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنا دہریہ پن بھول گیا تھا۔ اور پھر جب وہ وقت جاتا رہا۔ اور زمین ٹھہر گئی۔ تو حالت خشوع نابود ہو گئی۔ یہاں تک کہ مینے سنا ہے کہ بعض دہریوں نے جو اس وقت خدا کے قائل ہو گئے تھے۔ بڑی بیحیائی اور دلیری سے کہا کہ ہمیں غلطی لگ گئی تھی۔ کہ ہم زلزلہ کے رعب میں آگئے۔ ورنہ خدا نہیں ہے ؂

غرض جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ خشوع کی حالت کے ساتھ بہت گند جمع ہو سکتے ہیں البتہ وہ تمام آیندہ کمالات کیلئے تخم کی طرح ہے۔ مگر اسی حالت کو کمال سمجھنا اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ بعد اس کے ایک اور مرتبہ ہے جس کی تلاش ایک مومن کو کرنی چاہئے۔ اور کبھی آرام نہیں لینا چاہیے۔ اور سست نہیں ہونا چاہیے جب تک وہ رتبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ وہی مرتبہ ہے جس کو کلام الٰہی نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں کہ جو باوجود خشوع اور سوز و گداز کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے

کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی خشوع کی حالت کو بیہودہ کاموں اور لغو باتوں کے ساتھ ملا کر ضائع اور برباد ہونے نہیں دیتے۔ اور طبعاً تمام لغویات سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ کاموں سے ایک کراہت ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہوتی ہے۔ کہ ان کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہو گیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف سے انسان تب ہی منہ پھیرتا ہے۔ جب دوسری طرف اس کا تعلق ہو جاتا ہے۔ پس دنیا کی لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو سیر و تماشا اور لغو صحبتوں سے واقعی طور پر اسی وقت انسان کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جب دل کا خدائے رحیم سے تعلق ہو جائے۔ اور دل پر اس کی عظمت اور ہیبت غالب آجائے۔ ایسا ہی نطفہ بھی اسی وقت لغو طور پر ضائع ہو جانے سے محفوظ ہوتا ہے۔ جب رحم سے اس کا تعلق ہو جائے اور رحم کا اثر اس پر غالب آجائے۔ اور اس تعلق کے وقت نطفہ کا نام علقہ ہو جاتا ہے پس اسی طرح روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جو مومن کا مُعرض عن اللغو ہونا ہے روحانی طور پر علقہ ہے۔ کیونکہ اسی مرتبہ پر مومن کے دل پر ہیبت اور عظمت الٰہی وارد ہو کر اس کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے چھڑاتی ہے۔ اور ہیبت اور عظمت الٰہی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کیلئے لغو باتوں۔ اور لغو کاموں کو چھوڑ دینا یہی وہ حالت ہے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں تعلق باللہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ تعلق جو صرف لغویات کے ترک کرنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ یہ ایک خفیف تعلق ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ پر مومن صرف لغویات سے تعلق توڑتا ہے۔ لیکن نفس کی ضروری چیزوں سے اور ایسی باتوں سے جن پر معیشت کی آسودگی کا حصہ ہے۔ ابھی اس کے دل سے تعلق ہوتا ہے اس لئے ہنوز ایک حصہ پلیدی کا اس کے اندر رہتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے وجود روحانی کے اس مرتبہ کو علقہ سے مشابہت دی ہے۔ اور علقہ خون جما ہوا ہوتا ہے جس میں بباعث خون ہونے کے ایک حصہ پلیدی کا باقی ہوتا ہے۔ اور اس مرتبہ میں یہ نقص اسلئے رہ جاتا ہے۔ کہ ایسے لوگ پورے طور پر خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں اور پورے طور پر ان کے دلوں میں حضرت عزت جلشانہٗ کی عظمت اور ہیبت نہیں بیٹھی

اسلئے صرف نمّی اور لغو باتوں کے چھوڑنے پر قادر ہو سکتے ہیں نہ اور باتوں پر۔ پس ناچار اسقدر پلیدی ان کے نفوس ناقصہ میں رہ جاتی ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ سے ایک خفیف سا تعلق پیدا کر کے لغویات سے تو کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ ان کاموں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ جن کا چھوڑنا نفس پرست پر بہت بھاری ہے۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کے لئے ان چیزوں کو چھوڑ نہیں سکتے۔ جو نفسانی لذات کے لوازم ضروریہ ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ محض لغویات سے مہنہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے جو بہت قابل تحسین ہو۔ بلکہ یہ مومن کی ایک ادنیٰ حالت ہے ہاں خشوع کی حالت ایک درجہ ترقی پر ہے ؛

اور جسمانی وجود کے تیسرے درجہ کے مقابل پر روحانی وجود کا تیسرا درجہ واقع ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جسمانی وجود کا تیسرا مرتبہ یہ ہے جو اس آیۃ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً یعنی پھر بعد اس کے ہم نے علقہ کو بوٹی بنایا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جسمیں وجود جسمانی انسان کا ناپاکی سے باہر آتا ہے اور پہلے سے اسمیں کسیقدر شدت اور صلابت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ نطفہ اور خون جما ہوا جو علقہ ہے۔ وہ دونوں ایک نجاستِ خفیفہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور اپنے قوام کے رو سے بھی بہ نسبت مضغہ کے نرم اور رقیق ہیں۔ مگر مضغہ جو ایک گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے پاک حالت اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے قوام میں بھی ایک حد تک سختی پیدا کر لیتا ہے۔ یہی حالت روحانی وجود کے تیسرے درجہ کی ہے۔ اور روحانی وجود کا تیسرا درجہ وہ ہے۔ جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ۔ اس آیت کے معنے یہ ہیں۔ کہ وہ مومن کہ جو پہلی دو حالتوں سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے۔ وہ صرف بیہودہ اور لغو باتوں سے ہی کنارہ کش نہیں ہوتا۔ بلکہ بخل کی پلیدی کو دُور کرنے کے لئے جو طبعاً ہر ایک انسان کے اندر ہوتی ہے۔ زکوۃ بھی دیتا ہے یعنے خدا کی راہ میں ایک حصہ اپنے مال کا خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کا نام اسی لئے زکوۃ ہے کہ انسان اس کی بجاآوری سے یعنی اپنے مال کو جو اس کو بہت پیارا ہے۔ للّٰہ دینے سے بخل کی پلیدی سے پاک ہو جاتا ہے اور جب بخل کی پلیدی جس سے انسان طبعاً بہت تعلق رکھتا ہے

انسان کے اندر سے نکل جاتی ہے۔ تو وہ کسی حد تک پاک بن کر خدا سے جو اپنی ذات میں پاک ہے ایک مناسبت پیدا کر لیتا ہے ؎

کوئی اس پاک سے جو دل لگاوے
کرے پاک آپ کو تب اُس کو پاوے

اور یہ مرتبہ پہلی دو حالتوں میں پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ صرف خشوع اور عجز و نیاز یا صرف لغو باتوں کو ترک کرنا ایسے انسان سے بھی ہو سکتا ہے جس میں ہنوز بخل کی پلیدی موجود ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے اپنے اس مال عزیز کو ترک کرتا ہے جس پر اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار ہے۔ اور جو محنت اور تکلیف اور عرق ریزی سے کمایا گیا ہے۔ تب بخل کی پلیدی اس کے اندر سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان میں بھی ایک شدت اور صلابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ دونوں حالتیں مذکورہ بالا جو پہلے اس سے ہوتی ہیں۔ ان میں یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک چھپی ہوئی پلیدی ان کے اندر رہتی ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے۔ کہ لغویات سے منہ پھیرنے میں صرف ترک شر ہے۔ اور شر بھی ایسی جس کی زندگی اور بقا کے لئے کچھ ضرورت نہیں اور نفس پر اس کے ترک کرنے میں کوئی مشکل نہیں۔ لیکن اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کی خوشنودی کے لئے دینا یہ کسب خیر ہے۔ جس سے وہ نفس کی ناپاکی جو سب ناپاکیوں سے بدتر ہے یعنی بخل دُور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ایمانی حالت کا تیسرا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں سے اشرف اور افضل ہے۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کے تیار ہونے میں مضغہ کا درجہ ہے۔ جو پہلے دو درجوں نطفہ اور علقہ سے فضیلت میں بڑھ کر ہے۔ اور پاکی میں خصوصیت رکھتا ہے۔ کیونکہ نطفہ اور علقہ دونوں نجاست خفیفہ سے ملوث ہیں۔ مگر مضغہ پاک حالت میں ہے۔ اور جس طرح رحم میں مضغہ کو بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے ایک ترقی یافتہ حالت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے رحم سے اس کا تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہی حالت وجود روحانی کے مرتبہ سوم کی ہے جس کی تعریف خدا تعالیٰ

نے یہ فرمائی ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں۔ جو اپنے نفس کو بخل سے پاک کرنے کے لیئے اپنا عزیز مال خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔ اور اس فعل کو وہ آپ اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں پس وجود روحانی کی اس مرتبہ سوم میں وہی تین خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو وجود جسمانی کے مرتبہ سوم میں یعنی مضغہ ہونے کی حالت میں پائی جاتی ہیں کیونکہ یہ حالت جو بخل سے پاک ہونے کے لئے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور اپنی محنت سے حاصل کردہ سرمایہ محض للہ دوسرے کو دینا بہ نسبت اس حالت کے جو محض لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا ہے۔ ایک ترقی یافتہ حالت ہے اور اس میں صریح اور بدیہی طور پر بخل کی پلیدی سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بڑھتا ہے کیونکہ اپنے مال عزیز کو خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو باتوں کے چھوڑنے کے زیادہ تر نفس پر بھاری ہے۔ اس لئے اس زیادہ تکلیف اٹھانے کے کام سے خدا سے تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور بباعث ایک مشقت کا کام بجالانے کے ایمانی شدت اور صلاحیت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب اس کے بعد روحانی وجود کا چوتھا درجہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ یعنے تیسرے درجہ سے بڑھ کر مومن وہ ہیں جو اپنے تئیں نفسانی جذبات اور شہوات ممنوعہ سے بچاتے ہیں۔ یہ تیسرے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے کہ تیسرے درجہ کا مومن تو صرف مال کو جو اس کے نفس کو نہایت پیارا اور عزیز ہے۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے۔ لیکن چوتھے درجہ کا مومن وہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں نثار کرتا ہے۔ جو مال سے بھی زیادہ پیاری اور محبوب ہے یعنی شہوات نفسانیہ۔ کیونکہ انسان کو اپنی نفسانیہ شہوات سے اس قدر محبت ہے۔ کہ وہ اپنی شہوات کے پورا کرنے کے لئے اپنے مال عزیز کو پانی کیطرح خرچ کرتا ہے۔ اور ہزارہا روپیہ شہوات کے پورا کرنے کے لئے برباد کر دیتا ہے۔ اور شہوات کے حاصل کرنے کے لئے مال کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ ایسے بخس طبع اور بخیل لوگ جو ایک محتاج اور بھوکے اور ننگے کو بباعث سخت بخل کے ایک پیسہ بھی دے نہیں

سکتے۔ شہوات نفسانیہ کے جوش میں بازاری عورتوں کو ہزارہا روپیہ دے کر اپنا گھر ویران کر لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ سیلاب شہوت ایسا تند اور تیز ہے۔ کہ بخل جیسی نجاست کو بھی بہا لیجاتا ہے۔ اس لئے یہ بدیہی امر ہے کہ بہ نسبت اس قوت ایمانی کے جس کی ذریعہ سے بخل دُور ہوتا ہے۔ اور انسان اپنا عزیز مال خدا کے لئے دیتا ہے۔ یہ قوتِ ایمانی جس کے ذریعہ سے انسان شہوات نفسانیہ کے طوفان سے بچتا ہے۔ نہایت زبردست اور شیطان کا مقابلہ کرنے میں نہایت سخت اور نہایت دیرپا ہے۔ کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ نفس امارہ جیسے پرانے اژدہا کو اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالتی ہے۔ اور بخل تو شہوات نفسانیہ کے پورا کرنے کے جوش میں اور نیز ریا اور نمود کے وقتوں میں بھی دُور ہو سکتا ہے۔ مگر یہ طوفان جو نفسانی شہوات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہایت سخت اور دیرپا طوفان ہے۔ جو کسی طرح بجز رحم خداوندی کے دور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضا میں سے ہڈی نہایت سخت ہے۔ اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے۔ اسی طرح اس طوفان کے دُور کرنے والی قوت ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے۔ تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کر کے پامال کر سکے۔ اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے کیونکہ شہوات نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُر آشوب طوفان ہے۔ کہ بجز خاص رحم حضرتِ احدیت کے فرو نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو کہنا پڑا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ۔

یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا۔ نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مخلصی غیر ممکن ہے۔ مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرماوے اس آیت میں جیسا کہ فقرہ اِلَّا مَا رَحِمَ ہے۔ طوفانِ نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفان شہوات نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔

اور اس درجہ روحانی کے مقابل پر جو وجود روحانی کا چوتھا درجہ ہے جسمانی وجود

کا درجہ چہارم ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا یعنے پھر ہم نے مضغہ سے ہڈیاں بنائیں اور ظاہر ہے۔ کہ ہڈیوں میں بہ نسبت مضغہ یعنی بوٹی کے زیادہ صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نیز ہڈی بہ نسبت مضغہ کے بہت دیرپا ہے۔ اور ہزاروں برس تک اس کا نشان رہ سکتا ہے پس وجود روحانی کے درجہ چہارم اور وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں مشابہت ظاہر ہے۔ کیونکہ وجود روحانی کے درجہ چہارم میں بہ نسبت وجود روحانی کے درجہ سوم کے ایمانی شدت اور صلابت زیادہ ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بھی زیادہ۔ ایسا ہی وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں جو استخوان کا پیدا ہونا ہے۔ بہ نسبت درجہ سوم وجود جسمانی کے جو محض مضغہ یعنے بوٹی ہے۔ جسمانی طور پر شدت اور صلابت زیادہ ہے۔ اور رحم سے تعلق بھی زیادہ۔

پھر چہارم درجہ کے بعد پانچواں درجہ وجود روحانی کا وہ ہے۔ جسکو خدا تعالےٰ نے اس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ یعنی پانچیں درجے کے مومن جو چوتھے درجے سے بڑھ گئے ہیں۔ وہ میں اپنا صرف اپنے نفس میں یہی کمال نہیں رکھتے۔ جو نفس امارہ کی شہوات پر غالب آگئے ہیں اور اس کے جذبات پر ان کو فتح عظیم حاصل ہو گئی ہے۔ بلکہ وہ حتی الوسع خدا اور اسکے مخلوق کی تمام امانتوں اور تمام عہدوں کے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھ کر تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک طاقت ہے۔ اس راہ پر چلتے ہیں۔ خدا کے عہدوں سے مراد وہ ایمانی عہد ہیں جو بیعت اور ایمان لانے کے وقت مومن سے لے جاتے ہیں۔ جیسے شرک نہ کرنا اور خون ناحق نہ کرنا وغیرہ۔

لفظ رٰعُوْنَ جو اس آیت میں آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں رعایت رکھنے والے یہ لفظ عرب کے محاورہ کے موافق اُس جگہ بولا جاتا ہے۔ جہاں کوئی شخص اپنی قوت اور طاقت کے مطابق کسی امر کی باریک راہ پر چلنا اختیار کرتا ہے۔ اور اس امر کے تمام دقائق بجالانا چاہتا ہے۔ اور کوئی پہلو اس کا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ پس اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ وہ مومن جو وجود روحانی کے پنجم درجہ پر ہیں حتی الوسع اپنی موجودہ

طاقت کے مواقف تقوٰی کی باریک راہوں پر قدم مارتے ہیں۔ اور کوئی پہلو تقوٰی کا جو امانتوں یا عہد کے متعلق ہے۔ خالی چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور سب کی رعایت رکھنا اُن کے ملحوظ نظر ہوتا ہے۔ اور اس بات پر خوش نہیں ہوتے کہ موٹے طور پر اپنے تئیں امین اور صادق العہد قرار دیدیں۔ بلکہ ڈرتے رہتے ہیں۔ کہ درپردہ ان سے کوئی خیانت ظہور پذیر نہ ہو۔ پس طاقت کے موافق اپنے تمام معاملات میں توجہ سے غور کرتے رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو۔ کہ اندرونی طور پر ان میں کوئی نقص اور خرابی ہو۔ اور اسی رعایت کا نام دوسرے لفظوں میں تقوٰی ہے ؏

خلاصہ مطلب یہ کہ وہ مومن جو وجود روحانی پر پنجم درجہ پر ہیں وہ اپنے معاملات میں خواہ وہ خدا کے ساتھ ہیں خواہ مخلوق کے ساتھ بے قید اور خلیع الرسن نہیں ہوتے۔ بلکہ اس خوف سے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی اعتراض کے نیچے نہ آجاویں اپنی امانتوں اور عہدوں میں دور دور کا خیال رکھ لیتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی پڑتال کرتے رہتے ہیں۔ اور تقوٰی کی دُوربین سے اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھتے رہتے ہیں۔ تا ایسا نہ کہ درپردہ انکی امانتوں اور عہدوں میں کچھ فتور ہو اور جو امانتیں خدا تعالیٰ کی ان کے پاس ہیں۔ جیسے تمام قوٰی اور تمام اعضاء اور جان اور مال اور عزت وغیرہ ان کو حتی الوسع اپنی پابندی تقوٰی بہت احتیاط سے اپنے محل پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اور جو عہد ایمان لانے کے وقت خدا تعالیٰ سے کیا ہے کمال صدق سے حتی المقدور اس کے پورا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسا ہی جو امانتیں مخلوق کی ان کے پاس ہوں۔ یا ایسی چیزیں جو امانتوں کے حکم میں ہوں ان سب میں بامقدور تقوٰی کی پابندی سے کاربند ہوتے ہیں اگر کوئی تنازع واقع ہو تو تقوٰی کو مدنظر رکھکر اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔ گو اس فیصلہ میں نقصان اُٹھاتے ہیں۔ یہ درجہ چوتھے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے۔ کہ اسمیں حتے الوسع تمام اعمال میں تقوٰی کی باریک راہوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور حتی الوسع جمیع امور میں ہر ایک قدم تقوٰی کی رعایت سے اُٹھانا پڑتا ہے۔ مگر چوتھا درجہ صرف ایک ہی موٹی بات ہے

اور وہ یہ کہ زنا سے اور بدکاریوں سے پرہیز کرنا اور ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ زنا ایک بہت بیحیائی کا کام ہے۔ اور اس کا مرتکب شہوات نفس سے اندھا ہو کر ایسا ناپاک کام کرتا ہے۔ کہ جو انسانی نسل کے حلال سلسلہ میں حرام کو ملا دیتا ہے۔ اور تضیع نسل کا موجب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے اس کو ایسا بھاری گناہ قرار دیا ہے۔ کہ اسی دنیا میں ایسے انسان کے لئے حد شرعی مقرر ہے۔

پس ظاہر ہے کہ مومن کی تکمیل کیلئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ زنا سے پرہیز کرے کیونکہ زنا نہایت درجہ مفسد طبع اور بیحیا انسانوں کا کام ہے اور یہ ایک ایسا موٹا گناہ ہے جو جاہل سے جاہل اس کو بُرا سمجھتا ہے۔ اور اس پر بجز کسی بے ایمان کے کوئی بھی دلیری نہیں کر سکتا پس اس کا ترک کرنا ایک معمولی شرافت ہے۔ کوئی بڑے کمال کی بات نہیں لیکن انسان کی تمام روحانی خوبصورتی تقوای کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے۔ تقوای کی باریک راہیں روحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی امانتوں اور ایمانی عہدوں* کی حتی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پیر تک جتنے قوٰی اور اعضا ہیں۔ جنمیں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ

ایمان کیلئے خشوع کی حالت مثل بیج کے ہے۔ اور پھر لغو باتوں کے چھوڑنے سے ایمان اپنا نرم نرم سبزہ نکالتا ہے۔ اور پھر اپنا مال بطور زکوٰۃ دینے سے ایمانی درخت کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں۔ جو اس کو کسی قدر مضبوط کرتی ہیں۔ اور پھر شہوات نفسانیہ کا مقابلہ کرنے سے ان ٹہنیوں میں خوب مضبوطی اور سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اپنے عہد اور امانتوں کی تمام شاخوں کی محافظت کرنے سے درخت ایمان کا اپنے مضبوط تنے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پھر پھل لانے کے وقت ایک اور طاقت کا فیضان اس پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طاقت سے پہلے نہ درخت کو پھل لگ سکتا ہے نہ پھول وہی طاقت روحانی پیدائش کے مرتبہ ششم میں خلق آخر کہلاتی ہے۔ اور مرتبہ ششم پر انسانی کمالات کے پھل اور پھول ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں۔ اور انسانی درخت کی روحانی شاخیں صرف مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے پھل بھی دیتی ہیں۔ منہ

* ایمانی عہدوں سے مراد وہ عہد ہیں جو انسان بیعت اور ایمان لانے کے وقت اقرار کرتا ہے

اور پیر اور دوسرے اعضاء ہیں۔ اور باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محل ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور ان کے پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا۔ اور اسی کے مقابل پر حقوق عباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے جو انسان کی تمام روحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ لباس التقویٰ قرآن شریف کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تابمقدور کاربند ہو جائے۔

یہ تو وجود روحانی کا پانچواں درجہ ہے۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا پانچواں درجہ وہ ہے کہ جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا یعنی پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت مڑھ دیا۔ اور جسمانی بناوٹ کی کسی قدر خوبصورتی دکھلا دی۔ یہ عجیب مطابقت ہے۔ کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ روحانی طور پر تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے۔ ایسا ہی کَسَوْنَا کا لفظ جو کسوت سے نکلا ہے۔ وہ بھی بتلا رہا ہے کہ جو گوشت ہڈیوں پر مڑھا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک لباس ہے۔ جو ہڈیوں پر پہنایا جاتا ہے پس یہ دونوں لفظ دلالت کر رہے ہیں۔ کہ جیسی خوبصورتی کا لباس تقویٰ پہناتی ہے۔ ایسا ہی وہ کسوت جو ہڈیوں پر چڑھائی جاتی ہے ہڈیوں کے لئے ایک خوبصورتی کا پیرایہ بخشتی ہے۔ وہاں لباس کا لفظ ہے اور یہاں کسوت کا اور دونوں کے معنے ایک ہیں۔ اور نص قرآنی باواز بلند پکار رہی ہے۔ کہ دونوں کا مقصد خوبصورتی ہے اور جیسا کہ انسان کی روح پر سے اگر تقویٰ کا لباس اتار دیا جائے۔ تو روحانی بدشکلی اس کی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ گوشت و پوست جو حکیم مطلق نے انسان کی ہڈیوں پر مڑھا ہے۔ اگر ہڈیوں پر سے اتار دیا

جائے۔ تو انسان کی جسمانی شکل نہایت مکروہ نکل آتی ہے۔ مگر اس درجہ پنجم میں خواہ درجہ پنجم وجود جسمانی کا ہے۔ اور خواہ درجہ پنجم وجود روحانی کا ہے۔ کامل خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ابھی روح کا اس پر فیضان نہیں ہوا۔ یہ امر مشہود و محسوس ہے کہ ایک انسان گو کیسا ہی خوبصورت ہو۔ جب وہ مرجاتا ہے۔ تو اس کی روح اس کے اندر سے نکل جاتی ہے۔ تو ساتھ ہی اس حسن میں بھی فرق آجاتا ہے۔ جو اس کو قدرت قادر نے عطا کیا تھا۔ حالانکہ تمام اعضاء اور تمام نقوش موجود ہوتے ہیں۔ مگر صرف ایک روح کے نکلنے سے انسانی قالب کا گھر ایک ویران اور سنسان سا معلوم ہوتا ہے۔ اور آب و تاب کا نشان نہیں رہتا۔ یہی حالت روحانی وجود کے پانچویں درجہ کی ہے۔ کیونکہ یہ امر بھی مشہود و محسوس ہے کہ جب تک کسی مومن میں خدا تعالےٰ کی طرف سے اس روح کا فیضان نہ ہو۔ جو وجود روحانی کے چھٹے درجہ پر ملتی ہے اور ایک فوق العادت طاقت اور زندگی بخشتی ہے۔ تب تک خدا کی امانتوں کے ادا کرنے اور ان کے ٹھیک طور پر استعمال کرنے اور صدق کے ساتھ اس کا ایمانی عہد پورا کرنے اور ایسا ہی مخلوق کے حقوق اور عہدوں کے ادا کرنے میں وہ آب و تاب تقوٰی پیدا نہیں ہوتی۔ جس کا حسن اور خوبی دلوں کو اپنی طرف کھینچے۔ اور جس کی ہر ایک ادا فوق العادت اور اعجاز کے رنگ میں معلوم ہو۔ بلکہ قبل اس رُوح کے تقوٰی کے ساتھ تکلف اور بناوٹ کی ایک ملونی رہتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ روح نہیں ہوتی جو حسن روحانی کی آب و تاب کہلا سکے۔ اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ ایسے مومن کا قدم جو ابھی رُوح سے خالی ہے۔ پوری طور پر نیکی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ جیسا کہ ایک ہوا کے دھکے سے مردہ کا کوئی عضو حرکت کر سکتا ہے۔ اور جب ہوا دور ہو جائے۔ تو پھر مردہ اپنی حالت پر آجاتا ہے۔ ایسا ہی وجود روحانی کے پنجم درجہ کی حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ صرف عارضی طور پر خدا تعالیٰ کی نسیم رحمت اس کو نیک کاموں کی طرف جنبش دیتی رہتی ہے۔ اور اس طرح تقوٰی کے کام اس سے صادر ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی نیکی کی روح اس کے اندر آباد نہیں ہوتی اسلئے

وہ حسن معاملہ اس میں پیدا نہیں ہوتا۔ جو اس روح کے داخل ہونے کے بعد اپنا جلوہ دکھلاتا ہے ۔
غرض پنجم مرتبہ وجود روحانی کا گویا ایک ناقص مرتبہ حسن تقویٰ کا حاصل کرلیتا ہے مگر کمال
اس حسن کا وجود روحانی کے درجہ ششم پر ہی ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ خدا تعالےٰ کی اپنی محبت
ذاتیہ روحانی وجود کے لئے ایک روح کی طرح ہو کر انسان کے دل پر نازل ہوتی اور تمام
نقصانوں کا تدارک کرتی ہے۔ اور انسان محض اپنی قوتوں کے ساتھ کبھی کامل نہیں ہو سکتا
جب تک کہ وہ روح خدا تعالیٰ کیطرف سے نازل نہ ہو۔ جیسا کہ حافظ شیرازی نے فرمایا ہے۔

ما بداں منزلِ عالی نتوانیم رسید
ہاں مگر لطف تو چوں پیش نہد گامے چند

پھر درجہ پنجم کے بعد چھٹا درجہ وجود روحانی کا وہ ہے جسکو خدا تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ
میں ذکر فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ یعنی چھٹے درجہ کے مومن جو
پانچویں درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر آپ محافظ اور نگہبان ہیں یعنی وہ
کسی دوسرے کی تذکیر اور یاد دہانی کے محتاج نہیں رہے بلکہ کچھ ایسا تعلق ان کو خدا سے
پیدا ہو گیا ہے اور خدا کی یاد کچھ اس قسم کی محبوب طبع اور مدار آرام اور مدار زندگی ان کے
لئے ہو گئی ہے۔ کہ وہ ہر وقت اس کی نگہبانی میں لگے رہتے ہیں۔ اور ہر دم ان کا یاد الٰہی میں
گذرتا ہے۔ اور نہیں چاہتے کہ ایکدم بھی خدا کے ذکر سے الگ ہوں۔
اب ظاہر ہے کہ انسان اسی چیز کی محافظت اور نگہبانی میں تمامتر کوشش کرکے ہر دم
لگا رہتا ہے۔ جس کے گم ہونے میں اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھتا ہے۔ جیسا کہ ایک مسافر جو
ایک بیابان بے آب ودانہ میں سفر کر رہا ہے۔ جس کے صدہا کوس تک پانی اور روٹی ملنے کی
کوئی امید نہیں۔ وہ اپنے پانی اور روٹی کی جو ساتھ رکھتا ہے۔ بہت محافظت کرتا ہے۔
اور اپنی جان کے برابر اس کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ضائع ہونے
میں اس کی موت ہے۔ پس وہ لوگ جو اس مسافر کی طرح اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں
اور گو مال کا نقصان ہو یا عزت کا نقصان ہو۔ یا نماز کی وجہ سے کوئی ناراض ہو جائے نماز
کو نہیں چھوڑتے۔ اور اس کے ضائع ہونے کے اندیشہ میں سخت بیتاب ہوتے اور سخت پیچ و تاب

کھاتے گویا مرہی جاتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ایکدم بھی یاد الٰہی سے الگ ہوں۔ وہ درحقیقت نماز اور یاد الٰہی کو اپنی ایک ضروری غذا سمجھتے ہیں۔ جس پر ان کی زندگی کا مدار ہے۔ اور یہ حالت اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی محبت ذاتیہ کا ایک افروختہ شعلہ جس کو روحانی وجود کے لئے ایک روح کہنا چاہیئے۔ ان کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ اور ان کو حیات ثانی بخش دیتا ہے۔ اور وہ روح ان کے تمام وجود روحانی کو روشنی اور زندگی بخشتی ہے۔ تب وہ نہ کسی تکلیف اور بناوٹ سے خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں بلکہ وہ خدا جس نے جسمانی طور پر انسان کی زندگی روٹی اور پانی پر موقوف رکھی ہے۔ وہ ان کی روحانی زندگی کو جس سے وہ پیار کرتے ہیں۔ اپنی یاد کی غذا سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس روٹی اور پانی کو جسمانی روٹی اور پانی سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے ضائع ہونے سے ڈرتے ہیں۔ اور یہ اس روح کا اثر ہوتا ہے۔ جو ایک شعلہ کی طرح ان میں ڈالی جاتی ہے جس سے عشق الٰہی کی کامل مستی ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ یاد الٰہی سے ایکدم الگ ہونا نہیں چاہتے۔ وہ اس کے لئے دکھ اٹھاتے اور مصائب دیکھتے ہیں مگر اس سے ایک لحظ بھی جدا ہونا نہیں چاہتے۔ ... ...

... ... وہ پاس انفاس کرتے ہیں۔ اور اپنی نمازوں کے محافظ اور نگہبان رہتے ہیں۔ اور یہ امر ان کے لئے طبعی ہے۔ کیونکہ درحقیقت خدا نے اپنی محبت سے بھری ہوئی یاد کو جس کو دوسرے لفظوں میں نماز کہتے ہیں۔ ان کے لئے ایک ضروری غذا مقرر کر دیا ہے اور اپنی محبت ذاتیہ سے اُن پر تجلی فرما کر یاد الٰہی کی ایک دلکش لذت اُن کو عطا کی ہے۔ پس اس وجہ سے یاد الٰہی جان کی طرح بلکہ جان سے بڑھ کر ان کو عزیز ہو گئی ہے۔ اور خدا کی ذاتی محبت ایک نئی روح ہے۔ جو شعلہ کی طرح ان کے دلوں پر پڑتی اور ان کی نماز اور یاد الٰہی کو ایک غذا کی طرح ان کے لئے بنا دی ہے پس وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ روٹی اور پانی سے نہیں بلکہ نماز اور یاد الٰہی سے جیتے ہیں۔

غرض محبت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جس کا نام نماز ہے۔ وہ درحقیقت ان کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتے۔ اور جس کی محافظت اور نگہبانی بعینہٖ اس مسافر کی طرح وہ

کرتے رہتے ہیں۔ جو ایک دشت بے آب و دانہ میں اپنی چند روٹیوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔ اور اپنے کسی قدر پانی کو جان کے ساتھ رکھتا ہے۔ جو اس کی مشک میں ہے واہب مطلق نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے یہ بھی ایک مرتبہ رکھا ہوا ہے۔ جو محبت ذاتی اور عشق کے غلبہ اور استیلا کا آخری مرتبہ ہے۔ اور درحقیقت اس مرتبہ پر انسان کے لئے محبت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جسکا شرعی اصطلاح میں نماز نام ہے۔ غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ بار بار جسمانی روح کو بھی اس غذا پر فدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور خدا سے علیحدہ ایکدم بھی بسر کرنا اپنی موت سمجھتا ہے۔ اور اس کی رُوح آستانہ الٰہی پر ہر وقت سجدہ میں رہتی ہے۔ اور تمام آرام اُس کا خدا ہی میں ہو جاتا ہے۔ اور اس کو یقین ہوتا ہے۔ کہ میں اگر ایک طرفۃ العین بھی یاد الٰہی سے الگ ہوا تو بس میں مرا۔ اور جس طرح روٹی سے جسم میں تازگی اور آنکھ اور کان وغیرہ اعضا کی قوتوں میں توانائی آجاتی ہے۔ اسی طرح اس مرتبہ پر یاد الٰہی جو عشق اور محبت کے جوش سے ہوتی ہے۔ مومن کی روحانی قوتوں کو ترقی دیتی ہے۔ یعنی آنکھ میں قوت کشف نہایت صاف اور لطیف طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کان خدا تعالٰے کے کلام کو سنتے ہیں۔ اور زبان پر وہ کلام نہایت لذیذ اور اجلی اور اصفی طور پر جاری ہو جاتا ہے۔ اور رویا صادقہ بکثرت ہوتے ہیں ٭ جو فلق صبح کیطرح ظہور میں آجاتے ہیں۔ اور بباعث علاقہ صافیہ محبت جو حضرت عزت سے

٭ بہت سے نادان اس وہم میں گرفتار ہیں۔ کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خواب آجاتی ہے یا سچا الہام ہو جاتا ہے۔ تو ہم میں اور ایسے مرتبہ کے لوگوں میں فرق کیا ہوا۔ اور ان عالی مرتبہ لوگوں کی کیا خصوصیت باقی رہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قدر طاقت خواب دیکھنے یا الہام کی اس غرض سے عام لوگوں کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ کہ تا ان کے پاس بھی ان باریکیوں کا کسی قدر نمونہ ہو۔ جو اس جہان سے وراء الوراء باتیں ہیں۔ اور اس طرح پر وہ اپنے پاس ایک نمونہ دیکھ کر دولت قبول سے محروم نہ رہیں۔ اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ ورنہ اگر انسانوں کی یہ حالت ہوتی کہ وحی اور رویا صادقہ کی حقیقت سے وہ بالکل بیخبر ہوتے۔ تو بجز انکار کے کیا کر سکتے تھے۔ اور

ہوتا ہے۔ مبشر خوابوں سے بہت سا حصہ ان کو ملتا ہے۔ یہی وہ مرتبہ ہے۔ جس مرتبہ پر مومن کو محسوس ہوتا ہے۔ کہ خدا کی محبت اس کے لئے روٹی اور پانی کا کام دیتی ہے یہ نئی پیدائش اس وقت ہوتی ہے۔ جب پہلے روحانی قالب تمام تیار ہو چکتا ہے اور پھر وہ روح جو محبت ذاتیہ الٰہیہ کا ایک شعلہ ہے۔ ایسے مومن کے دل پر آپڑتا ہے۔ اور ایکدفعہ طاقت بالائیں بشریت سے بلند تر اس کو لے جاتی ہے اور یہ مرتبہ وہ ہے جسکو روحانی طور پر خلق آخر کہتے ہیں۔ اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ اپنی ذاتی محبت کا ایک افروختہ شعلہ جس کو دوسرے لفظوں میں روح کہتے ہیں مومن کے دل پر نازل کرتا ہے۔ اور اس سے تمام تاریکیوں اور آلائشوں اور کمزوریوں کو دور کر دیتا ہے۔ اور اس روح کے پھونکنے کے ساتھ ہی وہ حسن جو ادنیٰ مرتبہ پر تھا کمال کو پہنچ جاتا ہے اور ایک روحانی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے۔ اور گندی زندگی کی کبودگی بکلی دور ہو جاتی ہے۔ اور مومن اپنے اندر محسوس کر لیتا ہے۔ کہ ایک نئی روح اس کے اندر داخل ہو گئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔ اس روح کے ملنے سے ایک عجیب سکینت اور اطمینان مومن کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور محبت ذاتیہ ایک فوارہ کی طرح جوش مارتی اور عبودیت کے پودے کی آبپاشی کرتی ہے۔ اور وہ آگ جو پہلے ایک معمولی گرمی کی حد تک تھی۔ اس درجہ پر وہ تمام و کمال افروختہ ہو جاتی ہے۔ اور انسانی وجود کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر الوہیت کا قبضہ اس پر کر دیتی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱

اس حالت میں کسی قدر معذور تھے۔ پھر جبکہ باوجود موجود ہونے اس نمونہ کے زمانہ حال کے فلسفی اب تک وحی اور رویائے صادقہ کا انکار کرتے ہیں۔ تو اس وقت عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جبکہ ان کے پاس کوئی بھی نمونہ نہ ہوتا۔ اور یہ خیال کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خوابیں آجاتی ہیں یا کوئی سچے الہام ہو جاتے ہیں۔ اس سے رسولوں اور نبیوں کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے رویا اور الہام شکوک اور شبہات کے دخان سے خالی نہیں ہوتے اور باایں ہمہ مقدار میں بھی کم ہوتے ہیں جیسا کہ ایک مفلس ایک پیسہ کے ساتھ ایک بادشاہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس بھی مال ہے اور اس کے پاس بھی ایسا ہی یہ مقابلہ بھی ہیچ اور سراسر حماقت ہے۔ منہ۔

ہے۔ اور وہ آگ تمام اعضاء پر احاطہ کر لیتی ہے۔ تب اس لوہے کی مانند جو نہایت درجہ آگ میں تپایا جائے یہاں تک کہ سُرخ ہو جائے۔ اور آگ کے رنگ پر ہو جائے۔ اس مومن سے الوہیت کے آثار اور افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ لوہا بھی اس درجہ پر آگ کے آثار اور افعال ظاہر کرتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ وہ مومن خدا ہو گیا ہے۔ بلکہ محبت الٰہیہ کا کچھ ایسا ہی خاصہ ہے کہ جو اپنے رنگ میں ظاہر وجود کو لے آتی ہے۔ اور باطن میں عبودیت اور اس کا ضعف موجود ہوتا ہے۔ اس درجہ پر مومن کی روٹی خدا ہوتا ہے۔ جس کے کھانے پر اس کی زندگی موقوف ہوتی ہے۔ اور مومن کا پانی بھی خدا ہوتا ہے۔ جس کے پینے سے وہ موت سے بچ جاتا ہے۔ اور اس کی ٹھنڈی ہوا بھی خدا ہی ہوتا ہے۔ جس سے اس کے دل کو راحت پہنچتی ہے۔ اور اس مقام پر استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ خدا اس مرتبہ کے مومن کے اندر داخل ہوتا اور اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا۔ اور اس کے دل کو اپنا تخت گاہ بنا لیتا ہے۔ تب وہ اپنے روح سے نہیں بلکہ خدا کے روح سے دیکھتا اور خدا کی رُوح سے سُنتا اور خدا کی روح سے بولتا اور خدا کی روح سے چلتا اور خدا کی روح سے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مرتبہ پر نیستی اور استہلاک کے مقام میں ہوتا ہے۔ اور خدا کی روح اس پر اپنی محبت ذاتیہ کے ساتھ تجلی فرما کر حیات ثانی اس کو بخشتی ہے۔ پس اسوقت روحانی طور پر اس پر یہ آیت صادق آتی ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؎

یہ تو وجود روحانی کا مرتبہ ششم ہے۔ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی پیدائش کا مرتبہ ششم ہے اور اس جسمانی مرتبہ کے لئے بھی وہی آیت ہے جو روحانی مرتبہ کے لئے اوپر ذکر ہو چکی ہے یعنی ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب ہم ایک پیدائش کو طیار کر چکے تو بعد اس کے ہم نے ایک اور پیدائش سے انسان کو پیدا کیا۔ اور کے لفظ سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ وہ ایسی فوق الفہم پیدائش ہے کہ جسکا سمجھنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے۔ اور اس کے فہم سے بہت دور یعنی روح جو قالب کی تیاری کے بعد جسم میں ڈالی جاتی ہے۔ وہ ہم نے انسان میں روحانی اور جسمانی دونوں طور پر ڈالدی۔ جو مجہول الکنہ ہے۔ اور جس کی نسبت تمام فلسفی

اور اس مادی دنیا کے تمام مقلد حیران ہیں. کہ وہ کیا چیز ہے. اور جبکہ حقیقت تک ان کو راہ نہ ملی تو اپنی اٹکل سے ہر ایک نے بھیں لگائیں. کسی نے روح کے وجود سے ہی انکار کیا. اور کسی نے اس کو قدیم اور غیر مخلوق سمجھا پس اللہ تعالیٰ اس جگہ فرماتا ہے. کہ روح بھی خدا کی پیدائش ہے مگر دنیا کے فہم سے بالاتر ہے. اور جیسا کہ اس دنیا کے فلاسفر اس روح سے بیخبر ہیں. جو وجود جسمانی کے چھٹے مرتبہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسم پر فائض ہوتی ہے. ویسا ہی وہ لوگ اُس روح سے بھی بے علم رہے. جو وجود روحانی کے چھٹے مرتبہ پر مومن صادق کو خدا تعالیٰ سے ملتی ہے. اور اس بارے میں بھی مختلف راہیں اختیار کیں. بہتوں نے ایسے لوگوں کی پوجا شروع کر دی جن کو وہ روح بھی دی گئی تھی. اور ان کو قدیم اور غیر مخلوق خدا سمجھ لیا. اور بہتوں نے اس سے انکار کر دیا. کہ اس مرتبہ کے لوگ بھی ہوتے ہیں. اور ایسی روح بھی انسان کو ملتی ہے.

لیکن اس بات کو بہت جلد ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے. کہ جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خدا نے زمین کے تمام پرند و چرند پر اس کو بزرگی دیکر اور سب پر حکومت بخش کر اور عقل و فہم عنایت فرما کر اور اپنی معرفت کی ایک پیاس لگا کر اپنے ان تمام افعال سے جتلا دیا ہے کہ انسان خدا کی محبت اور عشق کے لئے پیدا کیا گیا ہے. تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جائے. کہ انسان محبت ذاتیہ کے مقام تک پہنچکر اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کی محبت پر خدا کی محبت ایک روح کی طرح وارد ہو کر تمام کمزوریاں اس کی دور کر دے. اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وجود روحانی کے ششم مرتبہ کے بارے میں فرمایا ہے. وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ایسا ہی دائمی حضور اور سوز و گداز اور عبودیت انسان سے سرزد ہو. اور اس طرح پر وہ اپنے وجود کی علت غائی کو پورا کرے. جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے. وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ یعنے میں نے پرستش کیلئے ہے جن و انس کو پیدا کیا ہے ہاں یہ پرستش اور حضرت عزت کے سامنے دائمی حضور کے ساتھ کھڑا ہونا بجز محبت ذاتیہ کے ممکن نہیں. اور محبت سے مراد یکطرفہ محبت نہیں. بلکہ خالق اور مخلوق کی دونوں محبتیں مراد ہیں تا بجلی کی آگ کی طرح جو مرنے والے انسان پر گرتی ہے. اور جو اس وقت اس انسان کے اندر سے نکلتی ہے. بشریت کی کمزوریوں کو جلا دیں اور دونوں ملکر تمام روحانی وجود

پر قبضہ کرلیں ۔

یہی وہ کامل صورت ہے کہ جس میں انسان ان امانتوں اور عہد کو جنکا ذکر وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تحریر ہے۔ کامل طور پر اپنے اپنے موقع پر ادا کرسکتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مرتبہ پنجم میں انسان صرف تقوے کے لحاظ سے خدا اور مخلوق کی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتا ہے۔ اور اس مرتبہ پر محبت ذاتی کے تقاضا سے جو خدا کے ساتھ اس کو ہوگئی ہے جس کی وجہ سے خدا کی مخلوق کی محبت بھی اس میں جوش زن ہوگئی ہے۔ اور اس روح کے تقاضا سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر نازل ہوتی ہے۔ ان تمام حقوق کو طبعًا بوجہ احسن ادا کرتا ہے اور اس صورت میں وہ حسن باطنی جو حُسن ظاہری کے مقابل پر ہے۔ بوجہ احسن اس کو نصیب ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تو ابھی وہ روح انسان میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ جو محبت ذاتیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے جلوہ حسن بھی ابھی کمال پر نہیں تھا۔ مگر روح کے داخل ہونے کے بعد وہ حُسن کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مردہ خوبصورت اور زندہ خوبصورت یکساں آب و تاب نہیں رکھتے ۔

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں انسان کی پیدائش میں دو قسم کے حُسن ہیں۔ ایک حسن معاملہ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی امانتوں اور عہد کے ادا کرنے میں یہ رعایت رکھے کہ کوئی امر حتے الوسع ان کے متعلق فوت نہ ہو۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں رَاعُونَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسا ہی لازم ہے کہ انسان مخلوق کی امانتوں اور عہد کی نسبت بھی یہی لحاظ رکھے۔ یعنی حقوق اللہ اور حقوق عباد میں تقویٰ سے کام لے یہ حُسن معاملہ ہے۔ یا یوں کہو کہ روحانی خوبصورتی ہے جو درجہ پنجم وجود روحانی میں نمایاں ہوتی ہے۔ مگر ہنوز پورے طور پر چمکتی نہیں۔ اور وجود روحانی کے درجہ ششم میں بوجہ کامل ہونے پیدائش اور روح کے داخل ہوجانے کے یہ خوبصورتی اپنی تمام آب و تاب دکھلا دیتی ہے۔ اور یاد رہے کہ مرتبہ ششم وجود روحانی میں روح سے مراد وہ محبت ذاتیہ الٰہیہ ہے۔ جو انسان کی محبت ذاتیہ پر ایک شعلہ کی طرح پڑتی ہے۔ اور تمام اندرونی تاریکی دُور کرتی اور روحانی زندگی بخشتی ہے۔ اور اس کے لوازم میں سے روح القدس کی تائید بھی کامل طور پر ہے ۔

دوسرا حُسن انسان کی پیدائش میں حُسن بشرہ ہے۔ اور یہ دونوں حسن اگرچہ روحانی اور جسمانی پیدائش کے درجہ میں نمودار ہو جاتے ہیں لیکن آب و تاب ان کی فیضان روح کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ جسمانی وجود کی روح جسمانی قالب تیار ہونے کے بعد جسم میں داخل ہوتی ہے۔ ایسا ہی روحانی وجود کی روح روحانی قالب تیار ہونے کے بعد انسان کے روحانی وجود میں داخل ہوتی ہے یعنی اُسوقت جبکہ انسان شریعت کا تمام جُوا اپنی گردن پر لے لیتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ تمام حُدود الٰہیہ کے قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور ورزش شریعت اور بجاآوری احکام کتاب اللہ سے اس لائق ہو جاتا ہے۔ کہ خدا کی روحانیت اس کی طرف توجہ فرماوے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبت ذاتیہ سے اپنے تئیں خدا تعالےٰ کی محبت ذاتیہ کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے۔ جو برف کیطرح سفید اور شہد کی طرح شیریں ہو اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ وجود روحانی خشوع کی حالت سے شروع ہوتا ہے اور روحانی نشوونما کے چھٹے مرتبہ پر یعنے اس مرتبہ پر جبکہ روحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبت ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دل پر ایک روح کی طرح پڑتا ہے۔ اور دائمی حضور کی حالت اس کو بخش دیتا ہے۔ کمال کو پہنچتا ہے۔ اور تبھی روحانی حسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے لیکن یہ حُسن جو روحانی حُسن ہے۔ جسکو حسن معاملہ کے ساتھ موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ وہ حُسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حُسن بشرہ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ حُسن بشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا۔ جو جلد زوال پذیر ہو جائیگا۔ اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی لیکن وہ روحانی حُسن جسکو حُسن معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے۔ کہ ایک دنیا کو اپنے اندر کھینچ لیتا ہے۔ اور زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اس کی طرف کھچا جاتا ہے۔ اور قبولیت دعا کی بھی درحقیقت فلاسفی یہی ہے۔ کہ جب ایسا روحانی حسن والا انسان جس میں محبت الٰہیہ کی رُوح داخل ہو جاتی ہے۔ جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر کے لئے دعا کرتا ہے۔ اور اس امر پر پورا پورا زور دیتا ہے۔ تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حسن روحانی رکھتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے امر اور اذن سے اس عالم کا ذرہ ذرہ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ جو اس کی کامیابی

کیلئے کافی ہوں۔ تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دنیا کے ہر ایک ذرّے کو طبعاً ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے۔ اور اس کی دعائیں ان تمام ذرات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علم طبعی اور فلسفہ میں نہیں۔ اس کشش کی باعث ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے جب سے کہ صانع مطلق نے عالم اجسام کو ذرات سے ترکیب دی ہے۔ ہر ایک ذرے میں وہ کشش رکھی ہے۔ اور ہر ایک ذرہ روحانی حُسن کا عاشق صادق ہے۔ اور ایسا ہی ہر ایک سعید روح بھی۔ کیونکہ وہ حُسن تجلی گاہ حق ہے۔ وہی حُسن تھا جس کے لئے فرمایا گیا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں۔ جو اس حُسن کو شناخت نہیں کرتے۔ مگر وہ حُسن بڑے بڑے کام دکھلاتا رہا ہے ؎

نوحؑ میں وہی حُسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزت جلشانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد موسےٰ بھی وہی حُسن روحانی لیکر آیا۔ جس نے چند روز تکلیفیں اُٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سید الانبیاء خیر الوریٰ مولانا و سیدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عظیم الشان روحانی حُسن لیکر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کریمہ کافی ہے۔ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی یعنی وہ نبی جناب الٰہی سے بہت نزدیک چلا گیا۔ اور پھر مخلوق کی طرف جھکا اور اس طرح پر دونوں حقوں کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے۔ ادا کر دیا۔ اور دونوں قسم کا حُسن روحانی ظاہر کیا۔ دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہو گیا۔ یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اس طرح اس کا وجود واقع ہو جیسے یہ



اس حسن کو ناپاک طبع اور اندھے لوگوں نے نہ دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں۔ مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے

اس جگہ بعض جاہل کہتے ہیں کہ کیوں کامل لوگوں کی بعض دعائیں منظور نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انکی تجلی حُسن کو خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے پس جس

جگہ یہ تجلی عظیم ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور کسی معاملہ میں ان کا حسن جوش میں آتا ہے۔ اور اپنی چمک دکھلاتا ہے۔ تب اس چمک کی طرف ذرات عالم کھنچے جاتے ہیں۔ اور غیر ممکن باتیں وقوع میں آجاتی ہیں۔ جن کو دوسرے لفظوں میں معجزہ کہتے ہیں۔ مگر یہ جوش روحانی ہمیشہ اور ہر جگہ ظہور میں نہیں آتا۔ اور تحریکات طلرجیہ کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے۔ اس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھدی ہے۔ سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں۔ اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ ان کے رحم کے لئے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت ان کی جوش نہیں کرتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مگر اسکی تحریک ان کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ گو وہ بارہا چاہتے بھی ہیں۔ کہ وہ قوت ظہور میں آوے مگر بجز ارادہ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور سست اعتقاد لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے۔ اور ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح ان کو سمجھتے ہیں۔ اور وہ بے نیازی انکی ایک ایسی شان رکھتی ہے۔ جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت برقع میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔ اور اسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان ان پر بدظنی کرے۔ تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش سے اس بدظنی کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ کیونکہ تخلق باخلاق اللہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے۔ کہ کوئی معجزہ ان سے ظاہر ہو۔ تو ان کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایک امر کے حصول کے لئے سخت کرب اور قلق ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تب وہ بے نیازی کا برقع اپنے منہ پر سے اتار لیتے ہیں۔ اور وہ حسن ان کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرہ ذرہ پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور ان کا منہ پر سے برقع اٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اس روحانی حسن کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ خدا کے محبوب ہو گئے ہیں۔ اس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں۔ اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی ان میں حالت پیدا ہو جاتی

جو خدا تعالےٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور ساتھ ہی ذرہ ذرہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے۔ اور عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا دیتی ہے۔ اور انکی دردیں جو رعد کی خاصیت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاء اعلےٰ میں ڈال دیتی ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جنسے رحمتِ الٰہی کا وہ مینہ برستا ہے۔ جسکی وہ خواہش کرتے ہیں۔ انکی روحانیت جب اپنے پورے سوز و گداز کے ساتھ کسی عقدہ کشائی کی توجہ کرتی ہے۔ تو وہ خدا تعالیٰ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ بباعث اس کے جو خدا سے ذاتی محبت رکھتے ہیں۔ محبوبانِ الٰہی میں داخل ہوتے ہیں۔ تب ہر ایک چیز جو خدا تعالیٰ کے زیر حکم ہے۔ ان کی مدد کیلئے[1] جوش مارتی ہے اور رحمتِ الٰہی محض انکی مراد پوری کرنے کے لئے ایک خلق جدید کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور وہ امور ظاہر ہوتے ہیں۔ جو اہل دنیا کی نظر میں غیر ممکن معلوم ہوتے ہیں۔ اور جن سے سفلی علوم محض ناآشنا ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا تو نہیں کہہ سکتے۔ مگر قرب اور علاقہ محبت ان کا کچھ ایسا صدق اور صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ گویا خدا ان میں اتر آتا ہے اور آدم کی طرح خدائی روح ان میں پھونکی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں کہ وہ خدا ہیں۔ لیکن درمیان میں کچھ ایسا تعلق ہے۔ جیسا کہ لوہے کو جب کہ سخت طور پر آگ سے افروختہ ہو جائے اور آگ کا رنگ اس میں پیدا ہو جائے۔ آگ سے تعلق ہوتا ہے۔ اس صورت میں تمام چیزیں جو خدا تعالےٰ کے زیر حکم ہیں۔ ان کے زیر حکم ہو جاتی ہیں۔ اور آسمان کے ستارے اور سورج اور چاند سے لیکر زمین کے سمندروں اور ہوا اور آگ تک ان کی آواز کو سنتے اور ان کو شناخت کرتے اور انکی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور ہر ایک چیز طبعاً ان سے پیار کرتی ہے۔ اور عاشق صادق کیطرح ان کی طرف کھنچی جاتی ہے۔ بجز شریر انسانوں کے جو شیطانوں کا اوتار ہیں ؎

---

[1] کافر اور دشمن بھی ایک قسم کی ان کی مدد کرتے ہیں۔ کہ ایذا اور ظلم کے ساتھ انکے دل کو دکھ دیتے اور انکی روحانیت کو جوش میں لاتے ہیں ؎ تا دل مرد خدا نامد بدرد ؛ ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد۔ منہ۔

عشق مجازی تو ایک منحوس عشق ہے۔ کہ ایک طرف پیدا ہوتا اور ایک طرف مرجاتا ہے۔ اور نیز اسکی بنار اس حسن پر ہے جو قابل زوال ہے۔ اور نیز اس حسن کے اثر کے نیچے آنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہ حسن روحانی جو حسن معاملہ اور صدق وصفا اور محبت الٰہیہ کی تجلّی کے بعد انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ایک عالمگیر کشش پائی جاتی ہے۔ وہ مستعد دلوں کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ کہ جیسے شہد چیونٹیوں کو اور نہ صرف انسان بلکہ عالم کا ذرہ ذرہ اس کی کشش سے متاثر ہوتا ہے۔ صادق المحبت انسان جو سچی محبت خدا تعالےٰ سے رکھتا ہے۔ وہ وہ یوسف ہے جس کے لئے ذرہ ذرہ اس عالم کا زلیخا صفت ہے۔ اور ابھی حسن اس کا اس عالم میں ظاہر نہیں کیونکہ یہ عالم اس کی برداشت نہیں کرتا۔ خدا تعالےٰ اپنی پاک کتاب میں جو فرقان مجید ہے فرماتا ہے :۔ کہ مومنوں کا نور ان کے چہروں پر دوڑتا ہے۔ اور مومن اس حُسن سے شناخت کیا جاتا ہے۔ جس کا نام دوسرے لفظوں میں نور ہے :۔

اور مجھے ایک دفعہ عالم کشف میں پنجابی زبان میں اسی علامت کے بارے میں یہ موزون فقرہ سنایا گیا "عشق الٰہی وسے منہ پر ولیاں ایہہ نشانی" مومن کا نور جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ وہی روحانی حسن وجمال ہے۔ جو مومن کو وجود روحانی کے مرتبہ ششم پر کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ جسمانی حسن کا ایک شخص یا دو شخص خریدار ہوتے ہیں۔ مگر یہ عجیب حسن ہے۔ جس کے خریدار کروڑہا روحیں ہو جاتی ہیں۔ اسی روحانی حُسن کی بنار پر بعض نے سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ[1] کی نعت میں یہ شعر کہے ہیں۔ اور ان کو نہایت درجہ حسین اور خوبصورت قرار دیا ہے۔ اور وہ اشعار یہ ہیں :۔

آں ترک عرب چوں مئی عشق طرب کرد ۔۔۔ غارت گرئے کوفہ و بغداد و حلب کرد
صد لالہ رُخے بود بصد حُسن شگفتہ ۔۔۔ نازاں ہمہ را زیر قدم کرد عجب کرد

---

[1] فطرتاً بعض طبائع کو بعض طبائع سے مناسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح میری روح اور سید عبد القادر رضی اللہ عنہ کی روح کو خمیر فطرت سے باہم ایک مناسبت ہے جس پر کشوف صحیحہ مریحہ سے مجھ کو

اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی اس بارہ میں ایک شعر کہا ہے۔ جو حسن روحانی پر بہت منطبق ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے ؎

صورت گر دیبائے چین رو صورت زیبائش بین
یا صورتے برکش چنین یا توبہ کن صورت گری

اب یہ بھی یاد رہے کہ بندہ تو حسن معاملہ دکھلا کر اپنے صدق سے بھری ہوئی محبت ظاہر کرتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اس کے مقابلہ پر حد ہی کر دیتا ہے۔ اس کی تیز رفتار کے مقابل پر برق کی طرح اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے اور زمین و آسمان کا دشمن بنجاتا ہے۔ اور اگر پچاس کروڑ انسان بھی اس کی مخالفت پر کھڑا ہو تو ان کو ایسا ذلیل اور بے دست و پا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرا ہوا کیڑا۔ اور محض ایک شخص کی خاطر کے لئے ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنی زمین و آسمان کو اس کے خادم بنا دیتا ہے۔ اور اس کی کلام میں برکت ڈالدیتا ہے اور اس کے تمام در و دیوار پر نور کی بارش کرتا ہے۔ اور اس کی پوشاک میں اور اس کی خوراک میں اور اس مٹی میں بھی جس پر اس کا قدم پڑتا ہے۔ ایک برکت رکھدیتا ہے۔ اور اس کو نامراد ہلاک

بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٠

اطلاع ملی ہے اس بات پر تیس برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے۔ کہ جب ایک رات مجھے خدا نے اطلاع دی کہ اسنے مجھے اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ تب یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اسی رات ایک بڑھیا کو خواب آئی کہ جسکی عمر قریباً اسی برس کی تھی۔ اور اسنے صبح مجکو آکر کہا۔ کہ میں نے رات سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا ہے اور ساتھ ان کے ایک اور بزرگ تھے۔ اور دونوں سبز پوش تھے۔ اور رات کے پچھلے حصہ کا وقت تھا۔ دوسرا بزرگ عمر میں ان سے کچھ چھوٹا تھا۔ پہلے انہوں نے ہماری جامع مسجد میں نماز پڑھی اور پھر مسجد کے باہر صحن میں نکل آئے۔ اور میں ان کے پاس کھڑی تھی۔ اتنے میں مشرق کی طرف سے ایک چمکتا ہوا ستارہ نکلا۔ تب اس ستارہ کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اور ستارے کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ السلام علیکم اور ایسا ہی ان کے رفیق نے السلام علیکم کہا۔ اور وہ ستارہ میں تھا۔

المومن یری ویریٰ لہ ۔ منہ

نہیں کرتا۔ اور ہر ایک اعتراض جو اس پر ہو اس کا آپ جواب دیتا ہے۔ وہ اس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کے کان ہو جاتا ہے۔ جن سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے۔ اور اس کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ اس کے دشمنوں کے مقابلہ پر آپ نکلتا ہے۔ اور شریروں پر جو اس کو دکھ دیتے ہیں آپ تلوار کھینچتا ہے۔ ہر میدان میں اس کو فتح دیتا ہے۔ اور اپنی قضاء و قدر کے پوشیدہ راز اس کو بتلاتا ہے۔ غرض پہلا خریدار اس کے روحانی حسن و جمال کا جو حسن معاملہ اور محبت ذاتیہ کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ خدا ہی ہے۔ پس کیا ہی بد قسمت وہ لوگ ہیں جو ایسا زمانہ پاویں اور ایسا سورج ان پر طلوع کرے۔ اور وہ تاریکی میں بیٹھے رہیں ۔

بعض نادان یہ اعتراض بار بار پیش کرتے ہیں کہ محبوبان الٰہی کی یہ علامت ہے کہ ہر ایک دعاء ان کی سنی جاتی ہے۔ اور جن میں یہ علامت نہیں پائی جاتی وہ محبوبان الٰہی میں سے نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ یہ لوگ منہ سے تو ایک بات نکال لیتے ہیں۔ مگر اعتراض کرنے کے وقت یہ نہیں سوچتے کہ ایسے جاہلانہ اعتراض خدا تعالےٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں پر وارد ہوتے ہیں مثلاً ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفار ان کے زمانہ کے جو انکی مخالفت پر کھڑے تھے۔ مسلمان ہو جائیں۔ مگر یہ مراد انکی پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کرکے یہ فرمایا۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا

؎ یاد رہے کہ مومن کے ساتھ خدا تعالےٰ دوستانہ معاملہ کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ کبھی تو وہ مومن کے ارادہ کو پورا کرے اور کبھی مومن اسکے ارادہ پر راضی ہو جائے۔ پس ایک جگہ تو مومن کو مخاطب کرکے فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کرونگا۔ اس جگہ تو مومن کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے اور دوسری جگہ اپنی خواہش مومن سے منوانا چاہتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ ولنبلونکم بشیءٍ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون افسوس کہ نادان آدمی صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے۔ اور دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتا۔ منہ

مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ کہ یہ لوگ کیوں نہیں ایمان لاتے ہو

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے ایمان لانے کے لئے اس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دعا کرتے تھے۔ کہ اندیشہ تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر لو۔ اس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا۔ کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپرواہیں۔ اور ان کے اغراض اور مقاصد اور ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اے نبی (علیہ السلام) جس قدر تو عقد ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی روح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کیلئے دعا کرتا ہے۔ تیری دعاؤں کے پُر تاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیت دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپرواہ اور گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دعا قبول نہ ہوگی۔ اور جہاں تک مجھے خدا تعالیٰ نے دعاؤں کے بارے میں علم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں ؛

دعا کرنے والا کامل درجہ پر متقی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا مقبول وہی بندہ ہوتا ہے جس کا شعار تقویٰ ہو۔ اور جسنے تقویٰ کی باریک راہوں کو مضبوط پکڑا ہو۔ اور جو امین اور متقی اور صادق العہد ہونے کی وجہ سے منظور نظر الٰہی ہو۔ اور محبت ذاتیہ الٰہیہ سے معمور اور پُر ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اسکی عقد ہمت اور توجہ اس قدر ہو کہ گویا ایک شخص کے زندہ کرنے کے لئے ہلاک ہو جائے۔ اور ایک شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے آپ گور میں داخل ہو اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقبول بندے اس سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جیساکہ ایک خوبصورت بچہ جو ایک ہی ہو اس کی ماں کو پیارا ہوتا ہے۔ پس جبکہ خدائے کریم و رحیم دیکھتا ہے کہ ایک مقبول محبوب اس کا ایک شخص کی جان بچانے کے لئے روحانی مشقتوں اور تضرعات اور مجاہدات کیوجہ سے اس حد تک پہنچ گیا ہے۔ کہ قریب ہے کہ اسکی جان نکل جائے تو اس کو علاقہ محبت کیوجہ سے ناگوار گذرتا ہے۔ کہ اسی حال میں اس کو ہلاک کر دے۔ تب اس کے

لئے اس دوسرے شخص کا گناہ بخشدیتا ہے۔ جس کے لئے وہ پڑ گیا تھا۔ پس اگر وہ کسی مہلک
بیماری میں مبتلا ہے۔ یا اور کسی بلا میں اسیر ولاچار ہے۔ تو اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا
کردیتا ہے۔ جس سے رہائی ہو جائے۔ اور بسا اوقات اس کا ارادہ ایک شخص کے قطعی طور پر
ہلاک کرنے یا برباد کرنے پر قرار یافتہ ہوتا ہے لیکن جب ایک مصیبت زدہ کی خوش قسمتی سے ایسا
شخص بہ پردرد تضرعات کے ساتھ درمیان میں آپڑتا ہے۔ جسکو حضرت عزت میں وجاہت ہے
تو وہ مسل مقدمہ جو سزا دینے کے لئے مکمل اور مرتب ہو چکی ہے۔ چاک کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ اب بات
پاس سے اغیار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیونکر ہو سکے کہ خدا اپنے سچے دوستوں کو عذاب دے

(۳) تیسری شرط استجابت دعا کے لئے ایک ایسی شرط ہے جو تمام شرطوں سے بالاتر ہے
کیونکہ اس کا پورا کرنا خدا کے مقبول بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس شخص کے ہاتھ میں ہے
جو دعا کرانا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت صدق اور کامل اعتقاد اور کامل یقین اور
کامل ارادت اور کامل غلامی کے ساتھ دعا کا خواہاں ہو۔ اور یہ دل میں فیصلہ کرے کہ اگر
دعا قبول نہ بھی ہو۔ تاہم اس کے اعتقاد اور ارادت میں فرق نہیں آئیگا۔ اور دعا کرانا
آزمائش کے طور پر نہ ہو۔ بلکہ سچے اعتقاد کے طور پر ہو۔ اور نہایت نیازمندی سے اس کے
دروازے پر گرے۔ اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے۔ مال سے خدمت سے ہر ایک طور
کی اطاعت سے ایسا قرب پیدا کرے کہ اس کے دل کے اندر داخل ہو جائے اور بایں ہمہ
نہایت درجہ پر نیک ظن ہو۔ اور اس کو نہایت درجہ کا متقی سمجھے۔ اور اس کی مقدس شان کے
برخلاف ایک خیال بھی دل میں لانا کفر خیال کرے۔ اور اس قسم کی طرح طرح کی جان نثاری
دکھلا کر سچے اعتقاد کو اس پر ثابت اور روشن کرے۔ اور اس کی مثل دنیا میں کسی کو بھی
نہ سمجھے۔ اور جان سے مال سے آبرو سے اس پر فدا ہو جائے۔ اور کوئی کلمہ کسر شان کا کسی
پہلو سے اس کی نسبت زبان پر نہ لائے۔ اور نہ دل میں۔ اور اس بات کو اس کی نظر میں بپایہ
ثبوت پہنچادے۔ کہ درحقیقت وہ ایسا ہی معتقد اور مرید ہے۔ اور بایں ہمہ صبر سے انتظار
کرے اور اگر پچاس دفعہ بھی اپنے کام میں نامراد رہے۔ پھر بھی اعتقاد اور یقین میں سست نہ
ہو۔ کیونکہ یہ قوم سخت نازک دل ہوتی ہے۔ اور ان کی فراست چہرہ کو دیکھ کر پہچان سکتی ہے

کہ یہ شخص کس درجہ کا اخلاص رکھتا ہے۔ اور یہ قوم باوجود نرم دل ہونے کے نہایت بے نیاز ہوتی ہے۔ ان کے دل خدا نے ایسے بے نیاز پیدا کئے ہیں۔ کہ متکبر اور خود غرض اور منافق طبع انسان کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اس قوم سے وہی لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو اس قدر غلامانہ اطاعت ان کی اختیار کرتے ہیں۔ کہ گویا مر ہی جاتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو قدم قدم پر بدظنی کرتا ہے۔ اور دل میں کوئی اعتراض رکھتا ہے۔ اور پوری محبت اور ارادت نہیں رکھتا تو وہ بجائے فائدہ کے ہلاک ہوتا ہے ۔

اب ہم اس تقریر کے بعد کہتے ہیں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مومن کے وجود روحانی کے مراتب ستہ بیان کرکے ان کے مقابل پر وجود جسمانی کے مراتب ستہ دکھلائے ہیں یہ ایک علمی معجزہ ہے۔ اور جس قدر کتابیں دنیا میں کتب سماوی کہلاتی ہیں یا جن حکیموں نے نفس اور الٰہیات کے بارے میں تحریریں کیں ہیں اور یا جن لوگوں نے صوفیوں کی طرز پر معارف کی باتیں لکھی ہیں۔ کسی کا ذہن ان میں سے اس بات کی طرف سبقت نہیں لے گیا۔ کہ یہ مقابلہ جسمانی اور روحانی وجود کا دکھلاتا۔ اگر کوئی شخص میرے اس دعوے سے منکر ہو اور اس کا گمان ہو کہ یہ مقابلہ روحانی اور جسمانی کسی اور نے بھی دکھلایا ہے۔ تو اس پر واجب ہے کہ اس علمی معجزہ کی نظیر کسی اور کتاب میں سے پیش کرکے دکھلاوے۔ اور میں نے تو توریت اور انجیل اور ہندوؤں کے وید کو بھی دیکھا ہے۔ مگر میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ اس قسم کا علمی معجزہ بجز قرآن شریف کے کسی کتاب میں نہ پایا۔ اور صرف اسی معجزہ پر حصر نہیں بلکہ تمام قرآن شریف ایسا ہی علمی معجزات سے پُر ہے۔ جن پر ایک عقلمند نظر ڈالکر سمجھ سکتا ہے۔ کہ یہ اُسی خدائے قادر مطلق کا کلام ہے۔ جس کی قدرتیں زمین و آسمان کی مصنوعات میں ظاہر ہیں۔ وہی خدا جو اپنی باتوں اور کاموں میں بےمثیل و مانند ہے۔ پھر جب ہم ایک طرف ایسے ایسے معجزات قرآن شریف میں پاتے ہیں۔ اور دوسری طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمیّت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس بات کو اپنے تصور میں لاتے ہیں۔ کہ آپ نے ایک حرف بھی کسی اُستاد سے نہیں پڑھا تھا۔ اور نہ آپ نے طبعی اور فلسفہ سے کچھ حاصل کیا تھا۔ بلکہ آپ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے۔ کہ جو سب

کی سب اُمی اور ناخواندہ تھی۔ اور ایک وحشیانہ زندگی رکھتی تھی۔ اور با ایں ہمہ آپ نے والدین کا زمانہ بھی نہیں پایا تھا۔ تو ان سب باتوں کو مجموعی نظر کے ساتھ دیکھنے سے قرآن شریف کی منجانب اللہ ہونے پر ایک ایسی چمکتی ہوئی بصیرت ہمیں ملتی ہے۔ اور اس کا علمی معجزہ ہونا ایسے یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بھر جاتا ہے۔ کہ گویا ہم اس کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرض جب بدیہی طور پر ثابت ہے۔ کہ سورۃ المومنون کی یہ تمام آیات جو ابتدائے سورۃ سے لیکر آیت فتبارک اللہ احسن الخالقین تک ہیں۔ علمی معجزہ ہیں۔ پس اسمیں کیا شک ہے۔ کہ آیۃ فتبارک اللہ احسن الخالقین علمی معجزہ کی ایک جزو ہے۔ اور بباعث معجزہ کے جزو ہونے کے معجزہ میں داخل ہے۔ اور یہی ثابت کرنا تھا۔

اور یاد رہے کہ یہ علمی معجزہ مذکورہ بالا ایک ایسی صاف اور کھلی کھلی اور روشن اور بدیہی سچائی ہے کہ اب خدا تعالیٰ کی رہبری اور یاد دہانی کے بعد عقل بھی اپنے معقولی علوم میں بہت فخر کے ساتھ اس کو داخل کرنے کے لئے تیار ہے ؛

کیونکہ عند العقل یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے پہلے جو ایک سعید الفطرت آدمی کے نفس کو خدا تعالیٰ کی طرف اس کی طلب میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے وہ خشوع اور انکسار ہے اور خشوع سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے فروتنی اور تواضع اور تضرع کی حالت اختیار کی جائے۔ اور جو اس کے مقابل پر اخلاق ردیہ ہیں جیسے تکبّر اور عُجب اور ریاء اور لاپرواہی اور بے نیازی ان سب کو خدا تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دیا جائے۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ جب تک انسان اپنے اخلاق ردیہ کو نہیں چھوڑتا اس وقت تک ان اخلاق کے مقابل پر جو اخلاق فاضلہ ہیں۔ جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ ان کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دو ضدیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اشارہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورۃ بقر کی ابتداء میں اس نے فرمایا ہے۔ ھدًی للمتقین یعنی قرآن شریف اُن لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ جو متقی ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو تکبر نہیں کرتے اور خشوع اور انکسار سے خدا تعالیٰ کی کلام میں غور کرتے ہیں وہی ہیں جو آخر کو ہدایت پاتے ہیں ؛

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ ان آیات میں چھ جگہ اَفْلَحَ کا لفظ ہے۔ پہلی آیت میں صریح طور پر جیسا کہ فرمایا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ اور بعض کی آیتوں میں عطف کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اَفْلَحَ کے لغت میں یہ معنے ہیں اُصِیْرَ اِلَی الْفَلَاحِ یعنے فوز مرام کی طرف پھیرا گیا۔ اور حرکت دیا گیا۔ پس ان معنوں کی رو سے مومن کا نماز میں خشوع اختیار کرنا فوز مرام کے لئے پہلی حرکت ہے۔ جس کے ساتھ تکبر اور عجب وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور اس میں فوز مرام یہ ہے کہ انسان کا نفس خشوع کی سیرت اختیار کر کے خدا تعالےٰ سے تعلق پکڑنے کے لئے مستعد اور تیار ہو جاتا ہے

دوسرا کام مومن کا یعنے وہ کام جس سے دوسرے مرتبہ تک قوت ایمانی پہنچتی ہے۔ اور پہلے کی نسبت ایمان کچھ قوی ہو جاتا ہے۔ عقل سلیم کے نزدیک یہ ہے۔ کہ مومن اپنے دل کو جو خشوع کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے لغو خیالات اور لغو شغلوں سے پاک کرے۔ کیونکہ جب تک مومن یہ ادنےٰ قوت حاصل نہ کرے کہ خدا کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو ترک کر سکے جو کچھ بھی مشکل نہیں۔ اور صرف گناہ بے لذت ہے اس وقت تک یہ طمع خام ہے کہ مومن ایسے کاموں سے دست بردار ہو سکے جن سے دست بردار ہونا نفس پر بہت بھاری ہے۔ اور جن کے ارتکاب میں نفس کو کوئی فائدہ یا لذت ہے پس اس سے ثابت ہے کہ پہلے درجہ کے بعد کہ ترک تکبر ہے۔ دوسرا درجہ ترک لغویات ہے اور اس درجہ پر وعدہ جو لفظ اَفْلَحَ سے کیا گیا ہے یعنے فوز مرام اس طرح پر پورا ہوتا ہے۔ کہ مومن کا تعلق جب لغو کاموں اور لغو شغلوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ تو ایک خفیف سا تعلق خدا تعالےٰ سے اس کو ہو جاتا ہے۔ اور قوت ایمانی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور خفیف تعلق اس لئے ہم نے کہا کہ لغویات سے تعلق بھی خفیف ہی ہوتا ہے پس خفیف تعلق چھوڑنے سے خفیف تعلق ہی ملتا ہے۔

پھر تیسرا کام مومن کا جس سے تیسرے درجہ تک قوت ایمانی پہنچ جاتی ہے عقل سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف لغو کاموں اور لغو باتوں کو ہی خدا تعالےٰ کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ اپنا عزیز مال بھی خدا تعالےٰ کے لئے چھوڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لغو کاموں کے چھوڑنے

کی نسبت مال کا چھوڑنا نفس پر زیادہ بھاری ہے۔ کیونکہ وہ محنت سے کمایا ہوا اور ایک کارآمد چیز ہوتی ہے۔ جس پر خوش زندگی اور آرام کا مدار ہے۔ اس لئے مال کا خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو کاموں کے چھوڑنے کے قوت ایمانی کو زیادہ چاہتا ہے۔ اور لفظ افلح کا جو آیات میں وعدہ ہے۔ اس کے اس جگہ یہ معنے ہوں گے۔ کہ دوسرے درجہ کی نسبت اس مرتبہ میں قوت ایمانی اور تعلق بھی خدا تعالےٰ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور نفس کی پاکیزگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اپنے ہاتھ سے اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کے خوف سے نکالنا بجز نفس کی پاکیزگی کے ممکن نہیں :۔

پھر چوتھا کام مومن کا جس سے چوتھے درجہ تک قوت ایمانی پہنچ جاتی ہے۔ عقل سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف مال کو خدا تعالےٰ کی راہ میں ترک نہیں کرتا۔ بلکہ وہ چیز جس سے وہ مال سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے یعنی شہوات نفسانیہ ان کا وہ حصّہ جو حرام کے طور پر ہے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان اپنی شہوات نفسانیہ کو طبعاً مال سے عزیز تر سمجھتا ہے۔ اور مال کو انکی راہ میں فدا کرتا ہے پس بلاشبہ مال کے چھوڑنے سے خدا کے لئے شہوات کو چھوڑنا بہت بھاری ہے۔ اور لفظ افلح جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کے اس جگہ یہ معنے ہیں کہ جیسے شہوات نفسانیہ سے انسان کو طبعاً شدید تعلق ہوتا ہے ایسا ہی ان کے چھوڑنے کے بعد وہی شدید تعلق خدا تعالےٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص کوئی چیز خدا تعالےٰ کی راہ میں کھوتا ہے۔ اس سے بہتر پا لیتا ہے ؎

لطف او ترک لباں لکند | کس بہ کار زش زیاں نکند
ہر کہ آں را جست یافتہ است | تافت آں رو کہ سر نتافتہ است

پھر پانچواں کام مومن کا جس سے پانچویں درجہ تک قوت ایمانی پہنچ جاتی ہے عندالعقل یہ ہے کہ صرف ترک شہوات نفس ہی نہ کرے۔ بلکہ خدا کی راہ میں خود نفس کو ہی ترک کر دے اور اس کے فدا کرنے پر تیار رہے۔ یعنے نفس جو خدا کی امانت [1] ہے اسی مالک کو واپس دے دے

[1] جیسا کہ نفس خدا تعالےٰ کی امانت ہے۔ ایسا ہی مال بھی خدا تعالےٰ کی امانت ہے۔ پس جو شخص

اور نفس سے صرف اس قدر تعلق رکھے جیسا کہ ایک امانت سے تعلق ہوتا ہے۔ اور دقائق تقویٰ ایسی طور پر پوری کرے کہ گویا اپنے نفس اور مال اور تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں وقف کر چکا ہے۔ اسی طرح یہ آیت اشارہ فرماتی ہے: وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ پس جبکہ انسان کے جان و مال اور تمام قسم کے آرام خدا کی امانت ہے جس کو واپس دینا امین ہونے کے لئے شرط ہے۔ لہٰذا ترک نفس وغیرہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ امانت خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے اس طور سے یہ قربانی ادا کر دے۔ اور دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے وقت اس کا عہد تھا۔ اور جو عہد اور امانتیں مخلوق کی اس کی گردن پر ہیں۔ ان سب کو ایسی طور سے تقویٰ کی رعایت سے بجا لاوے کہ وہ بھی ایک سچی قربانی ہو جاوے۔ کیونکہ دقائق تقویٰ کو انتہا تک پہنچانا یہ بھی ایک قسم کی موت ہے اور لفظ افلح کا جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اس کے اس جگہ یہ معنے ہیں کہ جب اس درجہ کا مومن خدا تعالیٰ کے راہ میں بذل نفس کرتا ہے۔ اور تمام دقائق تقویٰ بجا لاتا ہے۔ تب حضرت احدیت سے انوار الٰہیہ اس کے وجود پر محیط ہو کر روحانی خوبصورتی اس کو بخشتے ہیں۔ جیسے کہ گوشت ہڈیوں پر چڑھ کر ان کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ان دونوں حالتوں کا نام خدا تعالیٰ نے لباس ہی رکھا ہے تقویٰ کا نام بھی لباس ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لباس التقویٰ۔ اور جو گوشت ہڈیوں پر چڑھتا ہے۔ وہ بھی لباس ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا کیونکہ کسوت جس سے کسونا کا لفظ نکلا ہے۔ لباس کو ہی کہتے ہیں۔

اب یاد رہے کہ منتہا سلوک کا پنجم درجہ ہے۔ اور جب پنجم درجہ کی حالت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ تو اس کے بعد چھٹا درجہ ہے جو محض ایک موہبت کے طور پر ہے۔ اور جو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸۔ صرف اپنے مال میں سے زکوٰۃ دیتا ہے وہ مال کو اپنا مال سمجھتا ہے مگر جو شخص مال کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھتا ہے۔ وہ اپنے تمام مال کو خدا تعالیٰ کا مال جانتا ہے۔ اور ہر ایک وقت خدا کی راہ میں دیتا ہے۔ گو کوئی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ منہ۔

بغیر کسب اور کوشش کے مومن کو عطا ہوتا ہے۔ اور کسب کا اس میں ذرہ دخل نہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جیسے مومن خدا کے راہ میں اپنی روح کھوتا ہے۔ ایک روح اس کو عطا کی جاتی ھے۔ کیونکہ ابتدا سے یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی خدا تعالٰے کی راہ میں کچھ کھوئیگا۔ وہ اسے پائے گا اسلئے روح کو کھونے والے روح کو پاتے ہیں پس چونکہ مومن اپنی محبت ذاتیہ سے خدا کی راہ میں اپنی جان وقف کرتا ہے۔ اس لئے خدا کی محبت ذاتیہ کی روح کو پاتا ہے۔ جس کے ساتھ روح القدس شامل ہوتا ہے۔ خدا کی محبت ذاتیہ ایک روح ہے۔ اور روح کا کام مومن کے اندر کرتی ہے۔ اس لئے وہ خود روح ہے۔ اور روح القدس اس سے جدا نہیں۔ کیونکہ اس محبت اور روح القدس میں کبھی انفکاک ہو نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے ہم نے اکثر جگہ صرف محبت ذاتیہ الٰہیہ کا ذکر کیا ہے۔ اور روح القدس کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ ان کا باہم تلازم ہے اور جب روح کسی مومن پر نازل ہوتی ہے۔ تو تمام بوجھ عبادات کا اس کے سر پر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اس میں ایک ایسی قوت اور لذت آجاتی ہے۔ جو وہ قوت تکلف سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے یاد الٰہی اس سے کراتی ہے۔ اور عاشقانہ جوش اس کو بخشتی ہے پس ایسا مومن جبریل علیہ السلام کی طرح ہر وقت آستانہ الٰہی کے آگے حاضر رہتا ہے۔ اور حضرت عزت کی دائمی ہمسائیگی اس کے نصیب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالٰے اس درجہ کے بارے میں فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ یعنی مومن کامل وہ لوگ ہیں۔ کہ ایسا دائمی حضور ان کو میسر آتا ہے۔ کہ ہمیشہ وہ اپنی نماز کی آپ نگہبان رہتے ہیں۔ یہ اسبابات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس درجہ کا مومن اپنی روحانی بقا کے لئے نماز کو ایک ضروری چیز سمجھتا ہے۔ اور اس کو اپنی غذا قرار دیتا ہے۔ جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ درجہ بغیر اس روح کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو خدا تعالٰے کی طرف سے مومن پر نازل ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کہ مومن خدا تعالٰے کے لئے اپنی جان کو ترک کر دیتا ہے۔ تو ایک دوسری جان پانے کا مستحق ہوتا ہے ÷

اس تمام تقریر سے ثابت ہے کہ یہ مراتب ستہ عقل سلیم کے نزدیک اس مومن کی راہ میں پڑے ہیں۔ جو اپنے وجود روحانی کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ہر ایک انسان

تھوڑی سی غور کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ کہ ضرور مومن پر اس کے سلوک کے وقت چھ حالتیں آتی ہیں۔ وجہ یہ کہ جب تک انسان خدا تعالےٰ سے کامل تعلق نہیں پکڑتا۔ تب تک اس کا نفس ناقص پانچ خراب حالتوں سے پیار کرتا ہے۔ اور ہر ایک حالت کا پیار دور کرنے کے لئے ایک ایسے سبب کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ وہ اس پیار پر غالب آ جائے۔ اور نیا پیار پہلے پیار کا علاقہ توڑ دے۔

چنانچہ پہلی حالت جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ یہ ہے۔ کہ وہ ایک غفلت میں پڑا ہوتا ہے اور اس کو بالکل خدا تعالےٰ سے بُعد اور دوری ہوتی ہے۔ اور نفس ایک کفر کے رنگ میں ہوتا ہے اور غفلت کے پردے اور تکبر اور لاپرواہی اور سنگدلی کیطرف اس کو کھینچتے ہیں اور خشوع اور خضوع اور تواضع اور فروتنی اور انکساری کا نام و نشان اس میں نہیں ہوتا۔ اور اسی اپنی حالت سے وہ محبت کرتا ہے۔ اور اس کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے۔ اور پھر جب عنایت الٰہیہ اس کی اصلاح کیطرف توجہ کرتی ہے۔ تو کسی واقعہ کے پیدا ہونے سے یا کسی آفت کے نازل ہونے سے خدا تعالےٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا اس کے دل پر اثر پڑتا ہے۔ اور اس اثر سے اس پر ایک حالت خشوع پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اس کے تکبر اور گردن کشی اور غفلت کی عادت کو کالعدم کر دیتی ہے۔ اور اس سے علاقہ محبت توڑ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر وقت دنیا میں مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ جب ہیبت الٰہی کا تازیانہ کسی خوفناک لباس میں نازل ہوتا ہے۔ تو بڑے بڑے شریروں کی گردن جھکا دیتا ہے۔ اور خواب غفلت سے جگا کر خشوع اور خضوع کی حالت بنا دیتا ہے۔ یہ وہ پہلا مرتبہ رجوع الی اللہ کا ہے۔ جو عظمت اور ہیبت الٰہی کے مشاہدہ کے بعد یا کسی اور طور سے ایک سعید الفطرت کو حاصل ہو جاتا ہے اور گو وہ پہلے اپنی غافلانہ اور بے قید زندگی سے محبت ہی رکھتا تھا۔ مگر جب مخالف اثر اس سے پہلے اثر سے قوی تر پیدا ہوتا ہے۔ تو اس حالت کو بہر حال چھوڑنا پڑتا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسری حالت یہ ہے کہ ایسے مومن کو خدا تعالےٰ کی طرف کچھ رجوع تو ہو جاتا ہے۔ مگر اس رجوع کے ساتھ لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو شغلوں کی پلیدی لگی رہتی ہے۔ جس سے وہ انس اور محبت رکھتا ہے۔ ہاں کبھی نماز میں خشوع کی حالت بھی

اس سے ظہور میں آتے ہیں. لیکن دوسری طرف لغو حرکات بھی اس کے لازم حال رہتی ہیں اور لغو تعلقات اور لغو مجلسیں اور لغو ہنسی ٹھٹھا اس کے گلے کا ہار رہتا ہے. گو یا وہ دو رنگ رکھتا ہے. کبھی کچھ کبھی کچھ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

پھر جب عنایت الٰہیہ اسکو ضائع کرنا نہیں چاہتی. تو پھر ایک اور جلوہ عظمت اور ہیبت اور جبروت الٰہی کا اس کے دل پر نازل ہوتا ہے. جو پہلے جلوہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور قوت ایمانی اس سے تیز ہو جاتی ہے. اور ایک آگ کی طرح مومن کے دل پر پڑ کر تمام خیالات لغو اس کے ایک دم میں بھسم کر دیتی ہے. اور یہ جلوہ عظمت اور جبروت الٰہی کا اس قدر حضرت عزت کی محبت اس کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ لغو کاموں اور لغو شغلوں کی محبت پر غالب آ جاتا ہے. اور ان کو دفع اور دُور کر کے ان کی جگہ لے لیتا ہے. اور تمام بیہودہ شغلوں سے دل کو سرد کر دیتا ہے. تب لغو کاموں سے دل کو ایک کراہت پیدا ہو جاتی ہے.

پھر لغو شغلوں اور لغو کاموں کے دُور ہونے کے بعد ایک تیسری خراب حالت مومن میں باقی رہ جاتی ہے. جس سے وہ دوسری حالت کی نسبت بہت محبت رکھتا ہے یعنی طبعاً مال کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے. کیونکہ وہ اپنی زندگی اور آرام کا مدار مال ہی کو سمجھتا ہے اور نیز اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ صرف اپنی محنت اور مشقت خیال کرتا ہے. پس اس وجہ سے اُس پر خدا تعالےٰ کے راہ میں مال کا چھوڑنا بہت بھاری اور تلخ ہوتا ہے.

پھر جب عنایت الٰہیہ اس ورطۂ عظیمہ سے اس کو نکالنا چاہتی ہے. تو رازقیت الٰہیہ کا علم اس کو عطا کیا جاتا ہے. اور توکل کا بیج اس میں بویا جاتا ہے. اور ساتھ اس کے ہیبت الٰہیہ بھی کام کرتی ہے. اور دونوں تجلیات جمالی اور جلالی اس کے دل کو اپنے قابو میں لے آتی ہیں. تب مال کی محبت بھی دل میں سے بھاگ جاتی ہے. اور مال دینے والے کی محبت کا تخم دل میں بویا جاتا ہے. اور ایمان قوی کیا جاتا ہے. اور یہ قوت ایمانی درجہ سوم کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے. کیونکہ اس جگہ مومن لغو باتوں کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ اس مال

کو ترک کرتا ہے۔ جس پر اپنی معیشت زندگی کا سارا مدار سمجھتا ہے۔ اور اگر اس کے ایمان کو قوت توکل عطا نہ کی جاتی اور رازق حقیقی کیطرف آنکھ کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ بخل کی بیماری دُور ہو سکتی۔ پس یہ قوت ایمانی نہ صرف لغو کاموں سے چھوڑاتی ہے بلکہ خدا تعالےٰ کے رازق ہونے پر ایک قوی ایمان پیدا کر دیتی ہے۔ اور نور توکل دل میں ڈالدیتی ہے۔ تب مال جو ایک پارہ جگر سمجھا جاتا ہے۔ بہت آسانی اور شرح صدر سے مومن اس کو خدا تعالےٰ کی راہ میں دیتا ہے۔ اور وہ ضعف جو بخل کی حالت میں نومیدی سے پیدا ہوتا ہے۔ اب خدا تعالےٰ پر بہت سی امیدیں ہو کر وہ تمام ضعف جاتا رہتا ہے۔ اور مال دینے والے کی محبت مال کی محبت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر اس کے بعد چوتھی حالت ہے۔ جس سے نفس امارہ بہت ہی پیار کرتا ہے۔ اور جو تیسری حالت سے بدتر ہے۔ کیونکہ تیسری حالت میں تو صرف مال کا اپنے ہاتھ سے چھوڑنا ہی مگر چوتھی حالت میں نفس امارہ کی شہوات محرمہ کو چھوڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مال کا چھوڑنا بہ نسبت شہوات کے چھوڑ دینے کے انسان پر طبعاً سہل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حالت بہ نسبت حالات گذشتہ کے بہت شدید اور خطرناک ہے۔ اور فطرتاً انسان کو شہوات نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اس کے نزدیک مدار آسائش ہے۔ بڑی خوشی سے شہوات نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے۔ اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ یعنے یہ ایسا منہ زور جوش ہے۔ جو اس کا فرو ہونا کسی برہان قوی کا محتاج ہے ❊

پس ظاہر ہے کہ درجہ چہارم پر قوت ایمانی بہ نسبت درجہ سوم کے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے۔ اور خدا تعالےٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا مشاہدہ بھی پہلے کی نسبت اس میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی اس میں نہایت ضروری ہے کہ جس لذت ممنوعہ کو دُور کیا گیا ہے اس کے عوض میں روحانی طور پر کوئی لذت بھی حاصل ہو۔ اور جیسا کہ بخل کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالےٰ کی رازقیت پر قوی ایمان درکار ہے اور خالی

جیب ہونے کی حالت میں ایک قوی توکل کی ضرورت ہے۔ تا بخل بھی دُور ہو۔ اور غیبی فتوح پر امید بھی پیدا ہو جائے۔ ایسا ہی شہوات ناپاک نفسانیہ کے دُور کرنے کے لئے اور آتش شہوت سے مخلصی پانے کے لئے اس آگ کے وجود پر قوی ایمان ضروری ہے۔ جو جسم اور رُوح دونوں کو عذاب شدید میں ڈالتی ہے۔ اور نیز ساتھ اس کے اس روحانی لذت کی ضرورت بھی۔ جو ان کثیف لذتوں سے بے نیاز اور مستغنی کر دیتی ہے۔ جو شخص شہوات نفسانیہ محرمہ کے پنجے میں اسیر ہے۔ وہ ایک اژدہا کے منہ میں ہے۔ جو نہایت خطرناک زہر رکھتا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ لغو حرکات کی بیماری سے بخل کی بیماری بڑھ کر ہے۔ اسی طرح بخل کی بیماری کے مقابل پر شہوات نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہونا سب بلاؤں سے زیادہ بلا ہے جو خدا تعالےٰ کے ایک خاص رحم کی محتاج ہے۔ اور جب خدا تعالےٰ کسی کو اس بلا سے نجات دینا چاہتا ہے۔ تو اپنی عظمت اور ہیبت اور جبروت کی ایسی تجلی اس پر کرتا ہے۔ جس سے شہوات نفسانیہ محرمہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جمالی رنگ میں اپنی لطیف محبت کا ذوق اس کے دل میں ڈالتا ہے۔ اور جس طرح شیر خوار بچہ دودھ چھوڑنے کے بعد صرف ایک رات تلخی میں گذارتا ہے۔ بعد اس کے اس دودھ کو ایسا فراموش کر دیتا ہے۔ کہ چھاتیوں کے سامنے بھی اگر اس کے منہ کو رکھا جائے۔ تب بھی دودھ پینے سے نفرت کرتا ہے۔ یہی نفرت شہوات محرمہ نفسانیہ سے اس راست باز کو ہو جاتی ہے۔ جسکو نفسانی دودھ چھڑا کر ایک روحانی غذا اس کے عوض میں دی جاتی ہے ٭

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے۔ جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محنت نفس امارہ کو ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے۔ کہ حضرت عزت جلشانہ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کرلیں۔ اور اس پر اپنا پورا تصرف اور دخل کرلیں۔ اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم برہم کردیں۔ اور نفسانی قوٰے کے قریہ کو ویران کردیں۔ اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلا دیں۔ اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا

اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ۔ اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اس کے تمام مراتب سلوک ختم ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے۔ انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور انسانی کوششیں اپنے اخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں۔ پھر بعد اس کے موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے۔ اور یہ پانچویں حالت چوتھی حالت سے مشکل تر ہے کیونکہ چوتھی حالت میں تو صرف مومن کا کام یہ ہے کہ شہوات محرمہ نفسانیہ کو ترک کرے۔ مگر پانچویں حالت کے مومن کا کام یہ ہے۔ کہ نفس کو بھی ترک کرے۔ اور اس کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر خدا تعالےٰ کی طرف واپس کرے۔ اور خدا کے کاموں میں اپنے نفس کو وقف کر کے اس سے خدمت لے اور خدا کی راہ میں بذل نفس کرنے کا ارادہ رکھے اور اپنے نفس کی نفی وجود کے لئے کوشش کرے کیونکہ جب تک نفس کا وجود باقی ہے۔ گناہ کرنے کے لئے جذبات بھی باقی ہیں۔ جو تقوٰی کے برخلاف ہیں۔ اور نیز جب تک وجود نفس باقی ہے۔ ممکن نہیں کہ انسان تقوٰی کی باریک راہوں پر قدم مار سکے۔ یا پورے طور پر خدا کی امانتوں اور عہدوں یا مخلوق کی امانتوں اور عہدوں کو ادا کر سکے۔ لیکن جیسا کہ بخل بغیر توکل اور خدا کی رازقیت پر ایمان لانے کے ترک نہیں ہو سکتا۔ اور شہوات نفسانیہ محرمہ بغیر استیلاء ہیبت اور عظمت الٰہی اور لذات روحانیہ کے چھوٹ نہیں سکتیں۔ ایسا ہی یہ مرتبہ عظمیٰ کہ ترک نفس کر کے تمام امانتیں خدا تعالیٰ کی اس کو واپس دی جائیں۔ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ایک تیز آندھی عشق الٰہی کی چلکر کسی کو اس کی راہ میں دیوانہ نہ بنا دے۔ یہ تو در حقیقت عشق الٰہی کے مستوں اور دیوانوں کے کام ہیں۔ دنیا کے عقلمندوں کے کام نہیں ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اسی کیطرف اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیے۔ تمام زمین اور

آسمان کی مخلوق پر پیش کیا۔ پس سب نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اُٹھا لیا۔ کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محل مدح میں ہیں نہ محل مذمت میں اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر سختی اور ظلم کر سکتا تھا۔ اور ایسا خدا تعالے کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے۔ اس لئے اس نے منظور کیا۔ کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے۔ اور پھر خدا کے راہ میں خرچ کرے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے لئے یہ جو اللہ تعالے نے فرمایا ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت رکھتے ہیں یعنی ادائے امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں کوئی دقیقہ تقوٰی اور احتیاط کا باقی نہیں چھوڑتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس اور اس کے تمام قوی اور آنکھ کی بینائی اور کانوں کی شنوائی اور زبان کی گویائی اور ہاتھوں پیروں کی قوت یہ سب خدا تعالے کی امانتیں ہیں۔ جو اس نے دی ہیں۔ اور جس وقت وہ چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے سکتا ہے۔ پس ان تمام امانتوں کا رعایت رکھنا یہ ہے کہ باریک در باریک تقوٰی کی پابندی سے خدا تعالے کی خدمت میں نفس اور اس کے تمام قویٰ اور جسم اور اس کے تمام قویٰ اور جوارح کو لگایا جائے۔ اس طرح پر کہ گویا یہ تمام چیزیں اس کی نہیں۔ بلکہ خدا کی ہو جائیں۔ اور اس کی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی کے موافق ان تمام قویٰ اور اعضاء کا حرکت اور سکون ہو۔ اور اس کا ارادہ کچھ بھی نہ رہے۔ بلکہ خدا کا ارادہ ان میں کام کرے اور خدا تعالے کے ہاتھ میں اس کا نفس ایسا ہو۔ جیسا کہ مردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ خود رائی سے بیدخل ہو۔ اور خدا تعالے کا پورا تصرف اس کے وجود پر ہو جائے۔ یہاں تک کہ اسی سے دیکھے اور اسی سے سُنے۔ اور اسی سے بولے اور اسی سے حرکت یا سکون کرے۔ اور نفس کی دقیق در دقیق آلائشیں جو کسی خوردبین سے نظر نہیں آسکتیں دُور ہو کر فقط روح رہ جائے۔ غرض ہیمنت خدا کی اس پر احاطہ کرلے۔ اور اپنے وجود سے اس کو کھو دے

اور اس کی حکومت اپنے وجود پر کچھ نہ رہے۔ اور سب حکومت خدا کی ہو جائے۔ اور نفسانی جوش سب مفقود ہو جائیں۔ اور الوہیت کے ارادے اس کے وجود میں جوش زن ہو جائیں۔ پہلی حکومت بالکل اُٹھ جائے اور دوسری حکومت دل میں قائم ہو۔ اور نفسانیت کا گھر ویران ہو۔ اور اس جگہ پر حضرت عزت کے خیمے لگائے جائیں۔ اور ہیبت اور جبروت الٰہی تمام ان پودوں کو جن کی آبپاشی گندے چشمہ نفس سے ہوتی تھی۔ اس پلید جگہ سے اُکھیڑ کر رضا جوئی حضرت عزت کی پاک زمین میں لگائے جائیں اور تمام آرزوئیں اور تمام ارادے اور تمام خواہشیں خدا میں ہو جائیں۔ اور نفس امارہ کی تمام عمارتیں منہدم کر کے خاک میں ملا دی جائیں۔ اور ایک ایسا پاک محل تقدس اور تطہیر کا دل میں تیار کیا جاوے جس میں حضرت عزت نازل ہو سکے اور اس کی روح اس میں آباد ہو سکے اس قدر تکمیل کے بعد کہا جائیگا کہ وہ امانتیں جو منعم حقیقی نے انسان کو دی تھیں وہ واپس کی گئیں۔ تب ایسے شخص پر یہ آیت صادق آئے گی۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ اس درجہ پر صرف ایک قالب تیار ہوتا ہے۔ اور تجلی الٰہی کی رُوح جس سے مراد محبت ذاتیہ حضرت عزت ہے۔ بعد اس کے معہ روح القدس ایسے مومن کے اندر داخل ہوتی اور نئی حیات اس کو بخشتی ہے۔ اور ایک نئی قوت اس کو عطا کی جاتی ہے۔ اور اگرچہ یہ سب کچھ روح کے اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن ہنوز روح مومن سے صرف ایک تعلق رکھتی ہے۔ اور ابھی مومن کے دل کے اندر آباد نہیں ہوتی ۞

پھر بعد اس کے وجود روحانی کا مرتبہ ششم ہے یہ وہی مرتبہ ہے کہ جس میں مومن کی محبت ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جلشانہٗ کی محبت ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب خدا تعالٰے کی وہ محبت ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے۔ اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے۔ جیسے ایک قالب بے جان میں روح داخل ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر درحقیقت ایک روح کا کام کرتی ہے۔ تمام قوی

میں اس سے ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اور روح القدس کی تائید ایسے مومن کے شامل حال ہوتی ہے۔ کہ وہ باتیں اور وہ علوم جو انسانی طاقت سے برتر ہیں۔ وہ اس درجہ کے مومن پر کھولے جاتے ہیں۔ اور اس درجہ کا مومن ایمانی ترقیات کے تمام مراتب طے کر کے ان ظلی کمالات کیوجہ سے جو حضرت عزت کے کمالات سے اس کو ملتے ہیں آسمان پر خلیفۃ اللہ کا لقب پاتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ایک شخص جب آئینہ کے مقابل پر کھڑا ہوتا ہے۔ تو تمام نقوش اس کے منہہ کے نہایت صفائی سے آئینہ میں منعکس ہوجاتے ہیں۔ ایسا ہی اس درجہ کا مومن جو نہ صرف ترک نفس کرتا ہے۔ بلکہ نفی وجود، اور ترک نفس کے کام کو اس درجہ کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ کہ اس کے وجود میں سے کچھ بھی نہیں رہتا۔ اور صرف آئینہ کے رنگ میں ہوجاتا ہے۔ تب ذات الٰہی کے تمام نقوش اور تمام اخلاق اس میں مندرج ہوجاتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ آئینہ جو ایک سامنے کھڑے ہونے والے منہ کے تمام نقوش اپنے اندر لیکر اس منہ کا خلیفہ ہوجاتا ہے۔ اور جیسا کہ خدا غیب الغیب ہے۔ اور اپنی ذات میں وراء الوراء ہے ایسا ہی یہ مومن کامل اپنی ذات میں غیب الغیب اور وراء الوراء ہوتا ہے۔ دنیا اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کے دائرہ سے بہت ہی دُور چلا جاتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ خدا جو غیر متبدل اور حیّ و قیوم ہے۔ وہ مومن کامل کی اس پاک تبدیلی کے بعد جبکہ مومن خدا کے لئے اپنا وجود بالکل کھو دیتا ہے۔ اور ایک نیا چولہ پاک تبدیلی کا پہن کر اس میں سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تب خدا بھی اس کے لئے اپنی ذات میں ایک تبدیلی کرتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہ خدا کی ازلی ابدی صفات میں کوئی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ قدیم سے اور ازل سے غیر متبدّل ہے۔ لیکن مومن کامل کے لئے جلوہ قدرت ہوتا ہے۔ اور ایک تبدیلی جس کی ہم کنہ نہیں سمجھ سکتے۔ مومن کی تبدیلی کیساتھ خدا میں بھی ظہور میں آجاتی ہے۔ مگر اس طرح پر کہ اس کی غیر متبدّل ذات پر کوئی گرد و غبار حدوث کا نہیں بیٹھتا۔ وہ اسی طرح غیر متبدّل ہوتا ہے۔ جس طرح وہ قدیم سے ہے لیکن یہ تبدیلی جو مومن کی تبدیلی کے وقت ہوتی ہے۔ یہ اس قسم کی ہے۔ جیسا کہ لکھا ہے۔ کہ

جب مومن خدا تعالیٰ کیطرف حرکت کرتا ہے۔ تو خدا اس کی نسبت تیز حرکت کے ساتھ اس کی طرف آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ تبدیلیوں سے پاک ہے۔ ایسا ہی وہ حرکتوں سے بھی پاک ہے لیکن یہ تمام الفاظ استعارہ کے رنگ میں بولے جاتے ہیں اور بولنے کی اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جیسے ایک مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں نیستی اور فنا اور استہلاک کرکے اپنے تئیں ایک نیا وجود بناتا ہے اس کی ان تبدیلیوں کے مقابل پر خدا بھی اس کے لئے ایک نیا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وہ معاملات کرتا ہے۔ جو دوسرے کے ساتھ کبھی نہیں کرتا۔ اور اس کو اپنے ملکوت اور اسرار کا وہ سیر کراتا ہے جو دوسرے کو ہرگز نہیں دکھلاتا۔ اور اس کے لئے وہ کام اپنے ظاہر کرتا ہے۔ جو دوسروں کے لئے ایسے کام کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اور اس قدر اس کی نصرت اور مدد کرتا ہے۔ کہ لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ اس کے لئے خوارق دکھلاتا ہے اور معجزات ظاہر کرتا اور ہر ایک پہلو سے اس کو غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کی ذات میں ایک قوت کشش رکھ دیتا ہے۔ جس سے ایک جہان اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے اور وہی باقی رہ جاتے ہیں۔ جن پر شقاوت ازلی غالب ہو۔

پس ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ مومن کامل کی پاک تبدیلی کے ساتھ خدا تعالیٰ بھی ایک نئی صورت کی تجلی سے اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے انسان کو اپنے لئے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا شروع کرے تو اسی دن سے بلکہ اسی گھڑی سے بلکہ اسی دم سے خدا تعالیٰ کا رجوع اس کی طرف شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس کا متولی اور متکفل اور حامی اور ناصر بن جاتا ہے اور اگر ایک طرف تمام دنیا ہو۔ اور ایک طرف مومن کامل تو غلبہ اسی کو ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنی محبت میں صادق ہے۔ اور اپنے وعدوں میں پورا۔ وہ اس کو جو درحقیقت اس کا ہو جاتا ہے۔ ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ ایسا مومن آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اور گلزار میں سے نکلتا ہے۔ وہ ایک گرداب میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اور ایک خوشنما باغ میں سے نمودار ہو جاتا ہے۔ دشمن اس کے لئے بہت منصوبے کرتے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے

ہیں لیکن خدا ان کے تمام مکردں اور منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے آخر اس کے ذلت چاہنے والے ذلت کی مار سے مرتے ہیں۔ اور نامرادی ان کا انجام ہوتا ہے لیکن وہ جو اپنے تمام دل اور تمام جان اور تمام ہمت کے ساتھ خدا کا ہو گیا ہے وہ نامراد ہرگز نہیں مرتا اور اس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے۔ اور ضرور ہے کہ وہ جیتا رہے۔ جب تک اپنے کاموں کو پورا کرے۔ تمام برکتیں اخلاص میں ہیں۔ اور تمام اخلاص خدا کی رضاجوئی میں۔ اور تمام خدا کی رضاجوئی اپنی رضا کے چھوڑنے میں۔ یہی موت ہے۔ جس کے بعد زندگی ہے۔ مبارک وہ جو اس زندگی میں سے حصہ لے۔

اب واضح ہو کہ جہاں تک ہم نے سورۃ المومنون کی آیات ممدوحہ بالا کے معجزہ ہونے کی نسبت لکھنا تھا۔ وہ سب ہم لکھ چکے۔ اور بخوبی ثابت کر چکے کہ سورہ موصوف کی ابتدا میں مومن کے وجود روحانی کے چھ مراتب قرار دئے ہیں۔ اور مرتبہ ششم خلق آخر کا کہا ہے۔ یہی مراتب ستہ سورۃ موصوفہ بالا میں جسمانی پیدائش کے بارہ میں بعد ذکر پیدائش روحانی بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور یہ ایک علمی اعجاز ہے۔ اور یہ ایک علمی نکتہ قرآن شریف سے پہلے کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ پس ان آیات کا آخری حصہ یعنے فتبارک اللہ احسن الخالقین بلاشبہ ایک علمی معجزہ کی جڑ ہے۔ کیونکہ وہ ایک اعجازی موقعہ پر چسپاں کیا گیا ہے۔ اور انسان کیلئے یہ بات ممکن نہیں۔ کہ اپنے بیان میں ایسی اعجازی صورت پیدا کرے۔ اور پھر اس پر آیت فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ چسپان کرے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اس پر کیا دلیل ہے۔ کہ آیات مذکورہ بالا میں جو مقابلہ انسان کے مراتب پیدائش روحانی اور پیدائش جسمانی میں دکھلایا گیا ہے۔ وہ علمی معجزہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان اس کے مثل بنانے پر قادر نہ ہو سکے۔ یا گذشتہ زمانہ میں قادر نہ ہو سکا۔ اور نہ بعد میں قادر ہونے کا ثبوت ہو۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ یہ بیان انسانی پیدائش کی دقیق فلاسفی کا جو قرآن شریف میں مندرج ہے۔ یہ ایک ایسا بےمثل و مانند بیان ہے کہ اس کی نظیر پہلے اس سے کسی کتاب میں

نہیں پائی جاتی۔ نہ اس زمانہ میں ہم نے سُنا کہ کسی ایسے شخص کو جو قرآن شریف کا علم نہیں رکھتا اس فلاسفی کے بیان کرنے میں قرآن شریف سے توارد ہوا ہو۔ اور جبکہ قرآن شریف اپنی جمیع معارف اور نشانوں اور فصاحت بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے اور یہ آیات قرآن شریف کا ایک حصّہ ہے۔ جو دعویٰ اعجاز میں داخل ہے پس اس کا بےمثل و مانند ثابت ہونا باوجود دعویٰ اعجاز اور طلب مقابلہ کے بلاشبہ معجزہ ہے۔ براہین احمدیہ حصّہ پنجم

" ہر ایک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آکر اور بالکل رو بخدا ہو کر راہ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں فنا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ امور مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے۔ یکدفعہ ترک کرنا اور ہر ایک ننگ و ناموس اور عجب اور ریا سے منہہ پھیر کر اور تمام ماسوی اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رُخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے۔ جو موت کے برابر ہے۔ اور یہ موت روحانی پیدائش کا مدار ہے۔ اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا۔ تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ اسی طرح روحانی پیدائش کا جسم اس فنا سے تیار ہوتا ہے۔ جوں جوں بندے کا نفس شکست پکڑتا ہے۔ اور اس کا فعل اور ارادت اور رو بخلق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے۔ توں توں پیدائش روحانی کے اجزا بنتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب فنا اتم حاصل ہو جاتی ہے۔ تو وہ وجود ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے۔ اور ثُمَّ اَنْشَاْنَا خَلْقًا اٰخَرَ کا وقت آجاتا ہے۔ اور چونکہ یہ فنا اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادرِ مطلق کے ممکن نہیں۔ اس لئے یہ دعا تعلیم کی یعنے اهدنا الصراط المستقیم۔ براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۹

" پس تو دیکھ کہ جب انسان پیدائش کے مراتب میں پھرا گیا۔ اور حیز فعل سے قوت کی طرف لایا گیا۔ اور طبعی جلوہ گاہوں میں قسم قسم کی صورتیں دیا گیا۔ اور بعض قسم پیدائش

بعض کے پیچھے آئیں۔ اور ان میں باہم تفرقہ اور تمیز ہوا پس اس جگہ کئی مدارج پیدا ہوئے جو اپنے نئے ناموں کو چاہتے تھے۔ پس عربی نے ان کو ان کے نام عطا کئے۔ اور اپنے عطیہ کو کامل کیا۔ جیسے سخی اور مالدار لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ جب خدا تعالےٰ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا۔ تو اس کو اس مٹی سے پیدا کیا۔ جو زمین کی تمام قویٰ کا عطر تھا۔ اور میلوں سے پاک تھا۔ اس کا نام خطاب اور کتاب میں آدم رکھا اس لئے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ اور سارے جہان کی خوبیاں اس میں بھر دیں۔ اور نیز اس کی طینت میں دو انس رکھدئے ایک تو اس شے کا انس جس سے وہ مخلوق ہوا۔ دوسرا خالق رحمٰن کا انس جیسے بچوں میں ماں باپ کا انس پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا نام انسان رکھا یہ اسم تثنیہ ہے۔ تاکہ ہمیشہ کے لئے ان دو انسوں کا لفظ ان دو صفتوں کو بتاتا رہے پھر خدا تعالےٰ کے ارادہ سے قانون قدرت میں یوں تبدیلی واقع ہوئی کہ کئی تغیرات کے بعد ماؤں کے رحموں کی معرفت اس کی آفرینش ہونے لگی۔ سو پہلے تغیر کا نام مَاءٍ دَافِقٍ اور نطفہ رکھا۔ اور دوسرے کا نام جس میں زندگی کا نشان ترقی کرتا ہے۔ علقہ رکھا اور تیسرے کا نام جو درشتی میں ایک لقمہ کے اندازہ کی مانند ہوا مضغہ رکھا۔ اور چوتھا تغیر جو صلابت اور قدر میں لقمہ سے ترقی کر گیا۔ اور بڑی بڑی حکمتوں پر اس کا نظام خلقت مشتمل ہوا۔ وہ عظام کے نام سے موسوم ہوا۔ اس لئے وہ عظمت اور شرف اور قدر و مقام میں انتہا کو پہنچ گیا۔ اور اس لئے بھی کہ ہڈیوں سے اس کے بعض حصے ترکیب پذیر ہوئے۔ اور پانچویں کا نام لحم ہوا۔ اس لئے کہ لحم عربی میں ایک چیز کے پیوند اور لحوق کو کہتے ہیں۔ جب وہ چیز دوسرے سے ملتی اور پیوند کرتی ہے۔ سو گوشت کپڑے کی طرح باقی جسم پر ملتا ہے۔ اور نیز اس لئے بھی کہ گوشت سخت ہڈیوں سے ملتا ہے۔ اور ان کو باہم ملاتا ہے۔ اور خوبی اور قرابت ان میں بخشتا ہے۔ اور چھٹے کو خلق آخر کہا۔ اور اسے کمال نفاست اور اعضا میں سرایت کرنے کے سبب سے نفس بھی کہا۔ اور پھر اس سارے مجموعہ کا نام جنین ہوا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

منن الرحمان صنا

۱۵/۲۳ ثابت شدہ واقعات یقینی اور قطعی طور پر شہادت دے رہے ہیں۔ کہ خود نطفہ مرد اور عورت کا بغیر اس کے کہ اس پر شبنم کی طرح آسمان کی فضا سے روح گرے روح پیدا ہونے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب مرد اور عورت کا نطفہ باہم مل جاتا ہے تو وہ استعداد بہت قوی ہو جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ استعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب بچہ کا پورا قالب طیار ہو جاتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور امر سے اسی قالب میں روح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ واقعات ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں۔ اسی کو ہم کہتے ہیں۔ کہ نیستی سے ہستی ہوئی۔ کیونکہ ہم روح کو جسم اور جسمانی نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ روح اسی مادہ میں سے پیدا ہوتی ہے۔ جو بعد اجتماع دونوں نطفوں کے رحم مادر میں آہستہ آہستہ قالب کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اور اس مادہ کے لئے ضروری نہیں کہ ساگ پات کی کسی قسم پر روح شبنم کی طرح گرے۔ اور اس سے روح کا نطفہ پیدا ہو۔ بلکہ وہ مادہ گوشت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ گوشت بکرے کا ہو یا مچھلی کا۔ یا ایسی مٹی ہو۔ جو زمین کی نہایت عمیق تہ کے نیچے ہوتی ہے۔ جس سے مینڈکیں وغیرہ کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں بلا شبہ یہ خدا کی قدرت کا ایک راز ہے کہ وہ جسم میں سے ایک ایسی چیز پیدا کرتا ہے۔ کہ وہ نہ جسم ہے۔ اور نہ جسمانی۔ پس واقعات موجودہ مشہودہ محسوسہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آسمان سے روح نہیں گرتی۔ بلکہ یہ ایک نئی روح ہوتی ہے۔ جو ایک مرکب نطفہ میں سے بقدرت قادر پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثم انشأناہ خلقاً اخر۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین یعنی جب رحم میں قالب انسانی تیار ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہم ایک نئی پیدائش سے اس کو مکمل کر دیتے ہیں۔ یعنی ہم اس مادہ کے اندر سے جس سے قالب تیار ہوا ہے۔ روح پیدا کر دیتے ہیں۔ چشمہ معرفت صـ۱۱۶

"خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ وید نے اس بارے میں بڑی غلطی کی ہے۔ کہ روحوں کو بھی خدا تعالےٰ کی طرح ازلی ابدی قرار دیا ہے پس اس شخص سے زیادہ تر نادان کون ہے۔ کہ جو ایسے ویدوں کو جو سراسر غلطیوں سے بھرے ہوئے اور مخلوق کو خدا کے برابر

ٹھیرا کر شرک کی تعلیم دیتے ہیں۔ سرچشمۂ علوم ٹھیراتا ہے۔ مگر قرآن شریف روحوں کو ازلی ابدی نہیں ٹھیراتا ہے۔ ان کو مخلوق بھی مانتا ہے۔ اور فانی بھی۔ جیسا کہ وہ روحوں کے مخلوق ہونے کے بارے میں صاف طور پر فرماتا ہے۔ کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقاً اٰخَر۔ یعنی جب قالب تیار ہو جاتا ہے۔ تو اسکی طیاری کے بعد اسی قالب میں سے ہم ایک نئی پیدائش کر دیتے ہیں یعنی رُوح۔ چشمۂ معرفت صفحہ ۱۵۰

" اور دوسری دلیل زمانہ کے آخری ہونے پر یہ ہے کہ قرآن شریف کی سورۃ عصر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے ہزار ششم پر واقعہ ہے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے یہ چھٹا ہزار سال جاتا ہے۔ اور ایسا ہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ کہ آدم سے لیکر اخیر تک دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔ لھٰذا آخر ہزار ششم وہ آخری حصہ اس دنیا کا ہوا جس سے ہر ایک جسمانی اور روحانی تکمیل وابستہ ہے۔ کیونکہ خدائی کارخانہ قدرت میں چھٹے دن۔ اور چھٹے ہزار کو اسی فعل کی تکمیل کیلئے قدیم سے مقرر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام چھٹے دن میں یعنی بروز جمعہ دن کے اخیر حصے میں پیدا ہوئے۔ یعنی آپ کے وجود کا تمام و کمال پیرایہ چھٹے دن ظاہر ہوا۔ گو خمیر آدم کا آہستہ آہستہ طیار ہو رہا تھا۔ اور تمام جمادی نباتی۔ حیوانی پیدائش کے ساتھ بھی شریک تھا۔ لیکن کمال خلقت کا دن چھٹا دن تھا۔ اور قرآن شریف بھی گو آہستہ آہستہ پہلے نازل ہو رہا تھا۔ مگر اس کا کامل وجود بھی چھٹے دن ہی بروز جمعہ اپنے کمال کو پہنچا۔ اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی اور انسانی نطفہ بھی اپنے تغیرات کے چھٹے مرتبہ میں ہی خلقت بشری سے پورا حصہ پاتا ہے۔ جسکی طرف آیت ثم انشاناہ خلقاً اٰخر میں اشارہ ہے۔ اور مراتب ستہ یہ ہیں۔ (۱) نطفہ (۲) علقہ (۳) مضغہ (۴) عظام (۵) لحم محیط العظام (۶) خلق آخر۔ اس قانون قدرت سے جو روز ششم اور مرتبہ ششم کی نسبت معلوم ہو چکا ہے۔ ماننا پڑتا ہے۔ کہ دنیا کی عمر کا ہزار ششم بھی یعنے اس کا آخری حصہ بھی جس میں ہم ہیں۔ کسی آدم کے پیدا ہونے کا وقت

اور کسی دینی تکمیل کے ظہور کا زمانہ ہے۔ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۵۴

" خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ روح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ جو نطفہ سے رحم میں طیار ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثم انشأناہ خلقاً اٰخر۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین یعنی پھر ہم اس جسم کو جو رحم میں طیار ہوا تھا۔ ایک اور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اور خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں۔ جو روح کے نام سے موسوم ہے۔ اور خدا بہت برکتوں والا ہے۔ اور ایسا خالق ہے۔ جو کوئی اس کے برابر نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اس جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک گہرا راز ہے۔ جو روح کی حقیقت دکھلا رہا ہے۔ اور ان نہایت مستحکم تعلقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو روح اور جسم کے درمیان واقع ہیں۔ اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کے راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں۔ تو ان سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے۔ یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتدا ہی سے ایک روح مخفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نطفہ میں مخفی تھی۔ اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا جائے۔ وہ روح چمکتی جاتی ہے اور جب وہ قالب پورا تیار ہو چکتا ہے۔ تو یک دفعہ وہ رُوح اپنی کامل تجلی کے ساتھ چمک اُٹھتی ہے۔ اور اپنی روحی حیثیت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے۔ اور زندگی کی صریح حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ جبھی کہ اعمال کا پورا قالب طیار ہو جاتا ہے معاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھلانا شروع کر دیتی ہے۔

اصول اسلام کی فلاسفی صفحہ ۳۱

" اگر یہ وسواس دل میں گذرے کہ پھر اللہ جلشانہ نے مسیح ابن مریم کی نسبت اس قصہ میں جہاں پرندہ بنانے کا ذکر ہے تخلق کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ جس کے بظاہر یہ معنے ہیں۔

کہ تو پیدا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت عیسٰے کو خالق قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ اس دوسری آیت میں فرماتا ہے فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ بلاشبہ حقیقی اور سچا خالق خدا تعالےٰ ہے۔ اور جو لوگ مٹی یا لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں وہ بھی خالق ہیں۔ مگر جھوٹے خالق جن کے فعل کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ ازالہ اوہام ص ۳۱۵

" حضرت آدم علیہ السلام چھٹے دن یعنے بروز جمعہ دن کے اخیر حصے میں پیدا ہوئے یعنے آپکے وجود کا تمام و کمال پیرایہ چھٹے دن ظاہر ہوا۔ گو خمیر آدم کا آہستہ آہستہ طیار ہو رہا تھا۔ اور تمام جمادی نباتی حیوانی پیدائشوں کے ساتھ بھی شریک تھا۔ لیکن کمال خلقت کا دن چھٹا دن تھا۔ اور قرآن شریف بھی گو آہستہ آہستہ پہلے سے نازل ہو رہا تھا۔ مگر اس کا کامل وجود بھی چھٹے دن ہی بروز جمعہ اپنے کمال کو پہنچا۔ اور آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی اور انسانی نطفہ بھی اپنے تغیرات کے چھٹے مرتبہ ہی خلقت بشری سے پورا حصہ پاتا ہے۔ جس کی طرف آیت ثم انشأ ناہ خلقاً اخر میں اشارہ ہے۔ اور مراتب ستہ یہ ہیں۔ (۱) نطفہ (۲) علقہ۔ (۳) مضغہ (۴) عظام (۵) لحم محیط العظام (۶) خلق آخر اس قانون قدرت سے جو روز ششم اور مرتبہ ششم کی نسبت معلوم ہو چکا ہے۔ ماننا پڑتا ہے۔ کہ دنیا کی عمر کا ہزار ششم یعنی اس کا آخری حصہ بھی جس میں ہم ہیں۔ کسی آدم کے پیدا ہونے کا وقت اور کسی دینی تکمیل کے ظہور کا زمانہ ہے۔ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۵۴۔

" ابتدائی تقویٰ جس کے حصول سے متقی کا لفظ انسان پر صادق آسکتا ہے۔ وہ ایک فطرتی حصہ ہے۔ کہ جو سعیدوں کی خلقت میں رکھا گیا ہے۔ اور ربوبیت اولیٰ اس کی مربی اور وجود بخش ہے۔ جس سے متقی کا پہلا تولد ہے۔ مگر وہ اندرونی نور جو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ عبودیت خالصہ تامہ اور ربوبیت کاملہ مستجمعہ سے بوے ... بورد التصال سے بطرز ثم انشأ ناہ خلقاً اخر کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیت

ثالثہ کا درجہ ہے۔ جو خلق جدید سے موسوم ہے۔ جس سے متقی لاہوتی مقام پر آپہنچتا ھے۔ اور تولد ثالث پاتا ہے۔ ازالہ اوہام صفحہ ۲۴۶

۱-۶/۲۳ اور اس جگہ کے متعلق ایک اور اعتراض ہے۔ جو بعض ناواقف آریہ پیش کیا کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان ربکم اللّٰہ الذی خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش یعنے خدا نے جو تمہارا رب ہے۔ زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا۔ اور پھر عرش پر ٹھیرا۔ یہ چھ دن کی کیوں تخصیص ہے۔ یہ تو تسلیم کیا کہ خدا تعالیٰ کے کام اکثر تدریجی ہیں۔ جیسا کہ اب بھی اسکی خالقیت جو جمادات اور نباتات اور حیوانات میں اپنا کام کر رہی ہے۔ تدریجی طور پر ہی ہر ایک چیز کو اس کی خلقت کاملہ تک پہنچاتی ہے لیکن چھ دن کی تخصیص کچھ سمجھ میں نہیں آتی ﴿

ما الجواب پس واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر در حقیقت مراتب تکوینی کیطرف اشارہ ھے یعنی ہر ایک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ھے۔ اور جسم اور جسمانی ہے۔ خواہ وہ مجموعہ عالم ہے۔ اور خواہ ایک فرد از افراد عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے۔ جو زمین و آسمان و مافیہا سے مراد ہے۔ خواہ وہ عالم صغیر جو انسان سے مراد ہے۔ وہ بحکمت و قدرت باریتعالےٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کر کے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے۔ اور یہ عالم قانون قدرت ھے۔ کچھ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں۔ چنانچہ اللہ جلشانہ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہی مراتب ستہ کا ذکر فرماتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے اٹھارہویں سیپارے سورۃ المومنون میں یہ آیت ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

یعنے پہلے تو ہم نے انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا۔ جو زمین کے تمام انواع اور اقسام کا

لب لباب تھا۔ اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ تا وہ باعتبار جسم بھی عالم صغیر ٹھیری اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو۔ جیسا کہ وہ بر طبق آیت وَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ باعتبار روح عالم صغیر ہے۔ اور بلحاظ شیون وصفات کاملہ وظلیت تام روح الٰہی کا مظہر تام ہے۔ پھر بعد اس کے انسان کو ہمنے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا۔ جو انسان کے اندر نطفہ پیدا کیا۔ اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں ساتھ ہی رحم میں بنتی جاتی ہے جگہ دی (قرار مکین کا لفظ اسلئے اختیار کیا گیا۔ کہ تا رحم اور تھیلی دونوں پر اطلاق پا سکے) اور پھر ہم نے نطفہ سے علقہ بنایا اور علقہ سے مضغہ اور مضغہ کے بعض حصوں میں سے ہڈیاں اور ہڈیاں پر پوست پیدا کیا۔ پھر اس کو ایک اور پیدائش دی یعنی روح اس میں ڈالدی۔ پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا جو اپنی صنعت کاری میں تمام صناعوں سے بلحاظ حسن صنعت وکمال عجائبات خلقت بڑھا ہوا ہے ؟

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ بھی اپنا قانون قدرت یہی بیان فرمایا۔ کہ انسان چھ طور کی خلقت کے مدارج طے کر کے اپنے کمال انسانیت کو پہنچتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالم صغیر اور عالم کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے۔ اور قرآن سے انسان کا عالم صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ کہ تقویم عالم کی متفرق خوبیوں اور حسنوں کا ایک ایک حصہ انسان کو دیکر بوجہ جامعیت جمیع شمائل وشیون عالم اسکو احسن ٹھیرایا گیا ہے۔ پس اب بوجہ تشابہ عالمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعال صانع واحد ماننا پڑتا ہے۔ کہ جو عالم صغیر میں مراتب تکوین موجود ہیں۔ وہی مراتب تکوین عالم کبیر میں بھی ملحوظ ہوں۔ اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالم صغیر جو انسان کے اسم سے موسوم ہے۔ اپنی پیدائش میں چھ طریق رکھتا ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ عالم عالم کبیر کے کوائف مخفیہ کی شناخت کے لئے ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ پس جبکہ اس کی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے تو قطعی طور پر حکم دے سکتے ہیں کہ عالم کبیر کے بھی مراتب تکوین چھ ہی ہیں۔ جو بلحاظ موثرات ستہ

یعنی تجلیات ستہ جن کے آثار باقیہ نجوم ستہ میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ معقولی طور پر متحقق ہوتے ہیں۔ اور نجوم ستہ کا اب بھی علوم حکمیہ میں جنین کی تکمیل کیلئے تعلق مانا جاتا ہے۔ چنانچہ سدیدی میں اس کے متعلق ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔ بعض نادان اس جگہ اس آیت کی نسبت یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حال کی طبی تحقیقاتوں کی رو سے یہ طرز بچہ کے بننے کی جو رحم عورت میں بنتا ہے۔ ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ برخلاف اس کے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض سخت درجہ کی کم فہمی یا صریح تعصب پر مبنی ہے۔ اس بات کے تجربہ کیلئے کسی ڈاکٹر یا طبیب کی حاجت نہیں۔ خود ہر ایک انسان آزمائش کے لئے وقت خرچ کرکے اور ان بچوں کو دیکھکر جو تام خلقت یا ناتمام خلقت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ یا سقوط حمل کے طور پر گرتے ہیں۔ حقیقت واقعیہ تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ ہم اپنے ذاتی مشاہدہ سے جانتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ انسانی نطفہ سے کسی بچے کو رحم میں بنانے کے لئے ارادہ فرماتا ہے تو پہلے مرد اور عورت کا نطفہ رحم میں ٹھیرتا ہے۔ اور صرف چند روز تک ان دونوں منیوں کے امتزاج سے کچھ تغیر طاری ہو کر جمے ہوئے خون کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے۔ جس پر ایک نرم سی جھلی ہوتی ہے۔ یہ جھلی جیسے جیسے بچہ بڑھتا ہے۔ بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خاکی رنگ کی ایک تھیلی سی ہو جاتی ہے۔ جو گٹھڑی کیطرح نظر آتی ہے۔ اور اپنی تکمیل خلقت کے دنوں تک بچہ اسی میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اسکی مصدق ہیں۔ کہ عالم کبیر بھی اپنے کمال خلقت کے وقت تک ایک گٹھڑی کی طرح تھا۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما وجعلنا من الماء کل شیئٍ حیٍّ یعنی فرماتا ہے۔ کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا۔ کہ گٹھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے۔ اور ہم نے ان کو کھولدیا۔ تو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ انکی گٹھڑی دیکھی لیکن اس جگہ روحانی آسمان اور روحانی زمین کیطرف اشارہ ہے جس کی گٹھڑی کفار عرب کے روبرو کھل گئی۔ اور فیضان سماوی زمین پر جاری ہو گئے۔

اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف عود کر کے کہتے ہیں۔ کہ نطفتین مرد اور عورت کے جو آپس میں مل جاتے ہیں۔ وہ اوّل مرتبہ تکوین کا ہے۔ اور پھر ان میں ایک جوش آکر وہ مجموعہ نطفتین جو قوت عاقدہ اور منعقدہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ سرخی کیطرف مائل ہو جاتا ھے۔ گویا وہ منی جو پہلے خون سے بنی تھی۔ پھر اپنے اصلی رنگ کی طرف جو خونی ہے عود کر آتی ھے۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ پھر وہ خون جما ہوا جس کا نام علقہ ہے۔ ایک گوشت کا مضغہ ہو جاتا ہے۔ جو انسانی شکل کا کچھ خاکہ نہایت دقیق طور پر اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔ اور اس درجہ پر اگر بچہ ساقط ہو جائے تو اس کے دیکھنے سے غور کی نظر سے کچھ خطوط انسان بننے کے اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر بچے اس حالت میں بھی ساقط ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو کبھی یہ اتفاق پیش آیا ہے۔ یا وہ دایہ کا کام کرتی ہیں۔ وہ اس حال سے خوب واقف ہیں۔ پھر چوتھا درجہ وہ ہے۔ جو مضغہ سے ہڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ آیت فخلقنا المضغۃ عظاماً بیان فرما رہی ہے۔ مگر المضغہ پر جو الف لام ہے وہ تخصیص کے لئے ہے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ تمام مضغہ ہڈی نہیں بنجاتا بلکہ جہاں جہاں ہڈیاں درکار ہیں باذنہٖ تعالےٰ وہی نرم گوشت کسی قدر صلب ہو کر ہڈی کی صورت بن جاتا ہے۔ اور کسیقدر بدستور نرم گوشت رہتا ہے اور اس درجہ پر انسانی شکل کا کھلا کھلا خاکہ طیار ہو جاتا ہے۔ جس کے دیکھنے کے لئے خوردبین کی ضرورت نہیں اس خاکہ میں انسان کا اصل وجود جو کچھ بننا چاہیئے تھا۔ بن چکتا ہے۔ لیکن وہ ابھی اس لحم سے خالی ہوتا ہے۔ جو انسان کیلئے بطور ایک موٹے اور شاندار اور چمکیلے لباس کے ہے جس سے انسان کے تمام خط وخال ظاہر ہوتے ہیں۔ اور بدن پر تازگی آتی ہے۔ اور خوبصورتی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور تناسب اعضا پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر بعد اس کے پانچواں درجہ وہ ہے کہ جب اس خاکہ پر لحم یعنی موٹا گوشت برعایت مواضع مناسبہ چڑھایا جاتا ہے۔ یہ وہی گوشت ہے کہ جب انسان تپ وغیرہ سے بیمار رہتا ہے تو فاقہ اور بیماری کی تکالیف شاقہ سے وہ گوشت تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات انسان ایسی لاغری کی حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ جو وہی پانچویں درجہ کا خاکہ یعنی مشت استخوان

رہجاتا ہے۔ جیسے مدقوقوں اور مسلولوں اور اصحاب ذیابیطس میں مرض کے انتہائی درجہ میں یہ صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کی حیات مقدر ہوتی ہے۔ تو پھر خدا تعالیٰ اس کے بدن پر گوشت چڑھاتا ہے۔ غرض یہ وہی گوشت ہے جس سے خولصورتی اور تناسب اعضا اور رونق بدن پیدا ہوتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ گوشت خاکہ طیار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ جنین پر چڑھتا رہتا ہے۔ اور جب جنین ایک کافی حصہ اس کا لے لیتا ہے تب باذنہ تعالیٰ اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ تب وہ نباتی حالت سے جو صرف نشو ونما ہے منتقل ہو کر حیوانی حالت کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے۔ اور پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے غرض یہ ثابت شدہ بات ہے کہ بچہ اپنی نباتی صورت سے حیوانی صورت کو کامل طور پر اس وقت قبول کرتا ہے۔ کہ جب کہ عام طور پر موٹا گوشت اس کے بدن پر مناسب کمی وبیشی کے ساتھ چڑھ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جسکو آج تک انسان کے مسلسل تجارب اور مشاہدات نے ثابت کیا ہے۔ یہ وہی تمام صورت ہے۔ جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔ اور مشاہدات کے ذریعہ سے بتواتر ثابت ہے۔ پھر اس پر اعتراض کرنا اگر نادانوں کا کام نہیں تو اور کس کا ہے؟

اب ہم پھر اپنے پہلے کلمہ کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ چونکہ عالم صغیر میں جو انسان ہے۔ سنت اللہ یہی ثابت ہوئی ہے کہ اس کے وجود کی تکمیل چند مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ تو اسی قانون قدرت کی رہبری سے ہمیں معقول طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دنیا کی ابتدا میں جو اللہ جلشانہ نے عالم کبیر پیدا کیا۔ تو اس کی طرز پیدائش میں بھی یہی مراتب ستہ ملحوظ رکھے ہوں گے۔ اور ہر یک مرتبہ کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دن یا ایک وقت سے مخصوص کیا ہوگا۔ جیسا کہ انسان کی پیدائش کے مراتب ستہ چھ وقتوں سے خاص ہیں۔ اور دنیا کی تمام قوموں کا سات دنوں پر اتفاق ہونا اور ایک دن تعطیل کا نکال کر چھ دنوں کو کاموں کے لئے خاص کرنا اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ یہ چھ دن ان چھ دنوں کی یادگار چلے آتے ہیں۔ کہ جن میں زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے بنایا گیا تھا۔

اور اگر کوئی اب بھی تسلیم نہ کرے۔ اور انکار سے باز نہ آئے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو عالم کبیر کے لئے عالم صغیر کی پیدائش کے مراتب ستہ کا ثبوت دیدیا۔ اور جو کام کرنے کے دن بالاتفاق ہر یک قوم میں مسلّم ہیں۔ ان کا چھ ہونا بھی ظاہر کر دیا۔ اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالےٰ کے تمام پیدائشی کام اس دنیا میں تدریجی ہیں۔ تو پھر اگر منکر کی نظر میں یہ دلیل کافی نہیں۔ تو اس پر واجب ہوگا۔ کہ وہ بھی تو اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل پیش کرے۔ کہ خدا تعالیٰ نے یہ عالم جسمانی صرف ایکدم میں پیدا کر دیا تھا۔ تدریجی طور پر پیدا نہیں کیا تھا ہر ایک شخص جانتا ہے کہ وہی خدا اب بھی ہے۔ جو پہلے تھا۔ اور وہی خالقیت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ جو پہلے جاری تھا۔ اور صاف بدیہی طور پر نظر آرہا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ ہر یک مخلوق کو تدریجی طور پر اپنے کمال وجود تک پہنچاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے وہ قوی تھا اور جلد کام کر لیتا تھا۔ اور اب ضعیف ہے۔ اور دیر سے کرتا ہے۔ بلکہ یہی کہینگے کہ اس کا قانون قدرت ہی ابتدا سے یہی ہے۔ کہ وہ ہر ایک مخلوق کو بتدریج پیدا کرتا ہے۔ سو حال کے افعال الٰہی بتلا رہے ہیں۔ کہ گذشتہ اور ابتدائی زمانہ میں بھی یہی تدریج ملحوظ تھی۔ جواب ہے۔ ہم سخت نادان ہوں گے۔ اگر ہم حال کے آئینہ میں گذشتہ کی صورت نہ دیکھ لیں اور حال کی طرز خالقیت پر نظر ڈال کر صرف اتنا ہی ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالےٰ اپنی پیدائش کے سلسلہ کو تدریج سے کمال وجود تک پہنچاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر یک مخلوق کی پیدائش میں چھ ہی مرتبے رکھے ہیں اور حکمت الٰہی نے ہر یک مخلوق کی پیدائش . . . . . میں یہی تقاضا کیا کہ اس کے پیدا ہونے کے چھ مرتبے ہوں۔ جو چھ وقتوں میں انجام پذیر ہوں کسی مخلوق پر نظر ڈال کر دیکھ لو۔ یہی چھ مراتب اس میں متحقق ہوں گے۔ یعنی بنظر تحقیق یہ ثابت ہوگا۔ کہ ہر یک جسمانی وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور انسان پر کچھ موقوف نہیں زمین پر جو ہزارہا حیوانات ہیں۔ ان کے وجود کی تکمیل بھی انہی مراتب ستہ پر موقوف پاؤ گے۔

پھر ایک اور عجیب بات ہے۔ کہ یہ سلسلہ مراتب ستہ تکوین کا صرف جسمانی مخلوق میں ہی محدود نہیں۔ بلکہ روحانی امور میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ مثلاً تھوڑی

سی غور سے معلوم ہوگا۔ کہ انسان کی روحانی پیدائش کے مراتب بھی چھ ہیں۔ پہلے وہ نطفہ کی صورت پر صرف حق کے قبول کرنے کی ایک استعداد بعیدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور پھر جب اس استعداد کے ساتھ ایک قطرہ رحمت الٰہی مل جاتا ہے۔ اسی طرز کے موافق کہ جب عورت کے نطفہ میں مرد کا نطفہ پڑتا ہے۔ تو تب انسان کی باطنی حالت نطفہ کی صورت سے علقہ کی صورت میں آجاتی ہے۔ اور کچھ رشتہ باری تعالیٰ سے پیدا ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ علقہ کے لفظ سے تعلق کا لفظ مفہوم ہوتا ہے۔ اور پھر وہ علقہ اعمال صالحہ کے خون کی مدد سے مضغہ بنتا ہے۔ اسی طرز سے کہ جیسے خون حیض کی مدد سے علقہ مضغہ بنجاتا ہے۔ اور مضغہ کی طرح ابھی اس کے اعضا ناتمام ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مضغہ میں ہڈی والے عضو ابھی ناپدید ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اسمیں بھی شدت للہ اور ثبات للہ اور استقامت للہ کے عضو ابھی کماحقہ پیدا نہیں ہوتے۔ گو تواضع اور نرمی موجود ہوتی ہے اور اگرچہ پوری شدت اور صلابت اس مرتبہ میں پیدا نہیں ہوتی۔ مگر مضغہ کی طرح کسی قدر قضاؤ قدر کے مضغے کے لائق ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی قدر اس لائق ہو جاتا ہے کہ قضاؤقدر کا دانت اس پر چلے۔ اور وہ اس کے نیچے ٹھیر سکے۔ کیونکہ علقہ جو ایک سیال رطوبت کے قریب ہے۔ وہ تو اس لائق ہی نہیں کہ دانتوں کے نیچے پیسا جاوے۔ اور ٹھیرا رہے۔ لیکن مضغہ مضغے کے لائق ہے۔ اسی لئے اس کا نام مضغہ ہے۔ سو مضغہ ہونے کی وہ حالت ہے۔ کہ جو کچھ چاشنی محبت الٰہی کی دل میں پڑ جاتی ہے۔ اور تجلی جلالی توجہ فرماتی ہے۔ کہ بلاؤں کے ساتھ اس کی آزمایش کرے۔ تب وہ مضغہ کی طرح قضاؤقدر کے دانتوں میں پیسا جاتا ہے۔ اور خوب قیمہ کیا جاتا ہے۔ غرض تیسرا درجہ سالک کے وجود کا مضغہ ہونے کی حالت ہے۔ اور پھر چوتھا درجہ وہ ہے کہ جب انسان استقامت اور بلاؤں کی برداشت کی برکت سے آزمائے جانے کے بعد نقوش انسانی کا پورے طور پر انعام پاتا ہے۔ یعنی روحانی طور پر اس کے لئے ایک صورت انسانی عطا ہوتی ہے اور انسان کی طرح دو آنکھیں دو کان اور دل اور دماغ اور تمام ضروری قویٰ اور اعضا عطا کئے جاتے ہیں۔ اور بمقتضائے آیت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ وہ سختی

اور نرمی مواضع میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک خلق اس کا اپنے محل پر صادر ہوتا ہے
اور آداب طریقت تمام محفوظ ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک کام اور کلام حفظ حدود کے لحاظ سے
بجالاتا ہے۔ یعنی نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اور تواضع کی جگہ پر تواضع اور ترفع کی جگہ
پر ترفع ایسا ہی تمام قوی سے اپنے اپنے محل پر کام لیتا ہے۔ یہ درجہ جنین کے اس درجہ
سے مشابہت رکھتا ہے۔ کہ جب وہ مضغہ کی حالت سے ترقی کر کے انسان کی صورت
کا ایک پورا خاکہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور ہڈی کی جگہ پر ہڈی نمودار ہو جاتی ہے۔ اور گوشت
کی جگہ پر گوشت باقی رہتا ہے۔ ہڈی نہیں بنتی اور تمام اعضا میں باہم تمیز کلی پیدا ہو جاتی
ہے لیکن ابھی خوبصورتی اور تازگی اور تناسب اعضا نہیں ہوتا۔ صرف خاکہ ہوتا ہے
جو نظر دقیق سے دکھائی دیتا ہے۔ پھر بعد اس کے عنایت الٰہی توفیقات متواترہ سے
موفّق کر کے اور تزکیہ نفس کے کمال تک پہنچا کر اور فنا فی اللہ کے انتہائی نقطہ تک
کھینچ کر اس کے خاک کے بدن پر انواع اقسام کی برکات کا گوشت بھر دیتی ہے۔ اور اس
گوشت سے اس کی شکل کو چمکیلی اور اس کی تمام ہیکل کو آبدار کر دیتی ہے۔ تب اسکے
چہرہ پر کاملیت کا نور برستا ہے۔ اور اس کے بدن پر کمال تام کی آب و تاب نظر آتی ہے اور
یہ درجہ پیدائش کا جسمانی پیدائش کے اس درجہ سے مشابہ ہوتا ہے۔ کہ جب جنین کے خاکہ
کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ اور خوبصورتی اور تناسب اعضا ظاہر کیا جاتا ہے
پھر بعد اس کے روحانی پیدائش کا چھٹا درجہ ہے۔ جو مصداق ثُمَّ اَنْشَأْنٰہُ خَلْقًا اٰخَر کا
ہے وہ مرتبہ بقا ہے۔ جو خوف کے بعد ملتا ہے۔ جس میں روح القدس کامل طور پر عطا کیا جاتا
ہے۔ اور ایک روحانی زندگی کی روح انسان کے اندر پھونک دی جاتی ہے۔ ایسا ہی
یہ چھ مراتب خدا تعالےٰ کی پاک کلام میں بھی جمع ہیں۔ اول حروف کا مرتبہ جو کامل کلام الٰہی
اور کلمات کتاب اللہ کے لئے بطور تخم کے ہیں۔ جن کو معانی مقصودہ سے کچھ بھی حصہ نہیں
ہاں ان کے حصول کے لئے ایک استعداد بعیدہ رکھتے ہیں۔ دوم کلمات کا مرتبہ جو اس
تخم کے ذریعہ سے ظہور خارجی کے رنگ میں آ گئے۔ جن کو معانی مقصودہ سے کچھ حصہ
نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں۔ سوم ان فقرات ناتمام کا مرتبہ جو

ابھی کلام مقصودہ کے پورے درجہ تک نہیں پہنچے تھے۔ کیونکہ ہنوز تنزیل کا سلسلہ ناتمام تھا۔ اور خدا تعالےٰ کے کلام نے ابھی اپنا کامل چہرہ نہیں دکھلایا تھا۔ مگر ان فقرات کو معانی مقصودہ سے ایک وافر حصہ تھا اس لئے وہ کلام تام الٰہی کے لئے بطور بعض اعضاء کے ٹھیرے۔ جن کے نام بلحاظ قلت و کثرت آیتیں اور سورتیں رکھا گیا۔ چہارم اس کلام جامع تام مفصّل حمیز کا مرتبہ جو سب نازل ہو چکا۔ اور جمیع مضامین مقصودہ اور علوم کلیہ و قصص اخبار و احکام و قوانین و ضوابط و حدود و مواعید و انذارات و تبشیرات اور درشتی اور نرمی اور شدت اور رحم اور حقائق و نکات پر بالاستیفا مشتمل ہے پنجم بلاغت و فصاحت کا مرتبہ جو زینت اور آرائش کے لئے اس کلام پر ازل سے چڑھائی گئی ششم برکت اور تاثیر اور کشش کی روح کا مرتبہ جو اس پاک کلام میں موجود ہے جس نے تمام کلام پر اپنی روشنی ڈالی۔ اور اس کو زندہ اور منور کلام ثابت کیا۔

آئینہ کمالات اسلام حاشیہ ص ۱۷۶-۲۰۹

---

۱۶ و ۱۵
۲۳

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ○

یعنی اول رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ تم کو کمال تک پہنچاتا ہے۔ اور پھر تم اپنا کمال پورا کرنے کے بعد زوال کی طرف میل کرتے ہو۔ یہاں تک کہ مر جاتے ہو۔ یعنی تمہارے لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے یہی قانون قدرت ہے۔ کوئی بشر اس سے باہر نہیں۔ الحمد اوند قدیر اپنے اس قانون قدرت کے سمجھنے کے لئے ان لوگوں کو آنکھیں بخش۔ جو مسیح ابن مریم کو اس سے باہر سمجھتے ہیں۔ ازالہ اوہام صفحہ ۹۱۱

" پھر پانچویں آیت اس مضمون کی یہ ہے۔ ثم انکم یوم القیامۃ تبعثون اس امر کو ظاہر کر رہی ہے کہ کوئی انسان راحت یا رنج عالم معاد کے چکھ کر پھر دنیا میں ہرگز نہیں آتا۔ ازالہ اوہام صفحہ ۶۴۲ حاشیہ در حاشیہ۔

۱۹/۲۳ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡكَنّٰهُ فِي الۡاَرۡضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوۡنَ ۝

مسیح ابن مریم کی آخری زمانہ میں آنے کی قرآن شریف میں پیشگوئی موجود ہے قرآن شریف نے جو مسیح کے نکلنے کی چودہ سو برس تک مدت ٹھیرائی ہے۔ بہت سے اولیا بھی اپنے مکاشفات کی رو سے اس مدت کو مانتے ہیں۔ اور آیت وَاِنَّا عَلٰی ذَھَابٍۢ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ جس کے بحساب جمل ۱۲۷۴ عدد ہیں۔ اسلامی چاند کی سلخ کی راتوں کیطرف اشارہ کرتی ہے۔ جس میں نئے چاند کے نکلنے کی اشارت چھپی ہوئی ہے۔ جو غلام احمد قادیانی کے عددوں میں بحساب جمل پائی جاتی ہے۔ ازالہ اوہام ص ۶۷۵

" انا الجملہ اس عاجز کے مسیح موعود ہونے پر یہ نشان ہے۔ کہ مسیح موعود کے ظہور کی خصوصیت کے ساتھ یہ علامت ہے کہ دجال معہود کے خروج کے بعد نازل ہو کیونکہ یہ ایک واقعہ مسلمہ ہے۔ کہ دجال معہود کے خروج کے بعد آنے والا وہی سچا مسیح ہے۔ جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا مسلم کی حدیث میں وجہ تسمیہ مسیح ہونے کا یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ مومنوں کی شدت اور محنت اور ابتلار کا غبار جو دجال کی وجہ سے ان کے ظاہری حال ہوگا۔ ان کے چہروں سے پونچھ دے گا۔ یعنی دلیل اور حجت سے ان کو غالب کر دکھائیگا۔ سو اس لئے وہ مسیح کہلائیگا۔ کیونکہ مسیح پونچھنے کو کہتے ہیں۔ جس سے مسیح مشتق ہے۔ اور ضرور ہے کہ وہ دجال معہود کے بعد نازل ہو سو یہ عاجز دجال معہود کے خروج کے بعد آیا ہے۔ پس اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دجال معہود یہی پادریوں اور عیسائی متکلموں کا گروہ ہے۔ جس نے زمین کو اپنے ساحرانہ کاموں سے تہ و بالا کر دیا ہے۔ اور جو ٹھیک ٹھیک اس وقت سے زور کیساتھ خروج کر رہا ہے۔ اور جو اعداد آیت اِنَّا عَلٰی ذَھَابٍۢ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ سے

لہ آیت انا علی ذہاب بہٖ لقادرون میں ۱۸۵۷ء کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں

سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ۱۸۵۷ء کا زمانہ۔ تو ساتھ ہی اس عاجز کا مسیح موعود ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ ازالہ اوہام صفحہ ۷۲۲۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۶

ہندوستان میں ایک مفسدہ عظیم ہو کر آثار باقیہ اسلامی سلطنت کے ملک ہند سے ناپدید ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس آیت کے اعداد بحساب جمل ۱۲۷۴ ہیں اور ۱۲۷۴ کے زمانہ کو جب عیسوی تاریخ میں دیکھنا چاہیں۔ تو ۱۸۵۷ء ہوتا ہے۔ سو درحقیقت ضعف اسلام کا زمانہ ابتدائی یہی ۱۸۵۷ء ہے۔ جسکی نسبت خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں فرماتا ہے۔ کہ جب وہ زمانہ آئیگا۔ تو قرآن زمین پر سے اُٹھایا جائیگا۔ سو ایسا ہی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی۔ کہ بجز بدچلنی اور فسق و فجور کے اسلام کے رئیسوں کو اور کچھ یاد نہ تھا۔ جس کا عوام پر بھی بہت اثر پڑ گیا تھا۔ انہی ایام میں انہوں نے ایک ناجائز اور ناگوار طریقہ سے سرکار انگریزی سے باوجود نمکخوار اور رعیت ہونے کے مقابلہ کیا۔ حالانکہ ایسا مقابلہ اور ایسا جہاد ان کے لئے شرعاً جائز نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس گورنمنٹ کی رعیت اور ان کے زیر سایہ تھی۔ اور رعیت کا اس گورنمنٹ کے مقابل پر سر اُٹھانا جسکی وہ رعیت ہے اور جس کے زیر سایہ امن اور آزادگی سے زندگی بسر کرتی ہے۔ سخت حرام اور معصیت کبیرہ اور ایک نہایت مکروہ بدکاری ہے۔ جب ہم ۱۸۵۷ء کی سوانح کو دیکھتے ہیں اور اس زمانہ کے مولویوں کے فتووں پر نظر ڈالتے ہیں۔ جنہوں نے عام طور پر مہریں لگا دی تھیں جو انگریزوں کو قتل کر دینا چاہیئے۔ تو ہم بحر ندامت میں ڈوب جاتے ہیں۔ کہ یہ کیسے مولوی تھے اور کیسے ان کے فتوے تھے۔ جن میں نہ رحم تھا۔ نہ عقل تھی۔ نہ اخلاق نہ الطاف۔ ان لوگوں نے چوروں اور قزاقوں اور حرامیوں کی طرح اپنی محسن گورنمنٹ پر حملہ کرنا شروع کیا۔ اور اس کا نام جہاد رکھا۔ ننھے ننھے بچوں اور بیگناہ عورتوں کو قتل کیا۔ اور نہایت بے رحمی سے انہیں پانی تک نہ دیا۔ کیا یہ حقیقی اسلام تھا۔ یا یہودیوں کی خصلت تھی۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسے جہاد کا کسی جگہ حکم دیا ہے۔ پس اس حکیم و علیم کا قرآن کریم میں یہ بیان فرمانا کہ ۱۸۵۷ء میں میرا کلام آسمان پر اُٹھایا جائیگا۔ یہی معنے رکھتا ہے۔ کہ مسلمان اس پر عمل نہیں کریں گے

۲۵/۲۳ مَاسَمِعۡنَا بِهٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ○

ہمنے اپنے بزرگوں میں یعنے اولیار سلف میں یہ نہیں سُنا۔

براہین صفحہ ۵۶۱

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷ جیسا کہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا تعالےٰ پر یہ الزام لگانا
کہ ایسے جہاد اور ایسی لڑائیاں اسکے حکم سے کی تھیں۔ یہ دوسرا گناہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ ہمیں یہی
شریعت سکھلاتا ہے۔ کہ ہم نیکی کی جگہ بدی کریں۔ اور اپنی محسن گورنمنٹ کے احسانات کا اسکو یہ صلہ
دیں۔ کہ انکی قوم کے صغیر بچوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں۔ اور انکی محبوبہ بیویوں کو ٹکڑے
ٹکڑے کر ڈالیں۔ بلاشبہ ہم یہ داغ مسلمانوں خاص کر اپنے اکثر مولویوں کی پیشانی سے دھو نہیں
سکتے۔ کہ وہ ۱۸۵۷ء میں مذہب کے پردہ میں ایسے گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے۔ جس کی ہم کسی قوم
کی تواریخ میں نظیر نہیں دیکھتے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ انہوں نے اور بھی برے کام کئے۔ جو صرف وحشی
حیوانات کی عادات ہیں۔ نہ انسانوں کی خصلتیں۔ انہوں نے نہ سمجھا کہ اگر ان کے ساتھ یہ سلوک
کیا جائے۔ کہ ایک ممنون منت ان کا ان کے بچوں کو مار دے۔ اور ان کی عورتوں کے ٹکڑے
ٹکڑے کر دے۔ تو اس وقت ان کے دل میں کیا کیا خیال پیدا ہوگا۔ باوجود اسکے یہ مولوی لوگ اس بات
کی شیخی مارتے ہیں کہ ہم بڑے متقی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نفاق سے زندگی بسر کرنا انہوں نے کہاں سے
سیکھ لیا ہے۔ کتاب الٰہی کی غلط تفسیروں نے انہیں بہت خراب کیا ہے۔ اور انکی دلی اور دماغی
قویٰ پر بہت برا اثر ان سے پڑا ہے۔ اس زمانہ میں بلاشبہ کتاب الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی
نئی اور صحیح تفسیر کی جائے۔ کیونکہ حال میں جن تفسیروں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ نہ اخلاقی حالت
کو درست کر سکتی ہیں۔ اور نہ ایمانی حالت پر نیک اثر ڈالتی ہیں۔ بلکہ فطرتی سعادت اور نیک
روشنی کے مزاحم ہو رہی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل اپنے ذاتیہ کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم
نہیں ہے۔ قرآنی تعلیم ایسے لوگوں کے دلوں سے مٹ گئی ہے۔ کہ گویا قرآن آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔
وہ ایمان جو قرآن نے سکھلایا تھا اس سے لوگ بےخبر ہیں۔ وہ عرفان جو قرآن نے بخشا تھا۔ اس سے
لوگ غافل ہوگئے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں۔ مگر قرآن ان کے حلق کے نیچے نہیں اُترتا

۲۸/۲۳ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا

ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا۔

کشتی نوح ٹائٹیل و سبز اشتہار صفحہ ۲۴

۴۵/۲۳ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا

یعنے پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے پس ان تمام آیات (اسی قسم کی اس سے پہلے نقل فرمائی ہیں ناقل) سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیجکر پھر اس کی تائید اور تصدیق کیلئے ضرور انبیا بھیجا کرتا ہے۔ چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائیبل شہادت دے رہی ہے۔ (شہادۃ القرآن صفحہ ۴۱)

۵۱/۲۳ وَ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ۝

قرآن شریف میں ایک آیۃ میں صریح کشمیر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسیح اور اس کی والدہ صلیب کے واقعہ کے بعد کشمیر کی طرف چلے گئے۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَ اٰوینھما الیٰ ربوۃٍ ذات قرارٍ و معین۔ یعنی ہم نے عیسےٰ اور اس کی والدہ کو ایک ایسے ٹیلے پر جگہ دی جو آرام کی جگہ تھی۔ اور پانی صاف یعنے چشموں کا پانی وہاں تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸

انہی معنوں سے کہا گیا ہے۔ کہ آخری زمانہ میں قرآن آسمان پر اُٹھایا جائیگا۔ پھر انہی حدیثوں میں لکھا ہے۔ کہ پھر دوبارہ قرآن کو زمین پر لانے والا ایک مرد فارسی الاصل ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ لوکان الایمان معلقاً عند الثریا لنالہ رجلٌ من فارس یہ حدیث درحقیقت اس زمانہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو آیت انا علی ذھابٍ بہ لقادرون میں اشارہ بیان کیا گیا ہے ومنہ۔

سو اس میں خدا تعالیٰ نے کشمیر کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اور آوی کا لفظ لغت عرب میں کسی مصیبت یا تکلیف سے پناہ دینے کے لئے آتا ہے۔ اور صلیب سے پہلے عیسٰے اور اس کی والدہ پر کوئی زمانہ مصیبت کا نہیں گذرا۔ جس سے پناہ دی جاتی۔ پس متعین ہوا۔ کہ خدا تعالیٰ نے عیسٰے اور اس کی والدہ کو واقعہ صلیب کے بعد اس ٹیلے پر پہنچایا تھا۔

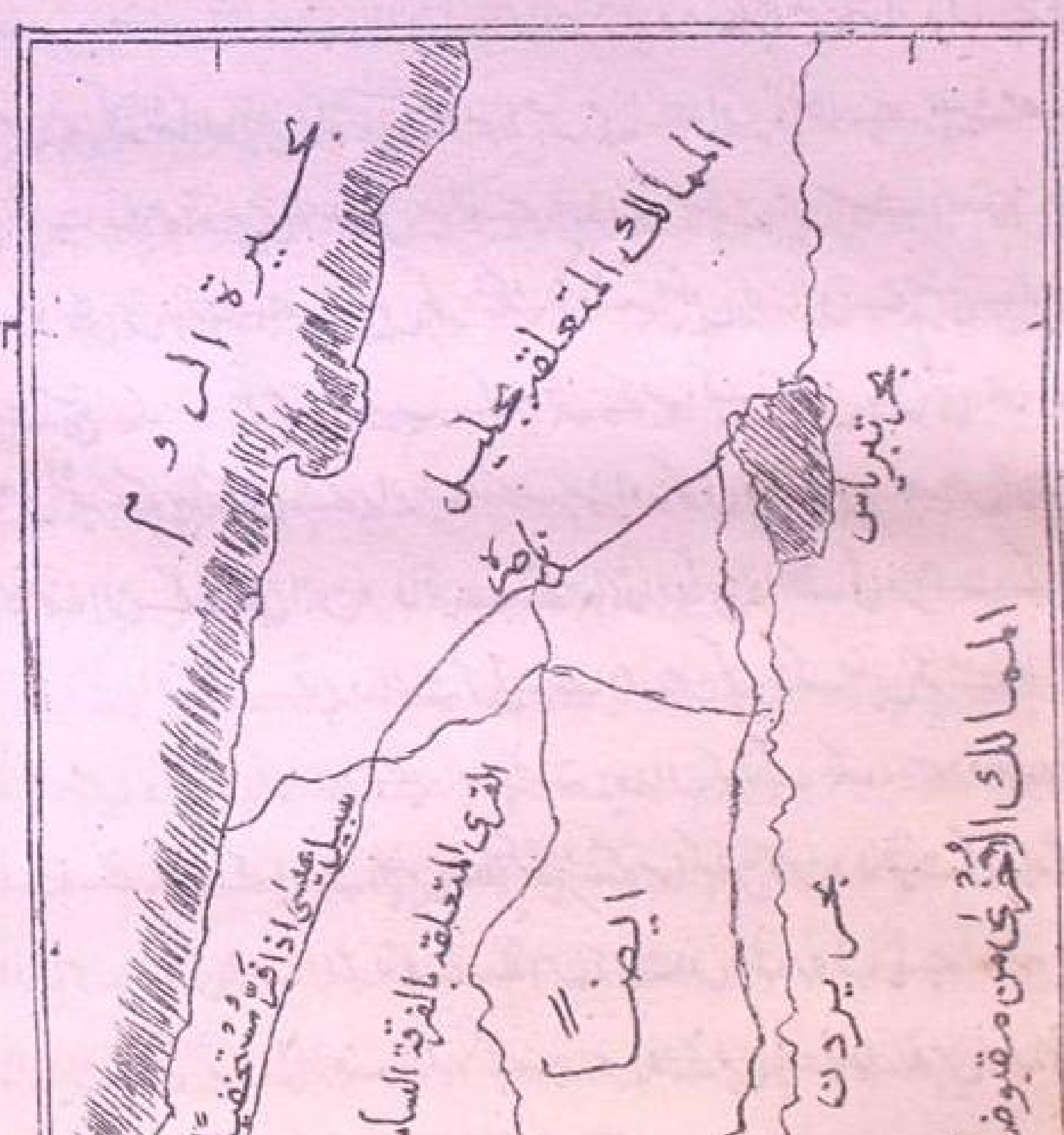
کشتی نوح صفحہ ۱۶

" خدا کا کلام قرآن شریف گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ مر گیا۔ اور اس کی قبر سری نگر کشمیر میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وآویناھما الیٰ ربوۃٍ ذات قرارٍ و معین یعنی ہمنے عیسٰے اور اس کی ماں کو یہودیوں کے ہاتھ سے بچا کر ایک ایسے پہاڑ میں پہنچا دیا۔ جو آرام اور خوشحالی کی جگہ تھی۔ اور مصفا پانی کے چشمے اس میں جاری تھے۔ سو وہی کشمیر ہے اسی وجہ سے حضرت مریم کی قبر زمین شام میں کسی کو معلوم نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ وہ بھی حضرت عیسٰے کی طرح مفقود ہے۔ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۱۔

" چونکہ مسیح ابن مریم کے ساتھ ہمیں مشابہت ہے۔ ان کے لئے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وآویناھما الیٰ ربوۃٍ ذات قرارٍ و معین یعنے واقعہ صلیب کے بعد ان کو ایک اونچے ٹیلے پر جگہ دی۔ جہاں آرام کی جگہ اور پانی کے چشمے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اس جگہ یعنی واقعات مسیح ابن مریم میں تو صرف ظل تھا۔ اور یہاں اصل ہے۔ ہم کو ایسی جگہ پناہ دی جہاں یہودیوں کا بس نہیں چل سکتا۔ یعنی سلطنت انگلشیہ کے ماتحت۔ اب یہاں یہودی حملہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے لئے یہ پناہ کی جگہ ہے۔ اور حقائق و معارف کے چشمے یہاں بہ رہے ہیں۔ الحکم ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صدا۱۔

" اور یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل حضرت عیسٰے کے زمانہ میں ہندوستان کے فارس کشمیر کے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے حضرت عیسٰے کا فرض تھا کہ ان کے پاس

پہنچیں اور انہیں خدا کی راہ بتائیں۔ کیونکہ فرض کا ترک کرنا گناہ ہے۔ اور ایسے لوگوں سے اعراض کرنا جو ہادی کی انتظار میں ہوں۔ اور گم کردہ راہوں سے اعراض کرنا بڑا بھاری جرم ہے۔ اور ایسے بدترین جرائم سے انبیاء معصومین کی شان بالاتر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہم اس راستہ کی تصویر دکھاتے ہیں۔ جہاں سے مسیح اپنی ہجرت کے وقت گذرے تھے۔ اور وہ یہ ہے۔



خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جب اللہ تعالے نے حضرت عیسے علیہ السلام کو صلیب کی بلاسے نجات بخشی۔ تو وہ اپنی ماں اور نیز اپنے بعض ساتھیوں کے سمیت کشمیر کی طرف اور اس نے سرسبز و شاداب علاقہ کی طرف ہجرت کی اور اسی کی طرف ہمارے رب نے جو ہمیشہ انبیا کا مددگار اور کمزوروں کا دستگیر رہا ہے واجعلنا ابن مریم وامہ ایۃً وآوینھما الی ربوۃٍ ذات قرارٍ ومعین۔ میں اشارہ کیا ہے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اٰویٰ کا لفظ جس میں سے اوینا نکلا ہے۔ ہمیشہ مصیبت سے نجات کے موقعہ پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور انہی معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بالکل حق بات ہے۔ جس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ اور ایسی بے چین کرنے والی حالت مسیح کے سوانح میں صلیب کے واقعہ کے سوا کہیں نہیں پائی گئی۔ اور تمام دنیا میں کشمیر کے پہاڑوں کے برابر بلند اور سرسبز اور کوئی پہاڑ نہیں۔ اور اس آیت میں قرار کا لفظ ان کے وہاں امن و عافیت کے ساتھ اور کسی مخالف کی مزاحمت کے اندیشے کے بغیر رہائش اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عیسے علیہ السلام کیلئے شام میں کوئی ایسی قرارگاہ نہ تھی۔ اور بدبخت یہود ان کو ایک ملک سے دوسرے ملک کو نکالتے تھے۔ جس کے باعث انہیں خطہ کشمیر کے سوا کہیں امن و عافیت کی قرارگاہ نہ ملی۔ اور اسی بات کی طرف اللہ تعالے نے اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے اور معین کے لفظ میں ان صافی چشموں کی طرف اشارہ ہے۔ جو اس علاقہ میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگ کشمیر کو جنت نظیر کہتے ہیں۔ الھدیٰ صفحہ ۱۱۳

لہ جاننا چاہئے کہ یہ لفظ ایوا اپنے مختلف مشتقات کی صورت میں قرآن کریم میں بہت جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور سب جگہ بطریق احسان بلا سے بچانے ہی کا ذکر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالے فرماتا ہے۔ الم یجدک یتیما فاوٰی جس سے مراد تکلیف کے بعد راحت پہنچانا ہی ہے۔ اور ایک مقام پر فرماتا ہے۔ اذ انتم قلیل مستضعفین فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاوٰکم دیکھو اس میں کس طرح ایوا کی حقیقت کھول کر بتائی گئی ہے۔ اور نوح کے بیٹے کی زبان سے فرماتا ہے

۵۱/۲۳ پھر آپ لوگ خدا تعالےٰ کو اس طرح پر جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ کہ خدا تو کہتا ہے۔ کہ واقعہ صلیب کے بعد عیسےٰ اور اس کی ماں کو ہم نے ایک ٹیلہ پر جگہ دی۔ جس میں صاف پانی بہتا تھا یعنی چشمے جاری تھے۔ بہت آرام کی جگہ تھی۔ اور جنت نظیر تھی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَاٰوَینٰھُمَا اِلیٰ رَبوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِینٍ۔ یعنے ہم نے واقعہ صلیب کے بعد جو ایک بڑی مصیبت تھی عیسےٰ اور اس کی ماں کو ایک بڑے ٹیلہ پر جگہ دی۔ جو بڑے آرام کی جگہ اور پانی خوشگوار تھا۔ یعنی خطۂ کشمیر۔ اب اگر آپ لوگوں کو عربی سے کچھ بھی مس ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ آوی کا لفظ اس موقعہ پر آتا ہے۔ کہ جب کسی مصیبت پیش آمدہ سے بچا کر پناہ دی جاتی ہے۔ یہی محاورہ تمام قرآن شریف میں اور تمام اقوال عرب میں اور احادیث میں موجود ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہے کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو اپنی تمام عمر میں صرف صلیب کی ہی مصیبت پیش آئی تھی۔ اور حدیث سے ثابت ہے کہ مریم کو تمام عمر میں اسی واقعہ سے سخت غم پہنچا تھا۔ پس یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ اس واقعہ صلیب کے بعد خدا تعالےٰ نے اس آفت سے حضرت عیسےٰ کو نجات دیکر اس موذی ملک سے کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں پانی صاف کے چشمے بہتے تھے۔ اور اونچا ٹیلہ تھا۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ کیا آسمان پر بھی کوئی چشمہ دار ٹیلہ ہے۔ جس پر خدا تعالےٰ نے واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیح کو جا بٹھایا اور ماں کو بھی اور حضرت مسیح کے سوانح میں غور کر کے کوئی نظیر تو پیش کرو۔ کہ کسی مصیبت کے بعد انہیں ایسے ملک میں جگہ دی گئی ہو۔ جو آرامگاہ اور جنت نظیر ہو اور بڑا ٹیلہ ہو۔ تمام دنیا سے بلند اور چشمے جاری ہوں۔ پس آپ کے خیال کی رو سے خدا تعالیٰ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲

کہ ساٰوِی اِلیٰ جَبَلٍ یَعصِمُنِی مِنَ المَاءِ اور اس سے اس کا مقصود اس بلا سے دیکھ لینے کے بعد کسی بلند پہاڑ پر چڑھ جانا ہی تھا۔ تو بتاؤ۔ کہ مسیح اور اس کی ماں پر صلیب کے ابتلا سے بڑھکر اور کونسی مصیبت آئی تھی اور کشمیر کے ٹیلے کے سواء اور کونسی جگہ ہے جہیں اس مشکل کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پناہ دی تھی

نعوذ باللہ صریح جھوٹا ٹھیرتا ہے۔ کہ وہ تو صلیب کے بعد ٹیلہ کا ذکر کرتا ہے۔ جس میں عیسٰے اور اس کی ماں کو جگہ دی گئی اور آپ لوگ خواہ نخواہ اس کو آسمان پر بٹھاتے ہیں۔ اور محض بیکار۔ اعجاز احمدی صفحہ ۱۹

" اور اس جگہ یہ بھی یاد رہے۔ کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کا کشمیر کی طرف سفر کرنا ایسا امر نہیں ہے۔ کہ جو بے دلیل ہو۔ بلکہ بڑے بڑے دلائل سے یہ امر ثابت کیا گیا ہے یہاں تک کہ خود لفظ کشمیر بھی اس پر دلیل ہے۔ کیونکہ لفظ کشمیر وہ لفظ ہے۔ جس کو کشمیری زبان میں کشیر کہتے ہیں۔ ہر ایک کشمیری اس کو کشیر بولتا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے۔ کہ دراصل یہ لفظ عبرانی ہے۔ کہ جو کاف اور اشیر کے لفظ سے مرکب ہے۔ اور اشیر عبرانی زبان میں شام کے ملک کو کہتے ہیں۔ اور کاف مماثلت کے لئے آتا ہے۔ پس صورت اس لفظ کی کاشیر تھی یعنی کاف الگ اور اشیر الگ جس کے معنے تھے۔ مانند ملک شام یعنی شام کے ملک کی طرح۔ اور چونکہ یہ ملک حضرت عیسٰے علیہ السلام کی ہجرت گاہ تھا۔ اور وہ سرد ملک کے رہنے والے تھے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے حضرت عیسٰے کو تسلی دینے کے لئے اس ملک کا نام کاشیر رکھدیا۔ جس کے معنے ہیں اشیر کے ملک کی طرح۔ پس کثرت استعمال سے الف ساقط ہو گیا اور کشیر رہ گیا۔ پھر بعد اس کے غیر قوموں نے جو کشمیر کے باشندے نہ تھے۔ اور نہ اس ملک کی زبان رکھتے تھے۔ ایک میم اس میں زیادہ کر کے کشمیر بنا دیا۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ کہ کشمیری زبان میں اب تک کشیری بولا جاتا اور لکھا جاتا ہے ماسوا اس کے کشمیر کے ملک میں اور بہت سی چیزوں کے اب تک عبرانی نام پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض پہاڑوں پر نبیوں کے نام استعمال پا گئے ہیں۔ جن سے سمجھا جاتا ہے کہ عبرانی قوم کسی زمانہ میں ضرور اس جگہ آباد رہ چکی ہے۔ جیسا کہ سلیمان نبی کے نام سے ایک پہاڑ کشمیر میں موجود ہے۔ اور ہم اس مدعا کے ثابت کرنے کے لئے ایک لمبی فہرست اپنی بعض کتابوں میں شائع کر چکے ہیں۔ جو عبرانی الفاظ اور اسرائیلی نبیوں کے نام پر مشتمل ہے۔ جو کشمیر میں اب تک پائے جاتے ہیں۔ اور کشمیر کی تاریخی کتابیں جو ہمنے

بڑی محنت سے کی ہیں۔ جو ہمارے پاس موجود ہیں ان سے بھی معقولاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں اس وقت شمار کی رُو سے دو ہزار برس کے قریب گذر گیا ہے۔ ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا۔ جو بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اور شہزادہ نبی کہلاتا تھا۔ اس کی قبر محلہ خان یار میں ہے جو یوز آسف کی قبر کر کے مشہور ہے ؎

اب ظاہر ہے کہ یہ کتابیں تو میری پیدائش سے بہت پہلے کشمیر میں شائع ہو چکی ہیں۔ پس کیونکر کوئی خیال کر سکتا ہے کہ کشمیریوں نے افترا کے طور پر یہ کتابیں لکھی تھیں۔ ان لوگوں کو اس افترا کی کیا ضرورت تھی۔ اور کس غرض کیلئے انہوں نے ایسا افترا کیا۔ اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ اب تک اپنی کمال سادہ لوحی سے۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ حضرت عیسٰے آسمان پر معہ جسم عنصری چلے گئے۔ اور پھر باوجود اس اعتقاد کے پورے یقین سے اس بات کو جانتے ہیں کہ ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا۔ کہ جو اپنے تئیں شہزادہ نبی کر کے مشہور کرتا تھا۔ اور انکی کتابیں تبلاتی ہیں کہ شمار کی رُو سے اس زمانہ کو اب اُنیس سو برس سے کچھ زیادہ برس گذر گئے۔ تو وہ کبھی ہمیں یہ کتابیں نہ دکھلاتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہم نے ان کی سادہ لوحی سے بڑا فائدہ اُٹھایا۔

ماسوا اس کے وہ لوگ شہزادہ نبی کا نام یوز آسف بیان کرتے ہیں۔ یہ لفظ صریح معلوم ہوتا ہے کہ یسوع آصف کا بگڑا ہوا ہے۔ آسف عبرانی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو قوم کو تلاش کرنے والا ہو۔ چونکہ حضرت عیسٰے اپنی اس قوم کو تلاش کرتے کرتے جو بعض فرقے یہودیوں میں سے گم تھے کشمیر میں پہنچے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنا نام یسوع آصف رکھا تھا۔ اور یوز آصف کی کتاب میں صریح لکھا ہے کہ یوز آصف پر خدا تعالےٰ کی طرف سے انجیل اتری تھی۔

پس باوجود اس قدر دلائل واضح کے کیونکر اس بات سے انکار کیا جائے۔ کہ یوز آصف در اصل حضرت عیسٰے علیہ السلام نہیں ہے۔ ورنہ یہ بار ثبوت ہمارے مخالفوں کی گردن پر ہے۔ کہ وہ کون شخص ہے جو اپنے تئیں شہزادہ نبی ظاہر کرتا تھا جس کا زمانہ حضرت عیسٰے کے زمانہ سے بالکل مطابق ہے۔ اور یہ پتہ بھی ملتا ہے کہ جب حضرت عیسٰے کشمیر میں آئے۔ تو اس زمانہ کے بدھ مذہب والوں نے اپنی پستکوں میں ان کا کچھ ذکر کیا ہے ؎

ایک اور قوی دلیل اس بات پر یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اٰویناھما الیٰ ربوۃ ذات قرار و معین یعنے ہم نے عیسٰے اور اس کی ماں کو ایک ایسے ٹیلے پر پناہ دی جو آرام کی جگہ تھی۔ اور ہر ایک دشمن کی دست درازی سے دُور تھی۔ اور پانی اس کا بہت خوشگوار تھا۔

یاد رہے کہ اوٰی کا لفظ عربی زبان میں اس جگہ بولا جاتا ہے۔ جب ایک مصیبت کے بعد کسی شخص کو پناہ دیتے ہیں۔ ایسی جگہ میں جو دار الامان ہوتا ہے۔ پس وہ دار الامان ملک شام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ملک شام قیصر روم کی عملداری میں تھا۔ اور حضرت عیسٰے قیصر کے باغی قرار پا چکے تھے۔ پس وہ کشمیر ہی تھا۔ جو شام کے ملک سے مشابہ تھا۔ اور قرار کی جگہ تھی یعنی اس کی جگہ تھی یعنی قیصر روم کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم ص ۲۲۴

۷۱ و ۷۲ / ۲۳ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ بَلۡ جَآءَہُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَکۡثَرُہُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ ﴿۰﴾ وَ لَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَہۡوَآءَہُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ بَلۡ اَتَیۡنٰہُمۡ بِذِکۡرِہِمۡ فَہُمۡ عَنۡ ذِکۡرِہِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے۔ نہیں بلکہ بات تو یہ ہے کہ خدا نے ان کی طرف حق بھیجا اور وہ حق کے قبول کرنے سے کراہت کر رہے ہیں۔ اور اگر خدا انکی خواہشوں کی پیروی کرتا تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب بگڑ جاتا۔ بلکہ ہم ان کے لئے وہ ہدایت لائے ہیں جس کے وہ محتاج ہیں۔ سو جس ہدایت کے وہ محتاج ہیں اس سے کنارہ کر رہے ہیں۔ براہین احمدیہ ص ۲۲۱

۹۲ / ۲۳ مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّ مَا کَانَ مَعَہٗ مِنۡ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَہَبَ کُلُّ اِلٰہٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۰﴾

نیز اگر الگ الگ خالق ہوتے تو ہر واحد ان میں سے اپنی ہی مخلوق کی بھلائی

چاہتا اور ان کے آرام کے لئے دوسروں کا برباد کرنا روا رکھتا۔ پس یہ بھی موجب فساد عالم ٹھیرتا۔ براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۳

۹۶/۲۳ وَاِنَّا عَلٰٓی اَنْ نُّرِیَكَ مَا نَعِدُھُمْ لَقٰدِرُوْنَ ○

اور ہم اس بات پر قادر ہیں۔ کہ جو کچھ ہم ان کی نسبت وعدہ کرتے ہیں۔ وہ تجھے دکھلائیں :۔ براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۰

۹۷/۲۳ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ○ آیت ۳۵/۴۱

خدا تعالےٰ قرآن شریف میں پیشدستی کرکے لڑائی کرنا ایک سخت مجرمانہ فعل قرار دیتا ہے۔ بلکہ مومنوں کو جا بجا صبر کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ وہ اس آیت میں فرماتا ہے یعنی تیرا دشمن جو تجھ سے بدی کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کر اگر تو نے ایسا کیا۔ تو وہ تیرا ایسا دوست ہو جائیگا کہ گویا رشتہ دار بھی ہے۔ لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۲۴

" دیکھیے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو تیرہ ۱۳ برس تک جور و ستم سہنے پڑے اور پھر مدافعت کا حکم دیا گیا۔ اذن للذین یقٰتلون بانھم ظلموا سے ظاہر ہے۔ کہ پہلے جواب تک دینے کا بھی حکم نہیں تھا۔ اس لئے دو اصل فرمائے ایک تو اعرض عن الجاھلین جن لوگوں میں جہالت کا مادہ ہو۔ جو تکبر سے بھرے ہوئے جھگڑالو ہوں ان سے اعراض کرنا چاہیئے۔ ان کی باتوں کا جواب ہی نہ دیا جاوے۔ دوم ادفع بالتی ھی احسن یعنی بدی کے مقابلہ میں نیکی کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوست بن جاتا ہے اور دوست بھی ایسا کانہ ولی حمیم آیت ۳۵/۴۱ بدر ۱۱۔ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۶

۱۰۰ و ۱۰۱/۲۳ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○

لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا ؕ اِنَّہَا کَلِمَۃٌ ہُوَ قَآئِلُہَا ؕ وَمِنْ وَّرَآئِہِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝

یعنی جب کافروں میں سے ایک کو موت آتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے۔ کہ اے میرے رب مجھ کو پھر دنیا میں بھیج۔ تاکہ میں نیک عمل کروں۔ اور تدارک مافات مجھ سے ہو سکے۔ تو اسکو کہا جاتا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ صرف اس کا قول ہے یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتدا سے کوئی بھی وعدہ نہیں کہ مردہ کو پھر دنیا میں بھیجے۔ اور پھر آگے فرمایا۔ کہ جو لوگ مر چکے ہیں۔ ان میں اور دنیا میں ایک پردہ ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قیامت تک دنیا کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ ازالہ اوہام صفحہ ۹۴۲ حاشیہ الف۔

سُوْرَۃُ النُّوْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰیَۃً

۵/۲۴ وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجْلِدُوْہُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَہُمْ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

یعنی جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔ اور اس تہمت کے ثابت کرنے کے لئے چار گواہ نہ لا سکیں۔ تو ان کو اسی دُرّے مارو۔ اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ اور یہ لوگ آپ ہی بدکار ہیں۔ تریاق القلوب ص۲۲

"جو لوگ ایسی عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں۔ جن کا زناکار ہونا ثابت نہیں بلکہ مستور الحال ہیں۔ اگر وہ لوگ چار گواہ سے اپنے اس الزام کو ثابت نہ کریں تو ان کو اسی

کوڑے مارنے چاہئیں۔ اب دیکھو کہ ان عورتوں کا نام خدا نے بری رکھا ہے۔ جن کا زانیہ ہونا ثابت نہیں۔

خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ میں بارِ ثبوت تہمت لگانے والے پر رکھا ہے۔ اور جب تک تہمت لگانے والا کسی گناہ کو ثابت نہ کرے۔ تب تک تمام مردوں اور عورتوں کو بری کہلانے کا مستحق ٹھیرایا ہے۔ تریاق القلوب صـ۱۳۶

۲۲/۲۴ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

یعنی لوگوں کے گناہ بخشو۔ اور ان کی زیادتیوں اور قصوروں کو معاف کرو۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا بھی تمہیں معاف کرے۔ اور تمہارے گناہ بخشے۔ اور وہ تو غفور الرحیم ہے۔

اور انجیل نے بھی صبر اور عفو کی تعلیم دی ہے۔ مگر اکثر لوگوں کو شاید یہ بات یاد نہیں ہوگی کہ حضرت عیسےٰ انجیل میں فرماتے ہیں۔ کہ مجھے دوسری قوموں سے سروکار نہیں۔ میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔ یعنی میری ہمدردی صرف یہودیوں تک محدود ہے۔ مگر قرآن شریف میں صاف لکھا ہے۔ کہ دوسری قوموں سے بھی ہمدردی کرو۔ جیسا کہ اپنی قوم کے لئے۔ اور دوسری قوموں کو بھی معاف کرو۔ جیسا کہ اپنی قوم کو۔

لیکچر چشمہ معرفت صـ۱۶

۲۶/۲۴ اُولٰۗىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ

یہ اس مقام کی آیت ہے۔ کہ جہاں بے لوث اور بیگناہ ہونا ایک کا ایک کے وقت تک مشتبہ رہا۔ پھر خدا نے اس کی طرف سے ڈلفنس پیش کر کے اس کی بریت کی۔ تریاق القلوب صفحہ ۱۳۵

۲۷ و ۲۸/۲۴ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ

بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ
اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا
هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ○

اور دوسرے گھروں میں وحشیوں کیطرح خود بخود بے اجازت نہ چلے جانا اجازت لینا شرط ہے۔ اور جب تم دوسرے کے گھروں میں جاؤ تو داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہو اور اگر ان کے گھروں میں کوئی نہ ہو۔ تو جب تک کوئی مالک خانہ تمہیں اجازت نہ دے۔ ان گھروں میں مت جاؤ۔ اور اگر مالک خانہ یہ کہے کہ واپس چلے جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ۔

فلاسفی صفحہ ۲۶

۳۱/۲۴ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا
فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ

یہ خدا ہی کا کلام ہے جس نے اپنے کھلے ہوئے اور نہایت واضح بیان سے ہم کو ہمارے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں حدود معینہ مشخصہ پر قائم کیا۔ اور ادب انسانیت اور پاک روشنی کا طریقہ سکھلایا وہی ہے جس نے آنکھ اور کان اور زبان وغیرہ اعضا کی محافظت کے لئے بکمال تاکید فرمایا۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجہم ذالک ازکی لھم۔ یعنی مومنوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو نامحرموں سے بچاویں۔ اور ہر ایک نادیدنی اور ناشنیدنی اور ناکردنی سے پرہیز کریں کہ یہ طریقہ ان کی اندرونی پاکی کا موجب ہوگا۔ یعنی ان کے دل طرح طرح کے جذبات نفسانیہ سے محفوظ رہیں گے۔ کیونکہ اکثر نفسانی جذبات کو حرکت دینے والے اور قویٰ بہیمیہ کو فتنے میں ڈالنے والے یہی اعضا ہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن شریف نے نامحرموں سے بچنے کے لئے کیسی تاکید فرمائی۔ اور کیسے کھول کر بیان کیا۔ کہ ایمان دار لوگ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو ضبط میں رکھیں۔ اور ناپاکی کے مواضع سے

روکتے رہیں۔ براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۲۔

" مومنین کو کہدے کہ اپنی آنکھیں نامحرموں سے بند رکھیں۔ اور اپنی ستر گاہوں کو اور کانوں کو نالائق امور سے بچاویں۔ یہی انکی پاکیزگی کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ہر ایک مومن کے لئے منہیات سے پرہیز کرنا اور اپنے اعضا کو ناجائز افعال سے محفوظ رکھنا لازم ہے۔ اور یہی طریق اس کی پاکیزگی کا دار و مدار ہے۔

براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۵

" پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے۔ ایسا ہی ایماندار عورتوں سے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کو دیکھنے سے بچاویں۔ یعنی انکی پُر شہوات آوازیں نہ سُنیں اور اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں۔ اور اپنے زینت کے اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں۔ کہ گریبان سے ہو کر سر پر آجائے۔ یعنی گریبان اور دونو کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں۔ اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کیطرح نہ ماریں۔ یہ وہ تدبیر ہے۔ کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے۔

اسلامی اصُول کی فلاسفی صفحہ

" یعنی ایمانداروں کو جو مرد ہیں۔ کہدے۔ کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں۔ جو شہوت کا محل ہو سکتی ہوں اور ایسے مواقعہ پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں۔ اور اپنے ستر کی جگہ کو جسطرح ممکن ہو بچاویں ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچاویں۔ یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحان آوازیں نہ سُنیں۔ ان کے حُسن کے قصّے نہ سنیں۔ یہ طریق یعنی مومنوں کو کہدے کہ نامحرم کو دیکھنے سے اپنی آنکھوں کو بند رکھیں۔ اور اپنے کانوں اور ستر گاہوں کی حفاظت کریں۔ یعنی کان کو بھی ان کی نرم باتوں اور انکی خوبصورتی کے قصوں سے بچاویں کہ یہ

سب طریق ٹھوکر کھانے گئے ہیں۔ اب اگر بے ایمانی کے زہر دل میں نہیں، تو ایسی تعلیم سے یسوع کی تعلیم کا مقابلہ کرو۔ اور پھر نتائج پر بھی نظر ڈالو۔ یسوع کی تعلیم نے عام آزادگی کی اجازت دیکر اور تمام ضروری شرائط کو نظر انداز کر کے تمام یورپ کو ہلاک کر دیا یہاں تک کہ ان سب میں خنزیروں اور کتوں کی طرح فسق و فجور پھیلا۔ اور بےحیائی اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ شیرینی اور ولایت کی مٹھائیوں پر بھی یہ لفظ لکھے جاتے ہیں۔ کہ اے میری پیاری ذرا مجھے بوسہ دے۔ یہ تمام گناہ کس کی گردن پر ہے۔ بیشک اس یسوع کی گردن پر جس نے ایسی تعلیم دی۔ کہ ایک جوان مرد یا عورت دوسرے پر نظر ڈالے مگر زنا کا قصد نہ کرے۔ اے نادان کیا زنا کا قصد اختیار میں ہے۔ جو شخص آزادی سے نامحرم عورتوں کو دیکھتا رہیگا۔ وہ ایکدن بدنیتی سے بھی دیکھیگا۔ کیونکہ نفس کے جذبات ہر ایک طبیعت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اور تجربہ بلند آواز سے بلکہ چیخیں مار کر ہمیں بتلا رہا ہے۔ کہ بیگانہ عورتوں کو دیکھنے میں ہرگز انجام بخیر نہیں ہوتا۔ نور القرآن حصہ دوم صفحہ ۲۶۔

" یاد رہے کہ بمقابل نیوگ کی ہدایت کے قرآن شریف میں بیویوں کے لئے پردہ کی ہدایت ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم (یعنی مومنوں کو کہدے۔ مرد ہوں یا عورتیں کہ اپنی آنکھوں کو غیر عورتوں اور مردوں کی طرف دیکھنے سے روکو۔ اور کانوں کو غیر مردوں کی ناجائز آواز اور غیر کی آواز سننے سے روکو اور اپنے ستر گاہوں کی حفاظت کرو۔ کہ اس طریق سے تم پاک ہو جاؤگے۔

اب اے آریہ صاحبان انصاف سے سوچو کہ قرآن شریف تو اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ کوئی مرد غیر عورت پر نظر ڈالے اور یا عورت غیر مرد پر نظر ڈالے یا اس کی آواز ناجائز طور پر سنے۔ مگر آپ لوگ خوشی سے اپنی بیویوں کو غیر مردوں سے ہم بستر کراتے ہیں یا اس کا نام نیوگ رکھتے ہیں۔ کس قدر ان دونوں تعلیموں میں فرق ہے۔

نسیم دعوت صفحہ ۷۷

"قرآن نے چونکہ کل ملل اور قوموں کو زیر نظر رکھ لیا۔ اور تمام ضرورتیں اس تک پہنچکر ختم ہو گئی تہیں۔ اس لئے قرآن نے عقائد کو بھی اور احکام عملی کو بھی مدلل کیا چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم یعنے مومنوں سے کہدے۔ کہ اپنے ستر کو آنکھ پہاڑ کر نہ دیکھیں۔ اور باقی تمام فروج کی بھی حفاظت کریں۔ لازم ہے۔ کہ انسان چشم خوابیدہ ہو تاکہ غیر محرم عورت کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑے کان بھی فروج میں داخل ہیں۔ جو قصص سُنکر فتنہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر فرمایا کہ تمام موریوں کو محفوظ رکھو اور کہا۔ کہ بالکل بند رکھو۔ ذالک ازکیٰ لھم یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے۔ اور یہ طریق اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی رکھتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے بدکاروں میں نہ ہو سکے۔ تحفہ سالانہ صفحہ"

"یعنی مومنوں کو کہدے کہ نامحرم اور محل شہوت کے دیکھنے سے اپنی آنکھیں اس قدر بند رکھیں۔ کہ پوری صفائی سے چہرہ نظر نہ آسکے۔ اور نہ چہرہ پر کشادہ اور بے روک نظر پڑ سکے۔ اور اس بات کے پابند رہیں۔ کہ ہرگز آنکھ کو پورے طور پر کھول کر نہ رکھیں نہ شہوت کی نظر سے اور نہ بغیر شہوت سے کیونکہ ایسا کرنا آخر ٹھوکر کا باعث ہے۔ یعنی بے قیدی کی نظر سے نہایت پاک حالت محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور آخر ابتلا پیش آتا ہے اور دل پاک نہیں ہو سکتا۔ جب تک آنکھ پاک نہ ہو۔ اور وہ مقام ازکیٰ جس پر طالب حق کے لئے قدم مارنا مناسب ہے۔ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اس آیت میں یہ بھی تعلیم ہے کہ بدن کے ان تمام سوراخوں کو محفوظ رکھیں۔ جن کی راہ سے بدی داخل ہو سکتی ہے۔ سوراخ کے لفظ میں جو آیت ممدوح میں مذکور ہے۔ آلات شہوت اور کان اور ناک اور منہ سب داخل ہیں۔ اب دیکھو کہ یہ تمام تعلیم کس شان اور پایہ کی ہے۔ جو کسی پہلو پر نامعقول طور پر افراط یا تفریط سے زور نہیں ڈالا گیا۔ اور حکیمانہ اعتدال سے کام لیا گیا ہے اور اس آیت کا پڑھنے والا فی الفور معلوم کرے گا۔ کہ اس حکم سے جو کھلے کھلے نظر ڈالنے کی عادت نہ ڈالو۔ یہ مطلب ہے۔ کہ تا لوگ کسی وقت فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور دونو

طرف مرد اور عورت میں سے کوئی فریق ٹھوکر نہ کھاوے۔ لیکن انجیل میں جو بیقیدی اور کھلی آزادی دی گئی ہے۔ اور صرف انسان کی مخفی نیت پر مدار رکھا گیا ہے۔ اس تعلیم کا نقص اور خامی الہام نہیں ہے۔ کہ اسکی تصریح کی کچھ ضرورت ہو۔ تریاق القلوب ص۲۰)

۳۱/۲۴ قرآن شریف نے (جو کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں اور کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر حسب حال تعلیم دیتا ہے) کیا مسلک عمدہ اختیار کیا ہے۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذالک ازکیٰ لھم کہ تو ایمان والوں سے کہدے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں۔ اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں۔ یہ وہ عمل ہے۔ جس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوگا۔ فروج سے مراد شرمگاہ ہی نہیں۔ بلکہ ہر ایک سوراخ جس میں کان وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور اس میں اس امر کی مخالفت کی گئی ہے کہ غیر محرم عورت کا راگ وغیرہ نہ سنا جاوے۔ پھر یاد رکھو کہ ہزار در ہزار تجارب سے یہ ثابت شدہ بات ہے۔ کہ جن باتوں سے اللہ تعالےٰ روکتا ہے۔ آخر کار انسان کو ان سے رکنا ہی پڑتا ہے ؎

ہرچہ دانا کنند۔ کنند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ہمیں افسوس ہے کہ آریہ صاحبان بھی بے پردگی پر زور دیتے ہیں۔ اور قرآن شریف کے احکام کی مخالفت چاہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کا یہ بڑا احسان ہندوستان پر ہے کہ اس نے ان کو تہذیب سکھائی۔ اور اس کی تعلیم ایسی ہے۔ جس سے مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ خربتہ بہ گرچہ دزد آشنا ہست۔ یہی حالت مرد اور عورت کے تعلقات کی ہے۔ کہ اگرچہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن تاہم فطری جوش اور تقاضے بعض اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ جب ان کو ذراسی تحریک ہوئی تو جھٹ پٹ حد اعتدال سے ادھر اُدھر ہو گئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں حد درجہ کی آزادی وغیرہ کو ہرگز دخل نہ دیا جاوے۔ ذرا اپنے دلوں میں غور کرو۔ کہ کیا تمہارے دل راجہ رامچندر اور کرشن وغیرہ کی طرح پاک ہو گئے ہیں۔ پھر جب وہ پاک دلی تم کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو

بے پردگی کو رواج دیکر بکریوں کو شیروں کے آگے کیوں رکھتے ہو۔ ہٹ اور ضد اور تعصب اور چڑ وغیرہ سے تم دیدہ دانستہ اسلام کے ان پاکیزہ اصول کی مخالفت کیوں کرتے ہو جن سے تمہاری عفت برقرار رہتی ہے۔ عقل تو اس بات کا نام ہے کہ انسان کو نیک بات جہاں سے ملے وہ لے لیوے۔ کیونکہ نیک بات کی مثال سونے اور ہیرے اور جواہر کی ہے۔ اور یہ اشیا خواہ کہیں ہوں۔ آخر وہ سونا ہی ہوں گے۔ اس لئے تم کو لازم ہے کہ اسلام کے نام سے چڑ کر تم نیکی کو ترک نہ کرو۔ ورنہ یاد رکھو کہ اسلام کا تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اور اگر اس کا ضرر ہے تو تم کو ہی ہے۔ ہاں اگر تم لوگوں کو یہ اطمینان ہے۔ کہ سب کے سب بھگت بن گئے ہو۔ اور نفسانی جذبات پر تم کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور قوی پرمیشر کی رضا اور احکام کے برخلاف بالکل حرکت نہیں کرتے۔ تو پھر ہم تمکو منع نہیں کرتے۔ تو بے شک بے پردگی کو رواج دو۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک تم کو وہ حالت نصیب نہیں اور تم میں سے جس قدر لوگ لیڈر بن کر قوم کی اصلاح کے درپے ہیں۔ ان کی مثال سفید قبر کی ہے جس کے اندر بجز ہڈیوں کے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ ان کی صرف باتیں ہی ہیں۔ عمل وغیرہ کچھ نہیں۔

اسلام نے جو یہ حکم دیا ہے۔ کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پردہ کرے اس سے غرض یہ ہے۔ کہ نفس انسان پھسلنے اور ٹھوکر کھانے سے بچا رہے۔ کیونکہ ابتدا میں اسکی یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ وہ بدیوں کی طرف جھکا رہتا ہے۔ اور ذرا سی بھی تحریک ہو تو بدی پر ایسا گرتا ہے۔ جیسے کئی دن کا بھوکا آدمی کسی لذیذ کھانے پر۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کرے۔ (تقریروں کا مجموعہ صفحہ ۵۱)

۳۴/۲۴ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا

اور جسکو نکاح میسر نہ آوے چاہئے کہ وہ اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچاوے۔ مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے۔ یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے۔

(اصول اسلام کی فلاسفی صفحہ ۱۸)

" یعنی جو لوگ نکاح کی طاقت نہ رکھیں جو پرہیزگار رہنے کا اصل ذریعہ ہے تو انکو چاہیئے۔ کہ اور تدبیروں سے طلب عفت کریں۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ جو نکاح کرنے پر قادر نہ ہو۔ اس کے لئے پرہیزگار رہنے کے لئے یہ تدبیر ہے۔ کہ وہ روزے رکھا کرے اور وہ یہ ہے۔ یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطیع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاءٌ صحیح مسلم وبخاری۔

یعنی اے جوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو تو چاہیئے کہ وہ نکاح کرے۔ کیونکہ نکاح آنکھوں کو خوب نیچا کرتا ہے۔ اور شرم کے اعضا کو زنا وغیرہ سے بچاتا ہے۔ ورنہ روزہ رکھو کہ وہ خصی کر دیتا ہے۔ آریہ دھرم صفحہ ۱۹

۳۶/۲۴ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِہٖ
کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ
اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ
مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ
زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ
یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ
الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۙ

خدا آسمان و زمین کا نور ہے۔ یعنی ہر ایک نور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے۔ خواہ وہ ارواح میں ہے خواہ اجسام میں اور خواہ ذاتی ہے۔ اور خواہ عرضی۔ اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ ذہنی۔ خواہ خارجی ہے۔ اسی کے فیض کا عطیہ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت رب العالمین کا فیض عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے۔ اور کوئی اس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے۔ اور تمام انوار کا علت العلل اور تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اسی کی ہستی حقیقی تمام عالم کی قیوم اور تمام زیر و زبر کی پناہ ہے۔ وہی ہے جس نے ہر ایک

چیز کو ظلمت خانہ عدم سے باہر نکالا۔ اور خلعتِ وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حد ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو۔ یا اس سے مستفیض نہ ہو۔ بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور روح اور جسم سب اسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اللہ نور السمٰوات والارض میں ظاہر فرمایا گیا۔ یہی فیضان ہے جس نے دائرے کی طرح ہر ایک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائض ہونے کے لئے کوئی قابلیت شرط نہیں۔ لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے۔ جو مشروط بہ شرائط ہے۔ اور انہی افرادِ خاصہ پر فائض ہوتا ہے۔ جن میں اس کے قبول کرنے کی قابلیت و استعداد موجود ہے۔ یعنی نفوسِ کاملہ انبیاء علیہم السلام پر جن میں سے افضل و اعلےٰ ذات جامع البرکات حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ دوسروں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائق حکمیہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے۔ اس لئے خداوند تعالےٰ نے اوّل فیضان عام کو (جو بدیہی الظہور ہے) بیان کر کے پھر اس فیضانِ خاص کو بہ غرض اظہار کیفیت نور حضرت خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اس آیت سے شروع ہوتی ہے۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ الخ اور بطور مثال اس لئے بیان کیا۔ کہ تا اس دقیقہ نازک کے سمجھنے میں ابہام اور دقت باقی نہ رہے۔ کیونکہ معانیٔ معقولہ کو صورِ محسوسہ میں بیان کرنے سے ہر ایک غبی و بلید بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ بقیہ ترجمہ آیات مندرجہ یہ ہے۔ اس نور کی مثال (فرد کامل میں جو پیغمبر ہے) یہ ہے۔ جیسے ایک طاق (یعنے سینہ مشروح حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور طاق میں ایک چراغ (یعنی وحی اللہ) اور چراغ ایک شیشے کی قندیل میں جو نہایت مصفا ہے۔ (یعنے نہایت پاک اور مقدس دل میں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل ہے جو کہ اپنی اصل فطرت میں شیشۂ سفید اور صافی کی طرح ہر ایک طور کی کثافت اور کدورت سے منزہ اور مطہر ہے۔ اور تعلقاتِ ماسوے اللہ سے بکلی پاک ہے) اور شیشہ ایسا صاف کہ گویا ان ستاروں میں سے ایک عظیم النور ستارہ ہے۔ جو کہ آسمان پر بڑی

آب وتاب کے ساتھ چمکتے ہوئے نکلتے ہیں۔ جن کو کوکب دُرّی کہتے ہیں (یعنے حضرت خاتم الانبیاء کا دل ایسا صاف کہ کوکب دُرّی کی طرح نہایت منوّر اور درخشندہ جس کی اندرونی روشنی اُس کے بیرونی قالب پر پانی کیطرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ چراغ کے زیتون کے شجرۂ مبارکہ سے (یعنے زیتون کے روغن سے) روشن کیا گیا ہے (شجرۂ مبارکہ زیتون سے مراد وجود مبارک محمدی ہے۔ کہ جو بوجہ نہایت جامعیت وکمال انواع واقسام کی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا فیض کسی جہت ومکان وزمان سے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام لوگوں کے لئے عام علےٰ سبیل الدوام ہے۔ اور ہمیشہ جاری ہے۔ کبھی منقطع نہیں ہوگا) اور شجرہ مبارکہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنے طینت پاک محمدی میں نہ افراط ہے۔ نہ تفریط۔ بلکہ نہایت توسط واعتدال پر واقع ہے۔ اور احسن تقویم پر مخلوق ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اس شجرہ مبارکہ کے روغن سے چراغ وحی روشن کیا گیا ہے۔ سو روغن سے مراد عقلِ لطیف نورانی محمدی معہ جمیع اخلاق فاضلہ فطرتیہ ہے۔ جو اُس عقلِ کامل کے چشمۂ صافی سے پروردہ ہیں۔ اور وحی کا چراغ لطائف محمدیہ سے روشن ہونا ان معنوں کر کے کہ اُن لطائف قابلہ پر وحی کا فیضان ہوا۔ اور ظہور وحی کا موجب وہی ٹھیرے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ فیضان وحی اُن لطائف محمدیہ کے مطابق ہوا۔ اور انہیں اعتدالات کے مناسب حال ظہور میں آیا۔ کہ جو طینت محمدیہ میں موجود تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ہر ایک وحی نبی منزّل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسےٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السّلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی۔ سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاج بنہایت درجہ وضع استقامت پر واقعہ تھا۔ نہ ہر جگہ حلم پسند تھا۔ اور نہ ہر مقام غضب مرغوبِ خاطر تھا۔ بلکہ حکیمانہ طور پر رعایتِ محل اور موقعہ کی ملحوظِ طبیعت مبارک تھی۔ سو قرآن شریف بھی اسی طرز موزون ومعتدل پر نازل ہوا۔ کہ جامع شدت ورحمت وہیبت وشفقت ونرمی ودرشتی ہے۔ سو اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا

کہ چراغ وحی فرقان اس شجرہ مبارکہ سے روشن کیا گیا ہے۔ کہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی یعنی طینتِ معتدلہ محمدیہ کے موافق نازل ہوا ہے۔ جس میں نہ مزاج موسوی کی طرح درشتی ہے نہ مزاج عیسوی کی مانند نرمی۔ بلکہ درشتی اور نرمی اور قہر اور لطف کا جامع ہے۔ اور مظہر کمال اعتدال اور جامع بین الجلال والجمال ہے۔ اور اخلاق معتدلہٴ فاضلہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جو بمعیتِ عقل لطیف روغنِ ظہور روشنئے وحی قرار پائی۔ اُن کی نسبت ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اور وہ یہ ہے۔ اِنّکَ لعلیٰ خلق عظیم نمبر ۲۹۔ یعنے تو اے نبی ایک خلق عظیم پر مخلوق ومفطور ہے۔ یعنی اپنی ذات میں تمام مکارم اخلاق کا ایسا متمم ومکمل ہے۔ کہ اُس پر زیادت متصوّر نہیں۔ کیونکہ لفظ عظیم محاورہ عرب میں اُس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے۔ جس کو اپنا نوعی کمال پورا پورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے۔ تو اس کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ جس قدر طول وعرض درخت میں ہو سکتا ہے۔ وہ سب اس میں موجود ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے۔ کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اُس حد تک پہنچ جائے۔ کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو۔ اور خُلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حسن اختلاط یا نرمی وتلطّف وملائمت (جیسا عوام الناس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے۔ بلکہ خَلق بفتح خا اور خُلق بضم خا دو لفظ ہیں۔ جو ایک دوسرے کے مقابل واقعہ ہیں۔ خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورتِ ظاہری ہے۔ جو انسان کو حضرت واہب الصور کی طرف سے عطا ہوئی۔ جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے متمیّز ہے۔ اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورتِ باطنی یعنے خواص اندرونی ہیں۔ جن کے رو سے حقیقتِ انسانیہ حقیقتِ حیوانیہ سے امتیاز کلی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں۔ اور شجرۂ انسانیت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں۔ اُن سب کا نام خُلق ہے اور چونکہ شجرۂ فطرت انسانی میں توسّط اور اعتدال پر واقعہ ہے۔ اور ہر ایک افراط

وتفریط سے جو قویٰ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے۔ منزہ ہے۔ جس کی طرف اللہ تعالےٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم الخ نمبر۳ اسلئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمت کی قید کے بغیر بولا جائے۔ ہمیشہ اخلاق فاضلہ مراد ہوتے ہیں اور وہ اخلاق فاضلہ جو حقیقت انسانیہ ہے۔ تمام وہ خواص اندرونی ہیں۔ جو نفس ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں جیسے عقل۔ ذکا۔ سرعت فہم۔ صفائے ذہن۔ حسن تحفظ۔ حسن تذکر۔ عفت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورع۔ جوانمردی۔ استقلال۔ عدل۔ امانت صدق۔ لہجہ۔ سخاوت فی محلہ۔ ایثار فی محلہ۔ کرم فی محلہ۔ مروت فی محلہ۔ شجاعت فی محلہ علو ہمت فی محلہ۔ حلم فی محلہ۔ تحمل فی محلہ۔ حمیت فی محلہ۔ تواضع فی محلہ۔ ادب فی محلہ شفقت فی محلہ۔ رافت فی محلہ۔ رحمت فی محلہ۔ خوفِ الٰہی۔ محبت الٰہیہ۔ انس باللہ انقطاع الی اللہ وغیرہ وغیرہ) اور تیل ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ (یعنے عقل اور جمیع اخلاقِ فاضلہ اُس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیت ولطافت و نورانیت پر واقع کہ الہام سے پہلے ہی خود بخود روشن ہونے پر مستعد تھے) نورٌ علیٰ نور نور فائض ہوا نور پر (یعنے جب کہ وجودِ مبارک حضرت خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کئی نور جمع تھے۔ سو اُن نوروں پر ایک اور نور آسمانی جو وحی الٰہی ہے وارد ہو گیا اور اس نور کے وارد ہونے سے وجود باوجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا پس اس میں یہ اشارہ فرمایا کہ نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے۔ کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے۔ تاریکی پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ فیضان کے لئے مناسبت شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں۔ بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے۔ اور حکیم مطلق بغیر رعایت مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ ایسا ہی فیضانِ نور میں بھی اس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے۔ اُسی کو اور نور بھی دیا جاتا ہے۔ اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے۔ وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں۔ وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے۔ اور جسکو فطرتی نور کم ملا ہے۔ اس کو دوسرا نور بھی کم ملتا ہے۔ اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے

اُس کو دوسرا نور بھی زیادہ ملتا ہے۔ اور انبیاء منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرت انسانی کے وہ افراد عالیہ ہیں۔ جن کو اس کثرت اور کمال سے نور باطنی عطا ہوا ہے۔ کہ گویا وہ نور مجسم ہو گئے ہیں۔ اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نور اور سراج منیر رکھا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین الجزو نمبر ۶ وداعیا الی اللہ باذنہ وسراجا منیرا الجزو نمبر ۲۲ یہی حکمت ہے۔ کہ نور وحی جس کے لئے نور فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے۔ صرف انبیاء کو ملا۔ اور انہیں سے مخصوص ہوا۔ پس اب اس تحقیق سے ثابت ہے کہ جو مثال مقدم الذکر میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ بطلان اُن لوگوں کے قول کا ظاہر ہے۔ جنہوں نے باوصف اس کے کہ فطرتی تفاوت مراتب کے قائل ہیں۔ پھر محض حمق وجہالت کی راہ سے یہ خیال کر لیا ہے۔ کہ جو نور افرادِ کامل الفطرت کو ملتا ہے۔ وہی نور افرادِ ناقصہ کو بھی مل سکتا ہے۔ ان کو دیانت اور انصاف سے سوچنا چاہئے کہ فیضان وحی کے بارے میں کس قدر غلطی میں وہ مبتلا ہو رہے ہیں۔ صریح دیکھتے ہیں۔ کہ خدا کا قانونِ قدرت اُن کے خیال باطل کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر شدّتِ تعصّب وعناد سے اُسی خیالِ فاسد پر جمے بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی عیسائی لوگ بھی نور کے فیضان کے لئے فطرتی نور کا شرط ہونا نہیں مانتے۔ اور کہتے ہیں کہ جس دل پر نور وحی نازل ہو اُس کے لئے اپنے کسی خاص اندرونی میں نورانیت کی حالت ضروری نہیں۔ بلکہ اگر کوئی بجائے عقل سلیم کے کمال درجہ کا نادان اور سفیہ ہو۔ اور بجائے صفت شجاعت کے کمال درجے کا بزدل اور بجائے صفت سخاوت کے کمال درجہ کا بخیل۔ اور بجائے صفت حمیت کے کمال درجے کا بے غیرت اور بجائے صفت محبت الٰہیہ کے کمال درجے کا محبّ دُنیا اور بجائے صفت زہد وورع وامانت کے بڑا بھارا چور۔ اور ڈاکو۔ اور بجائے صفت وحیا کے کمال درجے کا بے شرم اور شہوت پرست اور بجائے صفت قناعت کے کمال درجے کا حریص اور لالچی۔ تو ایسا شخص بھی بقول حضرات عیسائیاں باوصف ایسی حالت خراب کے خدا کا نبی اور مقرب ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک مسیح کو باہر نکال

دوسرے تمام انبیا جن کی نبوت کو بھی وہ مانتے ہیں۔ اور اُن کی الہامی کتابوں کو بھی مقدس کر کے پکارتے ہیں۔ وہ نعوذ باللہ بقول اُن کے ایسے ہی تھے اور کمالات قدسیہ سے جو مستلزم عصمت و پاک ولی ہیں، محروم تھے۔ عیسائیوں کی عقل اور خداشناسی پر بھی ہزار آفرین۔ کیا اچھا نور وحی کے نازل ہونے کا فلسفہ بیان کیا۔ مگر ایسے فلسفہ کے تابع ہونے والے اور اس کو پسند کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سخت ظلمت اور کور باطنی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ نور کے فیض کے لئے نور کا ضروری ہونا ایسی بدیہی صداقت ہے کہ کوئی ضعیف العقل بھی اُس سے انکار نہیں کرسکتا۔ مگر اُن کا کیا علاج جن کو عقل سے کچھ بھی سروکار نہیں۔ اور جو کہ روشنی سے بغض اور اندھیرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور چمگادڑ کی طرح رات میں اُن کی آنکھیں خوب کھلتی ہیں۔ لیکن روز روشن میں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ خدا اپنے نور کی طرف (یعنی قرآن شریف کی طرف) جسکو چاہتا ہے۔ ہدایت دیتا ہے۔ اور لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور وہ ہر ایک چیز کو بخوبی جانتا ہے۔ (یعنے ہدایت ایک امر منجانب اللہ ہے۔ اُسی کو ہوتی ہے۔ جس کو عنایت ازلی سے توفیق حاصل ہو۔ دوسرے کو نہیں ہوتی۔ اور خدا مسایل دقیقہ کو مثالوں کے پیرایہ میں بیان فرماتا ہے۔ تا حقائق عمیقہ قریب بہ افہام ہو جائیں۔ مگر وہ اپنے علم قدیم سے خوب جانتا ہے۔ کہ کون ان مثالوں کو سمجھے گا۔ اور حق کو اختیار کرے گا۔ اور کون محروم مخذول رہیگا۔) پس اس مثال میں جس کا یہاں تک جلی قلم سے ترجمہ کیا گیا۔ خدا تعالےٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے دل کو شیشۂ مصفّٰے سے تشبیہہ دی۔ جس میں کسی نوع کی کدورت نہیں۔ یہ نورِ قلب ہے پھر آنحضرتؐ کے فہم و ادراک و عقل سلیم اور جمیع اخلاق فاضلہ جبلّی و فطرتی کو ایک لطیف تیل سے تشبیہہ دی۔ جس میں بہت سی چمک ہے۔ اور جو ذریعہ روشنی چراغ ہے یہ نورِ عقل ہے۔ کیونکہ منبع و منشا جمیع لطائف اندرونی کا قوت عقلیہ ہے پھر ان تمام نوروں پر ایک نور آسمانی کا جو وحی ہے۔ نازل ہونا بیان فرمایا۔ یہ وحی ہے۔ اور انوار ثلاثہ مل کر لوگوں کی ہدایت کا موجب ٹھیرے۔ یہی حقانی اصول ہے جو وحی کے

بلکہ ربّ قدوس قدیم کی طرف سے قانون قدیم ہے۔ اور اس کی ذات پاک کے مناسب پس اس تمام تحقیقات سے ثابت ہے کہ جب تک نور قلب و نور عقل کسی انسان میں کامل درجے پر نہ پائے جائیں۔ تب تک وہ نور وحی ہرگز نہیں پاتا۔ اور پہلے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کمالِ عقل و کمالِ نورانیتِ قلب صرف بعض افراد بشریہ میں ہوتا ہے۔ کل میں نہیں ہوتا۔ اب ان دونوں ثبوتوں کے ملانے سے یہ امر بپایہ ثبوت تک پہنچ گیا۔ کہ وحی اور رسالت فقط بعض افرادِ کاملہ کو ملتی ہے۔ نہ ہر ایک فرد بشر کو۔ پس اس قطعی ثبوت سے برہم سماج والوں کا خیال فاسد بکلی درہم برہم ہو گیا اور یہی مطلب تھا۔

براہین احمدیہ صفحہ ۱۷۷-۱۸۲

" فرمایا اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنے خدا اصل نور ہے۔ ہر ایک نور زمین و آسمان کا اُسی سے نکلا ہے۔ پس خدا کا نام استعارۃً پتار رکھنا اور ہر ایک کی جڑ اس کو قرار دینا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ انسانی روح کا خدا سے کوئی بھاری علاقہ ہے۔ نسیم دعوت صفحہ ۲۲

" کہ اس کا نور قدرت ساری زمین و آسمان اور ذرہ ذرہ کے اندر چمک رہا ہے

شحنہ حق صفحہ ۵۲

" یعنی خدا آسمان و زمین کا نور ہے۔ اسی طبقہ سفلی اور علوی میں حیات اور بقا کی روشنی ہے۔ پرانی تحریریں صفحہ ۱۴

" ویدوں کے رو سے تمام ارواح اور ذرات غیر مخلوق اور انادی ہیں۔ لیکن باوا صاحب کے نزدیک تمام ذرات اور ارواح مخلوق ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں۔

اوّل۔ اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے۔ ہو اِک نور سے سب جگ اُبجا کون بھلے کون مندے۔ یعنی خدا تعالےٰ نے ایک نور پیدا کر کے اس نور سے تمام کائنات کو پیدا کیا۔ پس پیدائش کی رو سے تمام ارواح نوری ہیں۔ یعنی نیک و بد کا

اعمال سے فرق پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ باعتبار خلقت ظلمت محض کوئی بھی پیدا نہیں کیا گیا۔ ہر یک میں نور کا ذرہ مخفی ہے۔ اس میں باوا صاحب نے آیت

اللہ نور السمٰوات والارض

سے اقتباس کیا ہے۔ اسی لئے اللہ اور نور کا لفظ شعر میں قائم رہنے دیا تا اقتباس پر دلالت کرے۔ اور نیز حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کی طرف بھی اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ ست بچن صفحہ ۱۴

"قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی خدا ہی ہے۔ جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نور ہے۔ اسی سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے آفتاب کا وہی آفتاب ہے۔ زمین کے تمام جانداروں کی وہی جان ہے پس زندہ خدا وہی ہے۔ مبارک وہ جو اس کو قبول کرے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی) صـ ۳۱

"اللہ نور السمٰوات والارض یعنی خدا ہر ایک چیز کا نور ہے۔ اسی کی چمک ہر ایک چیز میں ہے۔ خواہ وہ چیز آسمان میں ہے۔ اور خواہ وہ زمین میں۔ چشمہ معرفت صـ ۱۱۱

۲۴/۳۸ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

وہ ایسے مرد ہیں کہ ان کو یاد الٰہی سے نہ تجارت روک سکتی ہے۔ اور نہ بیع مانع ہوتی ہے یعنی محبت الٰہیہ میں ایسا کمال تام رکھتے ہیں کہ دنیوی مشغولیاں گو کیسی ہی کثرت سے پیش آویں۔ ان کے حال میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔ براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۶

"اس سے یہی مراد ہے۔ کہ دنیا کے کاموں میں بھی میرے احکام کو نہیں بھلاتے دیکھو اس وقت ہم ان طریقوں کی طرح ذکر نہیں کر رہے مگر حقیقت میں اسی کی عظمت و جلال کا ذکر ہے۔ یہیں یہی ذکر ہے۔ بدر ۱۴ر فروری ۱۹۰۸ء صـ ۵

" دین اور دنیا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے. سوائے اس حالت کے جب خدا چاہے تو کسی شخص کی فطرت کو ایسا سعید بنائے. کہ وہ دنیا کے کاروبار میں پڑ کر بھی اپنے دین کو مقدم رکھے۔ اور ایسے شخص بھی دنیا میں ہوتے ہیں. چنانچہ ایک شخص کا ذکر تذکرۃ الاولیا میں ہے کہ ایک شخص ہزارہا روپیہ کے لین دین میں مصروف تھا. ایک ولی اللہ نے اس کو دیکھا اور کشفی نگاہ اس پر ڈالی. تو اسے معلوم ہوا. کہ اس کا دل باوجود اس قدر لین دین روپیہ کے خدا تعالےٰ سے ایک دم غافل نہ تھا. ایسے ہی آدمیوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے. کہ لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع کوئی تجارت اور خرید و فروخت ان کو غافل نہیں کرتی. اور انسان کا کمال بھی یہی ہے. کہ دنیوی کاروبار میں بھی مصروفیت رکھے اور پھر خدا کو بھی نہ بھولے. وہ ٹٹو کس کام ہے. جو بروقت بوجھ لادنے کے بیٹھ جاتا ہے اور جب خالی ہو. تو خوب چلتا ہے. وہ قابل تعریف نہیں. وہ فقیر جو دنیوی کاموں سے گھبرا کر گوشہ نشین بن جاتا ہے. وہ ایک کمزوری دکھلاتا ہے. اسلام میں رہبانیت نہیں ہم کبھی نہیں کہتے. کہ عورتوں اور بال بچوں کو ترک کر دو. اور دنیوی کاروبار کو چھوڑ دو. نہیں. بلکہ ملازم کو چاہیے. کہ اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرے اور تاجر اپنی تجارت کے کاروبار کو پورا کرے. لیکن دین کو مقدم رکھے. اس کی مثال خود دنیا میں موجود ہے. کہ تاجر اور ملازم لوگ باوجود اس کے کہ وہ تجارت اور ملازمت کو بہت عمدگی سے پورا کرتے ہیں. پھر بھی بیوی بچے رکھتے ہیں. اور ان کے حقوق برابر ادا کرتے ہیں. ایسا ہی ایک انسان ان تمام مشاغل کے ساتھ خدا تعالےٰ کے حقوق کو ادا کر سکتا ہے. اور دین کو دنیا پر مقدم رکھ کر بڑی عمدگی سے اپنی زندگی گذار سکتا ہے

بدر ۱۴. مارچ ۱۹۰۶ء صفحہ ۶

" یہ ایک ہی آیت صحابہ کے حق میں کافی ہے. کہ انہوں نے بڑی بڑی تبدیلیاں کی تھیں. اور انگریز بھی اس کے معترف ہیں. کہ انکی کہیں نظیر ملنا مشکل ہے. بادیہ نشین لوگ اور اتنی بہادری اور جرأت. تعجب آتا ہے. الحکم ۲۴. اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶

۴۴/۲۴ وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ
عَلٰی بَطْنِہٖ ج وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ج وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ
عَلٰٓی اَرْبَعٍ یَخْلُقُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

یعنی خدا نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ سو بعض جاندار پیٹ پر چلتے ہیں اور بعض دو پاؤں پر خدا جو چاہتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ خدا نے یہ مختلف چیزیں اس لئے بنائیں کہ تا مختلف قدرتیں اس کی ظاہر ہوں۔ غرض اختلاف طبائع جو فطرت مخلوقات میں واقع ہے۔ اس میں حکمت الہیہ انہی امور ثلاثہ میں منحصر ہے۔ جن کو خدا تعالےٰ نے آیات ممدوحہ میں بیان کر دیا۔ براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۱

۵۶/۲۴ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِھِمْ ص وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی
لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْ
نَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ
فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

خدا نے تم میں سے بعض نیکو کار ایمانداروں کے لئے یہ وعدہ ٹھیرا رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنے رسول مقبول کے خلیفے کرے گا۔ انہی کی مانند جو پہلے کرتا رہا ہے۔ اور ان کے دین کو جو ان کے لئے اس نے پسند کر لیا ہے۔ یعنی دین اسلام کو زمین پر جما دے گا۔ اور قائم کر دے گا۔ اور بعد اس کے کہ ایماندار خوف کی حالت میں ہونگے یعنی بعد اس وقت کے کہ جب بباعث وفات حضرت خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے یہ خوف دامنگیر ہوگا۔ کہ شاید اب دین تباہ نہ ہو جائے۔ تو اس خوف اور اندیشہ کی حالت میں خدا تعالےٰ خلافت حقہ کو قائم کر کے مسلمانوں کو اندیشہ ابتری دین سے بیم اور امن کی حالت میں کر دے گا۔ وہ خالصاً میری پرستش کریں گے اور

مجھ سے کسی چیز کو شریک نہیں ٹھیرائیں گے۔ یہ تو ظاہری طور پر بشارت ہے۔ مگر جیسا کہ آیات قرآنیہ میں عادت الٰہیہ جاری ہے۔ اس کے نیچے ایک باطنی معنے بھی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ باطنی طور پر ان آیات میں خلافت روحانی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہر ایک خوف کی حالت میں کہ جب محبت الٰہیہ دلوں سے اُٹھ جائے۔ اور مذاہب فاسدہ ہر طرف پھیل جائیں۔ اور لوگ روبہ دنیا ہو جائیں۔ اور دین کے گم ہونے کا اندیشہ ہو۔ تو ہمیشہ ایسے وقتوں میں خدا روحانی خلیفوں کو پیدا کرتا رہیگا کہ جن کے ہاتھ پر روحانی طور پر نصرت اور فتح دین کی ظاہر ہو۔ اور حق کی عزت اور باطل کی ذلت ہو۔ تا ہمیشہ دین اپنی اصل تازگی پر عود کرتا رہے۔ اور ایماندار ضلالت کے پھیل جانے اور دین کے مفقود ہو جانے کے اندیشے سے امن کی حالت میں آجائیں

(براہین احمدیہ صـ۲۳۶)

" یعنی خدا تعالےٰ نے اس اُمت کے مومنوں اور نیکو کاروں کے لئے وعدہ فرمایا ہے۔ کہ انہیں خلیفہ بنائیگا۔ جیسا کہ اس نے پہلوں کو بنایا تھا۔ یعنی اسی طرز اور طریق کے موافق اور نیز اسی مدت اور زمانہ کے مشابہ اور اسی صورت جلالی اور جمالی کی مانند جو بنی اسرائیل میں سنت اللہ گذر چکی ہے۔ اس اُمت میں بھی خلیفے بنائے جائیں گے اور ان کا سلسلہ خلافت اس سلسلہ سے کم نہیں ہوگا۔ جو بنی اسرائیل کے خلفاء کے لئے مقرر کیا گیا اور نہ انکی طرز خلافت اس طرز سے مبائن و مخالف ہوگی۔ جو بنی اسرائیل کے خلیفوں کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ پھر آگے فرماتا ہے۔ کہ ان خلیفوں کے ذریعہ سے زمین پر دین جما دیا جائے گا۔ اور خدا خوف کے دنوں کے بعد امن کے دن لائے گا۔ خالصتاً اسی کی بندگی کریں گے۔ اور کوئی اس کا شریک نہیں ٹھیرائیں گے۔ لیکن اس زمانہ کے بعد پھر کفر پھیل جائیگا۔ مماثلت تامہ کا اشارہ جو کما استخلف الذین من قبلھم سے سمجھا جاتا ہے۔ صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ مماثلت مدت ایام خلافت اور خلیفوں کی طرز صلاح اور طرز ظہور سے متعلق ہے۔ سو چونکہ یہ بات ظاہر ہے

کہ بنی اسرائیل میں خلیفۃ اللہ ہونے کا منصب حضرت موسے سے شروع ہوا اور ایک مدت دراز تک نوبت بہ نوبت انبیاء بنی اسرائیل میں رہ کر آخر چودہ سو برس کے پورے ہوتے تک حضرت عیسے ابن مریم پر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ حضرت عیسے ابن مریم ایسے خلیفۃ اللہ تھے۔ کہ ظاہری عنان حکومت ان کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ اور سیاست ملکی اور اس دُنیوی بادشاہی سے ان کو کچھ علاقہ نہیں تھا۔ اور دنیا کے ہتھیاریوں سے وہ کچھ کام نہیں لیتے تھے بلکہ اس ہتھیار سے کام لیتے تھے۔ جو ان کے انفاس طیبہ میں تھا یعنی اس موجہ بیان سے جو ان کی زبان پر جاری کیا گیا تھا۔ جس کے ساتھ بہت سی برکتیں تھیں۔ اور جن کے ذریعہ سے وہ مرے ہوئے دلوں کو زندہ کرتے تھے۔ اور بہرے کانوں کو کھولتے تھے اور مادر زاد اندھوں کو سچائی کی روشنی دکھا دیتے تھے۔ ان کا وہ دم ازلی کافر کو مارتا تھا۔ اور اسپر پوری حجت کرتا تھا۔ لیکن مومن کو زندگی بخشتا تھا۔ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے تھے۔ اور ظاہری اسباب اُن کے پاس نہیں تھے۔ اور ہر بات میں خدا تعالےٰ اُن کا متولی تھا۔ وہ اس وقت آئے تھے۔ کہ جب یہودیوں نے نہ صرف دین کو بلکہ انسانیت کی خصلتیں بھی چھوڑ دی تھیں۔ اور بے رحمی اور خود غرضی اور کینہ اور بُغض اور ظلم اور حسد اور بے جا جوش نفس امارہ کے اُن میں ترقی کر گئے تھے اور نہ صرف بنی نوع کے حقوق کو اُنہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ غلبۂ شقاوت کیوجہ سے حضرت محسن حقیقی سے عبودیت اور اطاعت اور سچے اخلاق کا رشتہ بھی توڑ بیٹھے تھے صرف بے مغز استخوان کی طرح توریت کے چند الفاظ اُن کے پاس تھے۔ جو قہر الٰہی کی وجہ سے اُن کی حقیقت تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ ایمانی فراست اور زیرکی بالکل اُن میں سے اُٹھ گئی تھی۔ اور ان کے نفوس مظلمہ پر جہل غالب آ گیا تھا۔ اور سفلی مکاریاں۔ اور کراہت کے کام اُن سے سرزد ہوتے تھے اور جھوٹ اور ریاکاری۔ اور غداری اُن میں انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ ایسے وقت میں اُن کی طرف مسیح ابن مریم بھیجا گیا تھا۔ جو بنی اسرائیل کے نبیوں اور خلیفوں میں سے آخری مسیح اور آخری خلیفۃ اللہ تھا۔ جو برخلاف سنت اکثر نبیوں کے بغیر تلوار اور نیزہ کے

آیا تھا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ شریعت موسوی میں خلیفۃ اللہ کو مسیح کہتے تھے۔ اور حضرت داؤد کے وقت اور یا ان سے کچھ عرصہ پہلے یہ لفظ بنی اسرائیل میں شائع ہو گیا تھا بہر حال اگرچہ بنی اسرائیل میں کئی مسیح آئے۔ لیکن سب سے پیچھے آنے والا مسیح وہی ہے جس کا نام قرآن کریم میں مسیح عیسےٰ بن مریم بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل میں مریمیں بھی کئی تھیں۔ اور اُن کے بیٹے بھی کئی تھے۔ لیکن مسیح عیسےٰ بن مریم یعنے ان تینوں ناموں سے ایک مرکب نام بنی اسرائیل میں اُسوقت اور کوئی نہیں پایا گیا۔ سو مسیح عیسےٰ بن مریم یہودیوں کی اُس خراب حالت میں آیا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ آیات موصوفہ بالا میں ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ خدا تعالےٰ کا اس امت کے لئے وعدہ تھا۔ کہ بنی اسرائیل کی طرز پر اُن میں بھی خلیفہ پیدا ہوں گے۔ اب ہم جب اس طرز کو نظر کے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ کہ ضرور تھا کہ آخری خلیفہ اس اُمت کا مسیح ابن مریم کی صورت مثالی پر آوے۔ اور اس زمانہ میں آوے کہ جو وقت سے مشابہ ہو۔ جس وقت میں بعد حضرت موسے کے مسیح ابن مریم آئے تھے یعنی چودھویں صدی میں یا اُس کے قریب اُس کا ظہور ہوا۔ اور ایسا ہی بغیر سیف و سنان کے اور بغیر آلات حرب کے آوے جیسا کہ مسیح ابن مریم آئے تھے۔ اور نیز ایسے ہی لوگوں کی اصلاح کے لئے آوے۔ جیسا کہ حضرت مسیح ابن مریم اُس وقت کے خراب اندرون یہودیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور جب آیات ممدوحہ بالا کو غور سے دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں ان کے اندر سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔ کہ ضرور آخری خلیفہ اس اُمت کا چودھویں صدی کے سر پر ظہور کرے گا۔ حضرت مسیح کی صورت مثالی پر آئیگا۔ اور بغیر آلات حرب ظہور کریگا دو سلسلوں کی مماثلت میں یہی قاعدہ ہے۔ کہ اول اور آخر میں اشد درجہ کی مشابہت ان میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک لمبے سلسلے اور ایک طولانی مدت میں تمام درمیانی افراد کا مفصل حال معلوم کرنا طول بلاطائل ہے۔ پس جبکہ قرآن شریف نے صاف صاف بتلا دیا کہ خلافت اسلامی کا سلسلہ اپنی ترقی اور تنزل اور اپنی جلالی اور جمالی حالت کی رو سے خلافت اسرائیلی سے بکلی مطابق و مشابہ و مماثل ہو گا۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ

نبی عربی اُمی مثیل موسٰے ہے۔ تو اس ضمن میں قطعی اور یقینی طور پر بتلایا گیا۔ کہ جیسے اسلام میں سر دفتر الٰہی خلیفوں کا مثیل موسٰے ہے۔ جو اس سلسلہ اسلامیہ کا سپہ سالار اور بادشاہ اور تختِ عزت کے اوّل درجہ پر بیٹھنے والا اور تمام برکات کا مصدر اور اپنی روحانی اولاد کا مورثِ اعلٰے ہے۔ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا ہی اس سلسلہ کا خاتم باعتبار نسبت تامہ وہ مسیح عیسٰے بن مریم ہے۔ جو اس امت کے لوگوں میں سے بحکم ربّی مسیحی صفات سے رنگین ہو گیا ہے۔ اور فرمان جعلناک المسیح ابن مریم نے اُسکو درحقیقت وہی بنا دیا ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرًا۔ اور اس آنے والے کا نام جو احمدؐ رکھا گیا ہے وہ بھی اس کے مثیل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ محمدؐ جلالی نام ہے اور احمدؐ جمالی۔ اور احمدؐ اور عیسٰے اپنی جمالی معنوں کی رو سے ایک ہی ہیں۔ اسی کی طرف یہ اشارہ ہے۔ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد۔ مگر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط احمدؐ ہی نہیں۔ بلکہ محمدؐ بھی ہیں یعنے جامع جلال وجمال ہیں۔ لیکن آخری زمانہ میں بڑی پیشگوئی مجرد احمدؐ جو اپنے اندر حقیقت عیسویت رکھتا ہے بھیجا گیا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۷۲-۶۷۳)

" اور منجملہ دلایل قویہ قطعیہ کے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ جو مسیح موعود اسی اُمت محمدیہ میں سے ہوگا۔ قرآن شریف کی یہ آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ یعنے خدا تعالٰے نے اُن لوگوں کے لئے جو ایماندار ہیں۔ اور نیک کام کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے۔ جو اُن کو زمین پر انہی خلیفوں کی مانند جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ خلیفے مقرر فرمائے گا۔ اس آیت میں پہلے خلیفوں سے مراد حضرت موسٰے کی اُمت میں سے خلیفے ہیں۔ جن کو خدا تعالٰے نے حضرت موسٰے کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے پے در پے بھیجا تھا۔ اور خاصکر کسی صدی کو ایسے خلیفوں سے جو دین موسوی کے مجدد تھے خالی نہیں جانے دیا تھا۔ اور قرآن شریف نے ایسے خلیفوں کا شمار کر کے ظاہر فرمایا

ہے۔ کہ وہ بارہ ہیں۔ اور تیرھواں حضرت عیسےٰ علیہ السلام ہیں۔ جو موسوی شریعت کا مسیح موعود ہے۔ اور اس مماثلت کے لحاظ سے جو آیت ممدوحہ میں کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے۔ ضروری تھا۔ کہ محمدی خلیفوں کو موسوی خلیفوں سے مشابہت و مماثلت ہو سو اسی مشابہت کے ثابت اور متحقق کرنے کے لئے خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں بارہ موسوی خلیفوں کا ذکر فرمایا۔ جن میں سے ہر ایک حضرت موسےٰ کی قوم میں سے تھا۔ اور تیرھواں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ جو موسےٰ کی قوم کا خاتم الانبیا تھا۔ مگر در حقیقت موسےٰ کی قوم میں سے نہیں تھا۔ اور پھر خدا نے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کو موسوی سلسلہ کے خلیفوں سے مشابہت دیکر صاف طور پر سمجھا دیا۔ کہ اس سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ہے۔ اور درمیان میں بارہ خلیفے ہیں۔ تا موسوی سلسلہ کے مقابل پر اس جگہ بھی چودہ کا عدد پورا ہوا۔ ایسا ہی سلسلہ محمدی خلافت کے مسیح موعود کو چودہویں صدی کے سر پر پیدا کیا۔ کیونکہ موسوی سلسلہ کا مسیح موعود بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ جب تک کہ سن موسوی کے حساب سے چودہویں صدی نے ظہور نہیں کیا تھا۔ ایسا کیا گیا تا دونو مسیحوں کا مبدء سلسلہ سے فاصلہ باہم مشابہ ہو۔ اور سلسلہ کے آخری خلیفہ مجدد کو چودہویں صدی کے سر پر ظاہر کرنا تکمیل نور کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ مسیح موعود علیہ السلام کے قمر کا متمم نور ہے۔ اس لئے اس کی تجدید چاند کی چودہویں رات سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت میں کہ لیظہرہٗ علی الدین کلہ کیونکہ اظہار تمام اور اتمام نور ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ قول کہ لیظہرہٗ علی الادیان کلہا مساوی اس قول سے ہے۔ لیتم نورہٗ کل الاتمام اور پھر دوسری آیت میں اس کی اور بھی تصریح ہے اور وہ یہ ہے۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہٖ ولو کرہ الکافرون اس آیت میں تصریح سے سمجھایا گیا ہے کہ مسیح موعود چودہویں صدی میں پیدا ہوگا۔ کیونکہ اتمام نور کے لئے چودہویں رات مقرر ہے۔ غرض جیسا کہ قرآن شریف میں حضرت موسےٰ اور حضرت عیسےٰ بن مریم کے درمیان بارہ خلیفوں کا ذکر فرمایا گیا اور ان کا عدد "بارہ" ظاہر کیا گیا اور یہ بھی ظاہر کیا گیا۔ کہ دم

تمام بارہ کے بارہ حضرت موسےٰ علیہ السّلام کی قوم میں سے تھے۔ مگر تیرھواں خلیفہ جو آخری خلیفہ ہے یعنی حضرت عیسےٰ علیہ السّلام اپنے باپ کے رو سے اس قوم میں سے نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی باپ نہ تھا۔ جس کیوجہ سے وہ حضرت موسےٰ سے اپنی شاخ ملا سکتا۔ یہی تمام باتیں سلسلہ خلافت محمدؐیہ میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ اس سلسلہ میں بھی درمیانی خلیفے بارہ[لہ] ہیں۔ اور تیرھواں جو خاتم ولایت محمدؐیہ ہے۔ وہ محمدؐی قوم میں سے نہیں ہے۔ اور یہی چاہئے تھا۔ کہ بارہ خلیفے تو حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم میں سے ہوتے اور آخری خلیفہ اپنے آباؤ اجداد کے رو سے اس قوم میں سے نہ ہوتا۔ تا تحقق مشابہت اکمل اور اتم طور پر ہو جاتا۔ سو الحمد للہ والمنۃ کہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ کیونکہ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ سو جابر بن سمرہ سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لا یزال الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفۃ کلھم من قریش یعنے بارہ خلیفوں کے ہوتے تک اسلام خوب قوت اور زور میں رہے گا۔ مگر تیرھواں خلیفہ جو مسیح موعود ہے۔ اُس وقت آئے گا۔ جبکہ اسلام غلبہ صلیب اور غلبہ دجّالیت سے کمزور ہو جائیگا اور وہ بارہ[لہ] خلیفے جو غلبہ اسلام کے وقت آتے رہیں گے۔ وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم میں سے ہونگے۔

لہ الفاظ حدیث یہ ہیں۔ عن جابر بن سمرۃ قال سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول لا یزال الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفۃ کلھم من قریش متفق علیہ مشکوٰۃ شریف باب مناقب قریش یعنے اسلام بارہ خلیفوں کے ظہور تک غالب رہیگا۔ اور وہ تمام خلیفے قریش میں سے ہوں گے۔ اس جگہ یہ دعوے نہیں ہو سکتا کہ مسیح موعود بھی انہی بارہ میں داخل ہے۔ کیونکہ متفق علیہ یہ امر ہے۔ کہ مسیح موعود اسلام کی قوت کے وقت نہیں آئیگا۔ بلکہ اس وقت آئیگا جبکہ زمین پر نصرانیت کا غلبہ ہوگا۔ جیسا کہ یکسر الصلیب کے فقرہ سے مستنبط ہوتا ہے پس ضرور ہے کہ مسیح موعود کے ظہور سے پہلے اسلام کی قوت جاتی

مگر مسیح موعود جو اسلام کے ضعف کے وقت آئیگا۔ وہ قریش کی قوم میں سے نہیں ہوگا۔ کیونکہ ضرور تھا کہ جیسا موسوی سلسلہ کا خاتم الانبیاء اپنے باپ کے رو سے حضرت موسےٰ کی قوم میں سے نہیں ہے۔ ایسا ہی محمدی سلسلہ کا خاتم الاولیاء قریش میں سے نہ ہو۔ اور اسی جگہ سے قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ ہوگیا۔ کہ اسلام کا مسیح موعود اسی اُمت میں سے آنا چاہئے۔ کیونکہ جب نص قطعی قرآنی یعنے کَمَا کے لفظ سے ثابت ہوگیا کہ سلسلہ استخلاف محمدی کا سلسلہ استخلاف موسوی سے مماثلت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اسی کَمَا کے لفظ سے ان دو نبیوں یعنے حضرت موسےٰ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مماثلت ثابت ہے۔ جو آیت کَمَا ارسلنا الی فرعون رسولا سے سمجھی جاتی ہے۔ تو یہ مماثلت اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے۔ جبکہ محمدی سلسلہ کے آنے والے خلیفے گذشتہ خلیفوں کا عین نہ ہوں۔ بلکہ غیر ہوں۔ وجہ یہ کہ مشابہت اور مماثلت میں من وجہٍ مغایرت ضروری ہے۔ اور کوئی چیز اپنے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲

رہے اور مسلمانوں کی حالت پر ضعف طاری ہو جائے۔ اور اکثر ان کے دوسری طاقتوں کے نیچے اسیطرح محکوم ہوں۔ جیسا کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہودیوں کی حالت ہو رہی تھی۔ چونکہ حدیثوں میں مسیح موعود کا خاص طور پر تذکرہ تھا۔ اس لئے بارہ خلیفوں سے اس کو الگ رکھا گیا۔ کیونکہ مقدر ہے۔ کہ وہ نزول شدائد و مصائب کے بعد آوے۔ اور اس وقت آوے جبکہ اسلام کی حالت میں ایک صریح انقلاب پیدا ہو جائے۔ اور اسی طرز سے حضرت عیسٰے علیہ السلام آئے تھے۔ یعنے ایسے وقت میں جبکہ یہودیوں میں ایک صریح زوال کی علامت پیدا ہوگئی تھی پس اس طریق سے حضرت موسےٰ کے خلیفے بھی تیرہ ہوئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفے بھی تیرہ۔ اور جیسا کہ حضرت موسےٰ سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام چودہویں جگہ تھے ایسا ہی ضرور تھا۔ کہ اسلام کا مسیح موعود بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چودہویں جگہ پر ہو اسی مشابہت سے مسیح موعود کا چودہویں صدی میں ظاہر ہونا ضروری تھا۔ منہ

نفس کے مشابہ نہیں کہلا سکتی۔ پس اگر فرض کر لیں کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدیہ کا جو
تقابل کے لحاظ سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے مقابل پر واقع ہوا ہے۔ جس کی نسبت
یہ ماننا ضروری ہے۔ کہ وہ اس اُمت کا خاتم الاولیاء ہے۔ جیسا کہ سلسلہ موسویہ کے
خلیفوں میں حضرت عیسےٰ خاتم الانبیاء ہے۔ اگر در حقیقت وہی عیسےٰ علیہ السلام ہے
جو دوبارہ آنے والا ہے۔ تو اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ قرآن
جیسا کہ کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتا ہے۔ دونوں سلسلوں کے تمام خلیفوں کو من وجہ
مغائر قرار دیتا ہے۔ اور یہ ایک نص قطعی ہے۔ کہ اگر ایک دُنیا اس کے مخالف اکٹھی ہو
جائے۔ تب بھی وہ اس نص واضح کو رد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جب پہلے سلسلہ کا عین

حاشیہ صفحہ ۱۳۴۔ جبکہ بوجہ کَمَا کے لفظ کے جو آیت کما استخلف الذین
من قبلھم میں موجود ہے۔ محمدی سلسلہ کے خلیفوں کی نسبت وجوباً و قطعاً مان لیا گیا ہے
کہ وہ وہی خلیفے نہیں ہیں۔ جو موسوی سلسلہ کے خلیفہ تھے۔ ہاں ان خلیفوں سے مشابہ ہیں اور
نیز ساتھ اس کے واقعات نے بھی ظاہر کر دیا ہے۔ کہ وہ لوگ پہلے خلیفوں کے عین نہیں ہیں۔ بلکہ غیر
ہیں۔ تو پھر آخری خلیفہ اس سلسلہ محمدیہ کی نسبت جو مسیح موعود ہے۔ کیوں یہ گمان کیا جاتا
ہے۔ کہ وہ پہلے مسیح کا عین ہے۔ کیا وہ کَمَا کے لفظ کے نیچے نہیں ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے
کہ حسب منشاء کَمَا کے لفظ کے محمدی سلسلہ کا مسیح اسرائیلی مسیح کا غیر ہونا چاہیے۔ نہ عین۔ عین
سمجھنا تو قرآن کے منطوق نص پر صریح حملہ ہے۔ بلکہ قرآن شریف کی صریح تکذیب ہے۔ اور
نیز ایک بے جا تحکم۔ کہ بارہ خلیفوں کو تو حسب منشاء کما کے لفظ کے اسرائیلی خلیفوں کا
غیر سمجھنا اور پھر مسیح موعود کو جو سلسلہ موسویہ کے مقابل پر سلسلہ محمدیہ کا آخری خلیفہ
ہے۔ پہلے مسیح کا عین قرار دے دینا وھٰذہ نکتۃ مبتکرۃ وحجۃ باھرۃ ودرۃ
من دُرَرٍ تفردت بھا فخذ وھا بقوۃ واشکروا اللّٰہ بانابۃ ولا تکونوا
من المحرومین منہ۔

لے شیخ محی الدین ابن عربی اپنی کتاب فصوص میں مہدی خاتم الاولیاء کی ایک علامت لکھتے ہیں

ہی نازل ہوگیا۔ تو وہ مغایرت فوت ہوگئی۔ اور لفظ کَمَا کا مفہوم باطل ہوگیا۔ پس اس صورت میں تکذیب قرآن شریف لازم ہوئی۔ وھذا باطلٌ وکلّما یستلزم الباطل فھو الباطل یاد رہے۔ کہ قرآن شریف نے آیت کما استخلف الذین من قبلھم میں وہی کما استعمال کیا ہے۔ جو آیت کما ارسلنا الی فرعون رسولا میں ہے اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعوے کرے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مثیل موسے ہوکر نہیں آئے۔ بلکہ یہ خود موسے بطور تناسخ آگیا ہے۔ یا یہ دعوے کرے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ دعوے صحیح نہیں ہے کہ توریت کی اس پیشگوئی کا میں مصداق ہوں۔ بلکہ اس پیشگوئی کے معنے یہ ہیں کہ خود موسے ہی آجائیگا۔ جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہے۔ تو کیا اس فضول دعوے کا یہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ کہ قرآن شریف میں ہرگز بیان نہیں فرمایا گیا۔ کہ خود موسے آئیگا۔ بلکہ کما کے لفظ سے مثیل موسے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پس یہی جواب ہماری طرف سے ہے۔ کہ اس جگہ بھی سلسلہ خلفاء محمدی کے لئے کما کا لفظ موجود ہے۔ اور یہ نص قطعی کلام الٰہی کی آفتاب کی طرح چمک کر ہمیں بتلا رہی ہے کہ سلسلہ خلافت محمدی کے تمام خلیفے خلفاء موسوی کے مثیل ہیں اسی طرح آخری خلیفہ جو خاتم ولایت محمدیہ ہے۔ جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے۔ وہ حضرت عیسے سے جو خاتم سلسلہ نبوت موسویہ ہے۔ مماثلت اور مشابہت رکھتا ہے۔ مثلاً دیکھو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یوشع بن نون سے کیسی مشابہت ہے۔ کہ انہوں نے ایسا ایک ناتمام کام لشکر اسامہ اور انبیائے کاذبین کے مقابلہ کا پورا کیا۔ جیسا کہ حضرت یوشع بن نون نے پورا کیا۔ اور آخری

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴ کہ اس کا خاندان چینی حدود میں سے ہوگا۔ اور اسکی پیدائش میں یہ ندرت ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بطور توام پیدا ہوگی یعنے اس طرح پر خدا اناث کا مادہ اس سے الگ کریگا سو اسی کشف کے مطابق اس عاجز کی ولادت ہوئی ہے۔ اور اسی کشف کے مطابق میرے بزرگ چینی حدود سے پنجاب میں پہنچے۔ منہ

خلیفہ سلسلہ موسوی کا یعنی حضرت عیسٰے جیسا کہ اُس وقت آیا۔ جبکہ گلیل اور پلاطوس کے علاقہ سے سلطنت یہود کی جاتی رہی تھی۔ ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کا مسیح ایسے وقت میں آیا کہ جب ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

تحفہ گولڑویہ صـ ۳۶ تا ۴۰

" لیکن جس آیت سے دونوں سلسلوں یعنے سلسلہ خلافت موسویہ اور سلسلہ خلافت محمدیہ میں مماثلت ثابت ہے۔ یعنی جس سے قطعی اور یقینی طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کہ سلسلہ نبوت محمدیہ کے خلیفے سلسلہ نبوت موسویہ کے مشابہ و مماثل ہیں۔ وہ یہ آیت ہے وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم الخ یعنے خدا نے اُن ایماندا روں سے جو نیک کام بجالاتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے۔ جو ان میں سے زمین پر خلیفے مقرر کرے گا۔ انہی خلیفوں کی مانند جو ان سے پہلے کئے تھے۔ اب جب ہم مانند کے لفظ کو پیش نظر رکھ کر دیکھتے ہیں جو محمدی خلیفوں کی موسوی خلیفوں سے مماثلت واجب کرتا ہے۔ تو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ جو ان دونوں سلسلوں کے خلیفوں میں مماثلت ضروری ہے۔ اور مماثلت کی پہلی بنیاد ڈالنے والا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہے۔ اور مماثلت کا آخری نمونہ ظاہر کرنے والا وہ مسیح خاتم خلفائے محمدیہ ہے۔ جو سلسلہ خلافت محمدیہ کا سب سے آخری خلیفہ ہے سب سے پہلا خلیفہ جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہے۔ وہ حضرت یوشع بن نون کے مقابل اور اُن کا مثیل ہے۔ جس کو خدا نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے لئے اختیار کیا۔ اور سب سے زیادہ فراست کی روح اُس میں پھونکی یہاں تک کہ وہ مشکلات جو عقیدہ باطلہ حیات مسیح کے مقابلہ میں خاتم الخلفاء کو پیش آنی چاہئیں تھیں۔ ان تمام شبہات کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کمال صفائی سے حل کر دیا۔ اور تمام صحابہ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہا۔ جس کا گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی موت پر اعتقاد نہ ہو گیا ہو۔ بلکہ تمام امور میں تمام صحابہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

کی ایسی ہی اطاعت اختیار کرلی۔ جیسا کہ حضرت موسےٰ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت یشوع بن نون کی اطاعت کی تھی۔ اور خدا بھی موسےٰ اور یشوع بن نون کے نمونہ پر جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ اور آپ کا حامی اور مؤید تھا۔ ایسا ہی ابوبکر کا حامی اور مؤید ہو گیا۔ درحقیقت خدا نے یشوع بن نون کی طرح اس کو ایسا مبارک کیا۔ جو کوئی دشمن اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اسامہ کے لشکر کا ناتمام کام جو حضرت موسےٰ کے ناتمام کام سے مشابہت رکھتا تھا۔ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر پورا کیا۔ اور حضرت ابوبکر کی حضرت یشوع بن نون کے ساتھ ایک اور عجیب مناسبت یہ ہے۔ جو حضرت موسٰی کی موت کی اطلاع سب سے پہلے حضرت یوشع کو ہوئی اور خدا نے بلا توقف ان کے دل میں وحی نازل کی۔ جو موسےٰ مر گیا۔ تا یہود حضرت موسےٰ کی موت کے بارے میں کسی غلطی یا اختلاف میں نہ پڑ جائیں۔ جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اوّل سے ظاہر ہے۔ اسی طرح سب سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت پر حضرت ابوبکر نے یقین کامل ظاہر کیا۔ اور آپ کے جسد مبارک پر بوسہ دیکر کہا۔ کہ تو زندہ بھی پاک تھا اور موت کے بعد بھی پاک ہے۔ اور پھر وہ خیالات جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بارے میں بعض صحابہ میں پیدا ہو گئے تھے ایک عام جلسہ میں قرآن شریف کی آیت کا حوالہ دیکر اُن تمام خیالات کو دُور کر دیا اور ساتھ ہی اس غلط خیال کی بھی بیخ کنی کر دی۔ جو حضرت مسیح کی حیات کی نسبت احادیث نبویہ میں پوری غور نہ کرنے کیوجہ سے بعض کے دلوں میں پایا جاتا تھا۔ اور جس طرح حضرت یشوع بن نون نے دین کے سخت دشمنوں اور مفتریوں اور مفسدوں کو ہلاک کیا تھا۔ اسی طرح بہت سے مفسد اور جھوٹے پیغمبر حضرت ابوبکر کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور جس طرح حضرت موسےٰ راہ میں ایسے نازک وقت میں فوت ہو گئے تھے جب ابھی بنی اسرائیل نے کنعانی دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کی تھی۔ اور بہت سے مقاصد باقی تھے۔ اور ارد گرد دشمنوں کا شور تھا جو حضرت موسےٰ کی وفات کے بعد اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ ایسا ہی ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ایک

خطرناک زمانہ پیدا ہو گیا تھا۔ کئی فرقے عرب کے مرتد ہو گئے تھے۔ بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کئی جھوٹے پیغمبر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور ایسے وقت میں جو ایک بڑے مضبوط دل اور مستقل مزاج اور قوی الایمان اور دلاور اور بہادر خلیفہ کو چاہتا تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر کئے گئے۔ اور ان کو خلیفہ ہوتے ہی بڑے غموں کا سامنا ہوا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ کہ بباعث چند در چند فتنوں اور بغاوت اعراب اور کھڑے ہونے جھوٹے پیغمبروں کے میرے باپ پر جبکہ وہ خلیفہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مقرر کیا گیا۔ وہ مصیبتیں پڑیں۔ اور وہ غم دل پر نازل ہوئے۔ کہ اگر وہ غم کسی پہاڑ پر پڑتے تو وہ بھی گر پڑتا۔ اور پاش پاش ہو جاتا۔ اور زمین سے ہموار ہو جاتا۔ مگر چونکہ خدا کا قانون قدرت ہے۔ کہ جب خدا کے رسول کا کوئی خلیفہ اُس کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے۔ تو شجاعت اور ہمت اور استقلال اور فراست اور دل قوی ہونے کی روح اس میں پھونکی جاتی ہے۔ جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اول آیت ۶ میں حضرت یشوع کو اللہ تعالے فرماتا ہے۔ کہ مضبوط ہو اور دلاوری کر یعنے موسےٰ تو مر گیا۔ اب تو مضبوط ہو جاؔ۔ یہی حکم قضاء و قدر کے رنگ میں نہ شرعی رنگ میں حضرت ابو بکر کے دل پر بھی نازل ہوا تھا۔ تناسب اور تشابہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے

ؔ خدا تعالیٰ کے حکم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک شرعی جیسا یہ کہ تو خون نہ کر چوری نہ کر جھوٹی گواہی مت دے۔ دوسری قسم حکم کی قضاء و قدر کے حکم ہیں۔ جیسا کہ یہ حکم کہ قلنا یا نار کونی بردًا وسلامًا علی ابراھیم۔ شرعی حکم میں محکوم کا تخلف حکم سے جائز ہے۔ جیسا کہ بہتیرے باوجود حکم شرعی پانے کے خون بھی کرتے ہیں۔ چوری بھی کرتے ہیں۔ جھوٹی گواہی بھی دیتے ہیں۔ مگر قضاء و قدر کے حکم میں ہرگز تخلف جائز نہیں۔ انسان تو انسان قدری حکم سے جمادات بھی تخلف نہیں کر سکتے کیونکہ جبروتی کشش اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ سو حضرت یشوع کو خدا کا یہ حکم کہ مضبوط دل ہو جا۔ قدری حکم تھا۔ یعنے قضاء و قدر کا حکم۔ وہی حکم حضرت ابو بکر کے دل پر بھی نازل ہوا تھا منہ۔

کہ گویا ابوبکر بن قحافہ اور یشوع بن نون ایک ہی شخص ہے۔ استخلافی مماثلت نے اس
جگہ کس کر اپنی مشابہت دکھلائی ہے۔ یہ اس لئے کہ کسی دو لمبے سلسلوں میں باہم مشابہت
کو دیکھنے والے طبعًا یہ عادت رکھتے ہیں۔ کہ یا اوّل کو دیکھا کرتے ہیں یا آخر کو۔ مگر دو
سلسلوں کی درمیانی مماثلت کو جس کی تحقیق و تفتیش زیادہ وقت چاہتی ہے۔
دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ اوّل اور آخر پر قیاس کر لیا کرتے ہیں۔ اس لئے خدا
نے اس مشابہت کو جو یشوع بن نون اور حضرت ابوبکر میں ہے۔ جو دو خلافتوں کے
اوّل سلسلہ میں ہیں۔ اور نیز اس مشابہت کو جو حضرت عیسےٰ بن مریم اور اس اُمت
کے مسیح موعود میں ہے۔ جو دونوں خلافتوں کے آخر سلسلہ میں ہیں۔ اعلیٰ بدیہیات
کر کے دکھلا دیا۔ مثلاً یشوع اور ابوبکر میں وہ مشابہت درمیان رکھدی کہ گویا وہ دونو
ایک ہی وجود ہے۔ یا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے ہیں۔ اور جس طرح بنی اسرائیل حضرت
موسٰے کی وفات کے بعد یوشع بن نون کی باتوں کے شنوا ہو گئے۔ اور کوئی اختلاف
نہ کیا۔ اور سب نے اپنی اطاعت ظاہر کی۔ یہی واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیش آیا
اور سب نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی میں آنسو بہا کر دلی رغبت سے
حضرت ابوبکر کی خلافت کو قبول کیا۔ غرض ہر ایک پہلو سے حضرت ابوبکر صدیق کی مشابہت
یشوع بن نون علیہ السلام سے ثابت ہوئی۔ خدا نے جس طرح حضرت یشوع بن نون کو
اپنی وہ تائیدیں دکھلائیں۔ کہ جو حضرت موسٰے کو دکھلایا کرتا تھا۔ ایسا ہی خدا نے تمام صحابہ
کے سامنے حضرت ابوبکر کے کاموں میں برکت دی۔ اور نبیوں کی طرح اس کا اقبال چمکا
اس نے مفسدوں اور جھوٹے نبیوں کو خدا سے قدرت اور جلال پا کر قتل کیا۔ تاکہ اصحاب
رضی اللہ عنہم جانیں کہ جس طرح خدا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔ اس
کے بھی ساتھ ہے۔ ایک اور عجیب مناسبت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یشوع
بن نون علیہ السلام سے ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت یشوع بن نون کو حضرت موسے
علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک ہولناک دریا سے جس کا نام یردن ہے عبور مع
لشکر کرنا پیش آیا تھا۔ اور یردن میں ایک طوفان تھا۔ اور عبور غیر ممکن تھا اور اگر مع لشکر

سے عبور نہ ہوتا۔ تو بنی اسرائیل کی دشمنوں کے ہاتھ سے تباہی متصور تھی۔ اور یہ وہ پہلا امر ہولناک تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یشوع بن نون کو اپنے خلافت کے زمانہ میں پیش آیا۔ اُس وقت خدا تعالیٰ نے اس طوفان سے اعجازی طور پر یشوع بن نون اور اُس کے لشکر کو بچالیا۔ اور دریا میں خشکی پیدا کر دی۔ جس سے وہ بآسانی گذر گیا۔ وہ خشکی لبطور جوار بھاٹا تھی۔ یا محض ایک فوق العادت اعجاز تھا۔ بہر حال اس طرح خدا نے ان کو طوفان اور دشمن کے صدمہ سے بچایا۔ اسی طوفان کی مانند بلکہ اس سے بڑھ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الحق کو مع تمام جماعت صحابہ کے جو ایک لاکھ سے زیادہ تھے پیش آیا۔ یعنے ملک میں سخت بغاوت پھیل گئی اور وہ عرب کے بادیہ نشین جنکو خدا نے فرمایا تھا۔ قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (سورہ حجرات) ضرور تھا۔ کہ اس پیشگوئی کے مطابق وہ بگڑتے۔ تا یہ پیشگوئی پوری ہوتی۔ پس ایسا ہی ہوا۔ اور وہ سب لوگ مرتد ہو گئے۔ اور بعض نے زکوٰۃ سے انکار کیا۔ اور چند شریر لوگوں نے پیغمبری کا دعوےٰ کر دیا۔ جن کے ساتھ کئی لاکھ بدبخت انسانوں کی جمعیت ہو گئی۔ اور دشمنوں کا شمار اس قدر بڑھ گیا۔ کہ صحابہ کی جماعت ان کے آگے کچھ بھی چیز نہ تھی۔ اور ایک سخت طوفان ملک میں برپا ہوا۔ یہ طوفان اس خوفناک پانی سے بہت بڑھکر تھا جس کا سامنا حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو پیش آیا تھا۔ اور جیسا کہ یوشع بن نون حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ناگہانی طور پر اس سخت ابتلا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کہ دریا سخت طوفان میں تھا اور کوئی جہاز نہ تھا۔ اور ہر ایک طرف سے دشمن کا خوف تھا۔ یہی ابتلا حضرت ابوبکر کو پیش آیا تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو گئے۔ اور ارتداد عرب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اور جھوٹے پیغمبروں کا ایک دوسرا طوفان اس کو قوت دینے والا ہو گیا۔ یہ طوفان یوشع کے طوفان سے کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ بہت زیادہ تھا۔ اور پھر جیسا کہ خدا کے کلام نے حضرت یوشع کو قوت دی اور فرمایا کہ جہاں جہاں تو جاتا ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ تو مضبوط ہو اور دلاور بن جا۔ اور بیدل مت

ہو۔ تب یشوع میں بڑی قوت اور استقلال اور وہ ایمان پیدا ہوگیا۔ جو خدا کی تسلی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی حضرت ابو بکر کو بغاوت کے طوفان کے وقت خدا تعالےٰ سے قوت ملی۔ جس شخص کو اس زمانہ کی اسلامی تاریخ پر اطلاع ہے۔ وہ گواہی دے سکتا ہے کہ وہ طوفان ایسا سخت طوفان تھا۔ کہ اگر خدا کا ہاتھ ابو بکر کے ساتھ نہ ہوتا۔ اور اگر درحقیقت اسلام خدا کی طرف سے نہ ہوتا۔ اور اگر درحقیقت ابو بکر خلیفہ حق نہ ہوتا۔ تو اس دن اسلام کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ مگر یشوع نبی کی طرح خدا کے پاک کلام سے ابو بکر صدیق کو قوت ملی۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں اس ابتلاء کی پہلے سے خبر دے رکھی تھی۔ چنانچہ جو شخص اس آیت مندرجہ ذیل کو غور سے پڑھے گا۔ وہ یقین کرے گا کہ بلاشبہ اس ابتلا کی خبر قرآن شریف میں پہلے سے دی گئی تھی۔ اور وہ خبر یہ ہے کہ

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکننّ لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذالک فاولٰئک ھم الفاسقون۔

یعنے خدا نے مومنوں کو جو نیکو کار ہیں وعدہ دے رکھا ہے۔ جو انکو خلیفے بنائیگا۔ انہی خلیفوں کی مانند جو پہلے بنائے تھے۔ اور اسی سلسلہ خلافت کی مانند سلسلہ قائم کرے گا۔ جو حضرت موسےٰ کے بعد قائم کیا تھا۔ اور ان کے دین کو یعنے اسلام کو جس پر وہ راضی ہوا زمین پر جما دے گا۔ اور اس کی جڑھ لگا دے گا۔ اور خوف کی حالت کو امن کی حالت سے بدل دے گا۔ وہ میری پرستش کریں گے۔ کوئی دوسرا میرے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ دیکھ اس آیت میں صاف طور پر فرما دیا ہے کہ خوف کا زمانہ بھی آئے گا۔ اور امن جاتا رہے گا۔ مگر خدا اس خوف کے زمانے کو پھر امن کے ساتھ بدل دے گا۔ سو یہی خوف یشوع بن نون کو بھی پیش آیا تھا۔ اور جیسا کہ اس کو خدا کے کلام سے تسلی دی گئی۔ ایسا ہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی خدا کے کلام سے تسلی دی گئی۔ اور چونکہ ہر ایک سلسلہ میں خدا کا یہ قانون قدرت ہے۔ کہ اس کا کمال تب ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب آخر حصہ سلسلہ کا پہلے حصے سے

مشابہ ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ موسوی اور محمدی سلسلہ کا پہلا خلیفہ موسوی اور محمدی سلسلہ کے آخری خلیفہ سے مشابہ ہو۔ کیونکہ کمال ہر ایک چیز کا استدرات[1] کو چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لبائط گول شکل پر پیدا کئے گئے ہیں۔ تا خدا کے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ناقص نہ ہوں۔ اسی بنا پر ماننا پڑتا ہے۔ کہ زمین کی شکل بھی گول

---

[1] استدرات کے لفظ سے میری مراد یہ ہے کہ جب ایک دائرہ پورے طور پر کامل ہو جاتا ہے تو جس نقطہ سے شروع ہوا تھا۔ اسی نقطہ سے جا ملتا ہے۔ اور جب تک اس نقطہ کو نہ ملے تب تک اس کو دائرہ کاملہ نہیں کہہ سکتے پس آخری نقطہ کا پہلے نقطہ سے جا ملنا وہی امر ہے۔ جسکو دوسرے لفظوں میں مشابہت تامہ کہا کرتے ہیں پس جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو یشوع بن نون سے مشابہت تھی یہاں تک کہ نام بھی مشابہ تھا۔ ایسا ہی حضرت ابوبکر اور مسیح موعود کو بعض واقعات کی رو سے بشدّت مشابہت ہے۔ اور وہ یہ کہ ابوبکر کو خدا نے سخت فتنہ اور بغاوت اور مفتریوں اور مفسدوں کے عہد میں خلافت کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایسا ہی مسیح موعود اس وقت ظاہر ہوا۔ کہ جبکہ تمام علامات صغرٰی کا طوفان ظہور میں آچکا تھا۔ اور کچھ کبرٰی میں سے بھی۔ اور دوسری مشابہت یہ ہے کہ جیسا کہ خدا نے حضرت ابوبکر کے وقت میں خوف کے بعد امن پیدا کر دیا۔ اور برخلاف دشمنوں کی خواہشوں کے دین کو جما دیا ایسا مسیح موعود کے وقت میں بھی ہوگا۔ کہ اس طوفان تکذیب اور تکفیر اور تفسیق کے بعد یکدفعہ لوگوں کو محبت اور ارادت کی طرف میلان دیا جائیگا۔ اور جب بہت سے زلزال ہوں گے اور انکی آنکھیں کھلینگی۔ تو وہ معلوم کریں گے کہ ہمارے اعتراض کچھ چیز نہ تھے اور ہم نے اپنے اعتراضوں میں بجز اس کے اور کچھ نہ دکھلایا۔ جو اپنے سطحی خیال اور موٹی عقل اور حسد اور تعصب کے زہر کو لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد ابوبکر اور مسیح موعود میں یہ مشابہت ظاہر کر دی جائے گی۔ کہ اس دین کو جس کی مخالف بیخکنی کرنا چاہتے ہیں زمین پر خوب جما دیا جائیگا۔ اور ایسا مستحکم کیا جائیگا۔ کہ پھر قیامت تک اس میں تزلزل نہیں ہوگا اور پھر تیسری مشابہت یہ ہوگی۔ کہ جو شرک کی ملونی مسلمانوں کے عقیدوں میں مل گئی تھی۔ وہ

ہے۔ کیونکہ دوسری تمام شکلیں کمال تام کے مخالف ہیں۔ اور جو چیز خدا کے ہاتھ سے بلا واسطہ نکلی ہے۔ اس میں مناسب حال مخلوقیت کے کمال تام ضرور چاہئیں تا اُس کا

صـ ۱۴۲

بقیہ حاشیہ۔ بکلّی ان کے دلوں میں سے نکال دی جائے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شرک کا ایک بڑا حصہ جو مسلمانوں کے عقاید میں داخل ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ دجّال کو بھی خدائی کی صفتیں دی گئی تھیں اور حضرت مسیح کو ایک حصہ مخلوق کا خالق سمجھا گیا تھا۔ یہ ہر ایک قسم کا شرک دُور کیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً سے مستنبط ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس پیشگوئی سے جو مسیح موعود اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں مشترک ہے یہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ کہ جسطرح شیعہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے ہیں۔ اور ان کے مرتبہ اور بزرگی سے منکر ہیں ایسا ہی مسیح موعود کی تکفیر کی جائے گی۔ اور ان کے مخالف ان کے مرتبہ ولایت سے انکار کریں گے کیونکہ اس پیشگوئی کے اخیر میں یہ آیت ہے۔ ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون اور اس آیت کے معنے جیسا کہ روافض کی عملی حالت سے کھلے ہیں یہی ہیں۔ کہ بعض گمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام بلند سے منکر ہو جائیں گے۔ اور انکی تکفیر کریں گے پس اس آیت سے سمجھا جاتا ہے کہ مسیح موعود کی بھی تکفیر ہوگی۔ کیونکہ وہ خلافت کے آخری نقطہ پر ہے۔ جو خلافت کے پہلے نقطہ سے ملا ہوا ہے۔ یہ بات بہت ضروری اور یاد رکھنے کے لائق ہے۔ کہ ہر ایک دائرہ کا عام قاعدہ یہی ہے۔ کہ اس کا آخری نقطہ پہلے نقطہ سے اتصال رکھتا ہے۔ لہٰذا اس عام قاعدہ کے موافق خلافت محمدیہ کے دائرہ میں بھی ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ لازمی امر ہے کہ آخری نقطہ اس دائرہ کا جس سے مراد مسیح موعود ہے۔ جو سلسلہ خلافت محمدیہ کا خاتم ہے۔ وہ اس دائرہ کے پہلے نقطہ سے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نقطہ ہے۔ جو سلسلہ خلافت محمدیہ کے دائرہ کا پہلا نقطہ جو ابوبکر ہے۔ وہ اس دائرہ کے انتہائی نقطہ سے جو مسیح موعود ہے۔ اتصال تام رکھتا ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ آخر نقطہ ہر ایک دائرہ کا اس کے پہلے نقطہ سے جا ملتا ہے اب جبکہ اول اور آخر کے دونوں نقطوں کا اتصال ماننا پڑا تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو قرآنی پیشگوئیاں خلافت کے پہلے نقطہ کے حق میں ہیں یعنی حضرت ابوبکر کے حق میں وہی خلافت کے آخری نقطہ کے حق میں بھی ہیں یعنے

نقص خالق کے نقص کی طرف عاید ہو۔ اور نیز اس لئے لبائط کا گول رکھنا خدا تعالٰے نے پسند کیا۔ کہ گول میں کوئی جہت نہیں ہوتی۔ اور یہ امر توحید کے بہت مناسب حال ہے۔ غرض صنعت کا کمال مدور شکل سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں انتہائی نقطہ اس قدر اپنے کمال کو دکھلاتا ہے۔ کہ پھر اپنے مبدء کو جا ملتا ہے ؛

اب ہم پھر اپنے اصل مدعا کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں۔ کہ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو حضرت سیدنا محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے پہلے خلیفہ تھے۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے جو حضرت موسٰے علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے پہلے خلیفہ ہیں اشد مشابہت ہے۔ تو پھر اس سے لازم آیا۔ کہ جیسا کہ سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا پہلا خلیفہ سلسلہ موسویہ کی خلافت کے پہلے خلیفہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا آخری خلیفہ جو مسیح موعود سے موسوم ہے۔ سلسلہ موسویہ کے آخری خلیفہ سے جو حضرت عیلٰے بن مریم ہے۔ مشابہت رکھے۔ تا دونوں سلسلوں کی مشابہت تامہ میں جو نص قرآنی سے ثابت ہوتی ہے۔ کچھ نقص نہ رہے۔ کیونکہ جب تک دونوں سلسلے یعنے سلسلہ موسویہ وسلسلہ محمدیہ اول سے آخر تک باہم مشابہت نہ دکھلائیں۔ تب تک وہ مماثلت جو آیت کما استخلف الذین میں کما کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے۔ ثابت نہیں ہو سکتی اور پھر چونکہ ہم ابھی حاشیہ میں اکمل اور اتم طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسیح موعود سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہو گیا۔ کہ حضرت ابوبکر یوشع بن نون سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور حضرت یوشع بن نون اس قاعدہ کی رو سے جو دائرہ کا اول نقطہ دائرہ کے آخر نقطہ سے اتحاد رکھتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے حاشیہ میں لکھا ہے۔ حضرت عیلٰے بن مریم سے مشابہت رکھتے ہیں۔ تو اس سلسلہ مساوات سے لازم آیا۔ کہ حضرت عیلٰے علیہ السلام اسلام کے مسیح موعود سے جو شریعت اسلامیہ کا آخری خلیفہ ہے۔ مشابہت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عیلٰے حضرت یشوع بن نون سے مشابہ ہیں اور حضرت یشوع بن نون حضرت ابوبکر سے مشابہ۔ اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام کے

آخری خلیفہ یعنے مسیح موعود سے مشابہ ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسے اسلام کے آخری خلیفہ سے جو مسیح موعود ہے مشابہ ہیں۔ کیونکہ مشابہ کا مشابہ مشابہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر خط ا خط ب سے مساوی ہے۔ اور خط ب خط ج سے مساوی تو ماننا پڑے گا۔ کہ خط ا خط ج سے مساوی ہے اور یہی مدعا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مشابہت من وجہ مغائرت کو چاہتی ہے۔ اس لئے قبول کرنا پڑا کہ اسلام کا مسیح موعود حضرت عیسے علیہ السلام نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا غیر ہے اور عوام جو باریک باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ کہ خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو رسول ظاہر کر کے ان کو دو مستقل شریعتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک شریعت موسویہ۔ دوسری شریعت محمدیہ۔ اور ان دونوں سلسلوں میں تیرہ تیرہ خلیفے مقرر کئے ہیں۔ اور درمیانی بارہ خلیفے جو ان دونوں شریعتوں میں پائے جاتے ہیں وہ ہر دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے ہیں۔ یعنے موسوی خلیفے اسرائیلی ہیں۔ اور محمدی خلیفے قریشی ہیں۔ مگر آخری دو خلیفے ان دونوں سلسلوں کے وہ ان ہر دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے نہیں ہیں۔ حضرت عیسے اس لئے کہ ان کا کوئی باپ نہیں۔ اور اسلام کے مسیح موعود کی نسبت جو آخری خلیفہ ہے۔ خود علمائے اسلام مان چکے ہیں۔ کہ وہ قریش میں سے نہیں ہے۔ اور نیز قرآن شریف فرماتا ہے۔ کہ یہ دونو مسیح ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اسلام کے مسیح موعود کو موسوی مسیح موعود کا مثیل ٹھیراتا ہے۔ نہ عین پس محمدی مسیح موعود کو موسوی مسیح کا عین قرار دینا قرآن شریف کی تکذیب ہے۔ اور تفصیل اس استدلال کی یہ ہے کہ کما کا لفظ جو آیت کما استخلف الذین من قبلھم میں ہے جس سے تمام محمدی سلسلہ کے خلیفوں کی موسوی سلسلہ کے خلیفوں کے ساتھ مشابہت ثابت ہوتی ہے ہمیشہ مماثلت کے لئے آتا ہے۔ اور مماثلت ہمیشہ من وجہ مغائرت کو چاہتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز اپنے نفس کی مثیل کہلائے۔ بلکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کچھ مغائرت ضروری ہے۔ اور عین کسی وجہ سے اپنے نفس کا مغائر نہیں ہو سکتا پس جیسا کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت موسےٰ کے مثیل ہو کر ان کے عین نہیں ہو سکتے

ایسا ہی تمام محمدی خلیفے جن میں سے آخری خلیفہ مسیح موعود ہے۔ وہ موسوی خلیفوں کے جن میں سے آخری خلیفہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام ہیں۔ کسی طرح عین نہیں ہو سکتے اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ کما کا لفظ جیسا کہ حضرت موسیٰ اور آنحضرتؐ کی مشابہت کیلئے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ وہی کما کا لفظ آیت کما استخلف الذین میں وارد ہے۔ جو اسی قسم کی مغائرت چاہتا ہے۔ جو حضرت موسےٰ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے۔ یاد رہے کہ اسلام کا بارہواں خلیفہ جو تیرہویں صدی کے سر پر ہونا چاہئے۔ وہ یحیی نبی کے مقابل پر ہے۔ جس کا ایک پلید قوم کے لئے سر کاٹا گیا۔ (سمجھنے والا سمجھ لے) اس لئے ضروری ہے۔ کہ بارہواں خلیفہ قریشی ہو۔ جیسا کہ حضرت یحییٰ اسرائیلی ہیں۔ لیکن اسلام کا تیرہواں خلیفہ جو چودھویں صدی کے سر پر ہونا چاہئے۔ جس کا نام مسیح موعود ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا۔ کہ وہ قریش میں نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عیسےٰ اسرائیلی ہیں۔ سید احمد صاحب بریلوی سلسلہ خلافت محمدیہ کے بارہویں خلیفہ ہیں۔ جو حضرت یحییٰ کے مثیل ہیں اور سید ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۲ تا ۱۰۲)

"کوئی فرقہ مسلمانوں کا ایسا نہیں ہے۔ کہ جو اپنی نماز میں یہ دعا نہ پڑھتا ہو۔ اس سوال کا جواب خود قرآن شریف نے اپنے دوسرے مقامات میں دیدیا ہے مثلاً جیسا کہ آیت کما استخلف الذین من قبلھم سے صریح اور صاف طور پر سمجھا جاتا ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی جبکہ مماثلت کی ضرورت کی وجہ سے واجب تھا۔ کہ اس اُمت کے خلیفوں کا سلسلہ ایک ایسے خلیفہ پر ختم ہو۔ جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا مثیل ہو۔ تو منجملہ وجوہ مماثلت کے ایک یہ وجہ بھی ضروری الوقوع تھی۔ کہ جیسے حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے وقت فقیہ اور مولوی ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ تحفہ گولڑویہ ۱۰۸
...... ایسا ہی اسلام کے مسیح موعود پر اس زمانہ کے مولوی کفر کا فتویٰ لکھیں۔

"یہ پیشگوئی (غیر المغضوب علیھم) جو دعا کے رنگ میں فرمائی گئی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ

جاتا تھا۔ کہ حسب وعدہ کما استخلف الذین من قبلھم آخری خلیفہ اس امت کا حضرت عیسٰے علیہ السلام کے رنگ میں آئیگا۔ اور ضرور ہے کہ وہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی طرح قوم کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے۔ اور اس پر کفر کا فتوےٰ لکھا جاوے۔ اور اس کے قتل کے ارادے کئے جائیں۔ اس لئے ترحم کے طور پر تمام مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی۔ کہ تم خدا سے پناہ چاہو۔ کہ تم یہودیوں کی طرح نہ بن جاؤ۔ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے مسیح موعود کو کافر ٹھیرایا تھا۔ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۱

" پس تعجب ہے اس قوم سے جو کہتی ہے کہ مسیح موعود کا قرآن شریف میں ذکر نہیں علاوہ اس کے قرآن شریف کی یہ آیت بھی کہ کما استخلف الذین من قبلھم یہی چاہتی ہے۔ کہ اس امت کیلئے چودھویں صدی میں مثیل عیسٰے ظاہر ہو۔ جیسا کہ حضرت عیسٰے حضرت موسےٰ سے چودھویں صدی میں ظاہر ہوئے تھے تا دونوں سلسلوں کے اول و آخر میں مشابہت ہو۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶)

" اور میں حضرت عیسٰے علیہ السلام کی شان کا منکر نہیں۔ گو خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ مسیح محمدی مسیح موسوی سے افضل ہے لیکن تاہم میں مسیح ابن مریم کی بہت عزت کرتا ہوں کیونکہ میں روحانیت کی رو سے اسلام میں خاتم الخلفاء ہوں۔ جیسا کہ مسیح ابن مریم اسرائیلی سلسلہ کیلئے خاتم الخلفاء تھا۔ موسےٰ کے سلسلہ میں ابن مریم مسیح اسرائیلی سلسلہ کے لئے خاتم الخلفا تھا موسےٰ کے سلسلہ میں ابن مریم مسیح موعود تھا۔ اور محمدی سلسلہ میں میں مسیح موعود ہوں

(کشتی نوح صفحہ ۱۶)

" اللہ نے تم میں سے ان پکے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے۔ جو اچھے اعمال بجا لاویں گے کہ ضرور ان کو اسی طرز پر زمین پر خلیفہ بنا دیگا۔ کہ جس طرح پہلوں کو بنایا ہے

حمامۃ البشریٰ صفحہ ۹۴

" ہمارا رسول مثیل موسٰے ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم اس مثیل موسٰے کے خلفاء بھی اسی سلسلہ سے ہوں گے۔ جیسے کہ موسٰے کے خلفاء سلسلہ وائے اس سلسلہ کی میعاد چودہ سو برس تک رہی برابر خلفاء آتے رہے۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی۔ کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ویسے ہی اس سلسلہ کا آغاز ہوگا یعنی جس طرح موسٰے نے ابتدا میں جلالی نشان دکھلائے اور فرعون سے چھڑایا۔ اس طرح آنے والا نبی بھی موسٰے کی طرح ہو گا۔ تحفہ سالانہ صفحہ ۵۳

" اس لئے قطعی طور پر یہاں سے ثابت ہوا کہ اس امت کے محدث اپنی تعداد میں اور اپنی طولانی سلسلہ میں موسوی امت کے مرسلوں کے برابر ہیں اور درحقیقت اسی کی طرف دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکّننّ لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم ولیبدّلنّھم مّن بعد خوفھم امنا۔ یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا یعنی خدا نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ یہ وعدہ کیا ہے۔ کہ البتہ انہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ کرے گا۔ جیسا کہ ان لوگوں کو کیا۔ جو ان سے پہلے گذر گئے۔ اور ان کے دین کو جو ان کے لئے پسند کیا ہے۔ ثابت کر دیگا۔ اور ان کے لئے خوف کے بعد امن کو بدل دیگا۔ میری عبادت کریں گے۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیرائیں گے" اب غور سے دیکھو کہ اس آیت میں بھی مماثلت کی طرف صریح اشارہ ہے۔ اور اگر اس مماثلت سے مماثلت تامہ مراد نہیں۔ تو کلام عبث ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ شریعت موسوی میں چودہ سو برس تک ممتد رہا۔ نہ صرف تیس برس تک اور صدہا خلیفے روحانی اور ظاہری طور پر ہوئے۔ نہ صرف چار اور پھر ہمیشہ کیلئے خاتمہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ منکم کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ وہ خلیفے صرف صحابہ میں سے ہوں کیونکہ منکم کے لفظ میں مخاطب صرف صحابہ ہیں۔ تو یہ خیال ایک بدیہی غلطی ہے۔ اور ایسی بات

صرف اس شخص کے منہہ سے نکلے گی جس نے کبھی قرآن کریم کو غور سے نہیں پڑھا۔ اور نہ اسکی اسالیب کلام کو پہچانا۔ کیونکہ اگر یہی بات سچ ہے۔ کہ مخاطبت کے وقت وہی لوگ مراد ہوتے ہیں۔ جو موجودہ زمانہ میں بحیثیت ایمانداری زندہ موجود ہوں۔ تو ایسا تجویز کرنے سے سارا قرآن زیر وزبر ہو جائیگا۔ مثلاً اسی آیت موصوفہ بالا کے مشابہ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے۔ جس میں اس طرح بظاہر الفاظ وہ لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسے پر ایمان لائے تھے۔ اور اس وقت زندہ موجود تھے۔ بلکہ ان آیات میں تو اس بات پر نہایت قوی قرائن موجود ہیں۔ کہ درحقیقت وہی مخاطب کئے گئے ہیں۔ اور وہ آیات یہ ہیں۔

قال سنقتل ابناءھم ونستحی نساءھم وانا فوقھم قاھرون قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا۔ ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔ قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون۔ الجزو ۹۔ سورۃ الاعراف۔ یعنی فرعون نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کریں گے۔ اور انکی بیٹیوں کو زندہ رکھینگے۔ اور تحقیقاً ہم اُن پر غالب ہیں۔ تب موسے نے اپنی قوم کو کہا۔ کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ زمین خدا کی ہے۔ جسکو اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے۔ اُسکا وارث بنا دیتا ہے۔ اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے تب موسے کی قوم نے اس کو جواب دیا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے جاتے تھے۔ اور تیرے آنے کے بعد بھی ستائے گئے۔ تو موسے نے ان کے جواب میں کہا۔ کہ قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کرے۔ اور زمین پر تمہیں خلیفے مقرر کرے۔ اور پھر دیکھے کہ تم کس طور کے کام کرتے ہو۔

اب ان آیات میں صاف اور صریح طور پر وہی لوگ مخاطب ہیں۔ جو حضرت موسے کی قوم میں ان کے سامنے زندہ موجود تھے۔ اور انہوں نے فرعون کے ظلموں کا شکوہ بھی کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی۔ اور انہیں کو خطاب کرکے کہا تھا کہ تم ان تکلیفات پر صبر کرو۔ خدا تمہاری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا۔ اور تمہارے

دشمن کو ہلاک کرے گا۔ اور تم کو زمین پر خلیفے بنائے گا۔ لیکن تاریخ دانوں پر ظاہر ہے۔ اور یہودیوں اور نصاریٰ کی کتابوں کو دیکھنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ کہ گو اس قوم کا دشمن یعنے فرعون ان کے سامنے ہلاک ہوا۔ مگر وہ خود تو زمین پر نہ ظاہری خلافت پر پہنچے نہ باطنی خلافت پر۔ بلکہ اکثر ان کی نافرمانیوں سے ہلاک کئے گئے۔ اور چالیس برس تک بیابان لق و دق میں آوارہ رہکر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ پھر بعد ان کی ہلاکت کے ان کی اولاد میں الہیٰ سلسلہ خلافت کا شروع ہوا۔ کہ بہت سے بادشاہ اس قوم میں ہوئے۔ اور داؤد اور سلیمان جیسے خلیفۃ اللہ اسی قوم میں سے پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ آخر یہ سلسلہ خلافت کا چودھویں صدی میں حضرت مسیح پر ختم ہوا۔ پس اسی سے ظاہر ہے کہ کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے۔ بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے۔ مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں۔ جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ مثلاً اللہ جلشانہ سورۃ البقر میں یہود موجودہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون یعنی اے بنی اسرائیل اس نعمت کو یاد کرو۔ جو ہم نے تم پر انعام کی۔ اور میرے عہد کو پورا کرو۔ تا میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں۔ اور مجھ سے پس ڈرو اب ظاہر ہے کہ یہود موجودہ زمانہ آنحضرت تو ضربت علیھم الذلۃ کا مصداق تھے۔ ان پر تو کوئی انعام بھی نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ان سے یہ عہد ہوا تھا۔ کہ تم نے خاتم الانبیاء پر ایمان لانا پھر بعد اس کے فرمایا واذ نجینکم من ال فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم وفی ذالکم بلاء من ربکم عظیم واذ فرقنا بکم البحر فانجینکم واغرقنا ال فرعون وانتم تنظرون۔ یعنے وہ وقت یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی۔ وہ تم کو طرح طرح کے دکھ دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے۔ اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور اس میں خدا تعالیٰ کیطرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔ اور وہ وقت یاد کرو۔ جب کہ ہم نے تمہارے پہنچنے کے ساتھ دریا کو پھاڑ دیا پھر ہم نے تم کو نجات دے دی۔ اور فرعون کے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔

اب سوچنا چاہئے کہ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ان یہودیوں کو پیش نہیں آیا تھا۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ نہ وہ فرعون کے ہاتھ سے دکھ دیئے گئے۔ نہ اُن کے بیٹوں کو کسی نے قتل کیا۔ نہ وہ کبھی دریا سے پار کئے گئے۔ پھر آگے فرماتا ہے۔ واذ قلتم یموسیٰ لن نؤمن لک حتیٰ نری اللہ جھرۃً فاخذتکم الصاعقۃ وانتم تنظرون ۔ ثم بعثنکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلویٰ :۔ یعنی وہ وقت یاد کرو۔ جب تم نے موسےٰ کو کہا کہ ہم تیرے کہے پر تو ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک خدا بچشم خود نہ دیکھ لیں۔ تب تم پر صاعقہ پڑی۔ اور پھر تم کو زندہ کیا۔ تاکہ تم شکر کرو۔ اور ہم نے بادلوں کو تم پر سائبان کیا۔ اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اُتارا۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت موسےٰ تو ان یہودیوں سے جو قرآن میں مخاطب کئے گئے۔ دو ہزار برس پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اور ان کا حضرت موسےٰ کے زمانہ میں نام ونشان بھی نہ تھا۔ پھر وہ حضرت موسےٰ سے ایسا سوال کیونکر کر سکتے تھے۔ کہاں ان پر بجلی گری اور کہاں انہوں نے من اور سلویٰ کھایا۔ کیا وہ پہلے حضرت موسےٰ کے زمانہ میں اور اور قالبوں میں موجود تھے۔ اور پھر آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی بطور تناسخ آموجود ہوئے اور اگر یہ نہیں تو بجز اس تاویل کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ کہ مخاطبت کے وقت ضروری نہیں کہ وہی لوگ حقیقی طور پر واقعات منسوبہ کے مصداق ہوں۔ جو مخاطب ہوں۔ کلام الٰہی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ ایک قاعدہ ٹھیر گیا ہے۔ کہ بسا اوقات کوئی واقعہ ایک شخص یا ایک قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور دراصل وہ واقعہ کسی دوسری قوم یا دوسرے شخص سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی باب میں سے عیسےٰ بن مریم کے آنے کی خبر ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں آخری زمانہ میں آنے کا ایک واقعہ حضرت عیسےٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔ حالانکہ وہ فوت ہو چکے تھے پس یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ واقعہ فرعون کے ہاتھ سے نجات پائیگا۔ اور من وسلویٰ کھانے کا اور صاعقہ گرنے کا اور دریا سے پار ہونے اور قصہ لن نصبر علیٰ طعام واحد کا اُن یہودیوں کی طرف منسوب کیا گیا۔ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں موجود تھے۔ حالانکہ وہ واقعات ان کی پہلی قوم کے

تھے۔ جو اُن سے صدہا برس پہلے مر چکے تھے۔ پس اگر کسی کو آیات کے معنے کرنے میں معقول شق کیطرف خیال نہ ہو۔ اور ظاہر الفاظ پر اڑ جانا واجب سمجھتے۔ تو کم سے کم ان آیات سے یہ ثابت ہوگا کہ مسئلہ تناسخ حق ہے۔ ورنہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا تعالےٰ ایک فاعل کے فعل کو کسی ایسے شخص کیطرف منسوب کرے۔ جسکو اس فعل کے ارتکاب سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ حالانکہ وہ آپ ہی فرماتا ہے۔ لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ پھر اگر موسےٰ کی قوم نے موسےٰ کی نافرمانی کی تھی اور اُن پر بجلی گری تھی۔ یا اُنہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی۔ اور اُن پر عذاب نازل ہوا تھا۔ تو اُس دوسری قوم کو ان واقعات سے کیا تعلق تھا۔ جو دو ہزار برس بعد پیدا ہوئے۔ یوں تو حضرت آدم سے تا ایندم متقدمین متاخرین کے لئے بطور آباؤ اجداد ہیں لیکن کسی کا گناہ کسی پر عاید نہیں ہوسکتا۔ پھر خدا تعالےٰ کا قرآن کریم میں یہ فرمانا۔ کہ تم نے موسےٰ کی نافرمانی کی۔ اور تم نے کہا کہ ہم موسےٰ کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اس کو دیکھ نہ لیں۔ اور اس گناہ کے سبب سے تم پر بجلی گری۔ کیونکر ان تمام الفاظ کے بنظر ظاہر کوئی اور معنے ہوسکتے ہیں بجز اس کے کہ کہا جائے کہ در اصل وہ تمام یہودی جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حضرت موسےٰ کے وقت میں بھی موجود تھے۔ اور انہی پر من و سلویٰ نازل ہوا تھا۔ اور انہی پر بجلی گری تھی۔ اور انہی کی خاطر فرعون کو ہلاک کیا گیا تھا۔ اور پھر وہی یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں بطور تناسخ پیدا ہو گئے۔ اور اس طرح پر خطاب صحیح ٹھیر گیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے سیدھے معنے نہیں کئے جاتے۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی قدرت سے دُور ہیں۔ اور کیوں ایسے معنے قبول نہیں کئے جاتے ہیں جو تاویلات بعیدہ کے حکم میں ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں۔ کہ جس طرح بقول ہمارے مخالفوں کے وہ حضرت عیسےٰ کو بعینہٖ بجسدہ العنصری کسی وقت صدہا برسوں کے بعد پھر زمین پر لے آئیگا۔ اسی طرح اس نے حضرت موسےٰ کے زمانہ کے یہودیوں کو پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وقت میں زندہ کر دیا ہو۔ اُنکی روحوں کو بطور تناسخ پھر دنیا میں لے آیا ہو۔ جس حالت میں صرف بے بنیاد اقوال کی بنیاد پر حضرت عیسےٰ کی روح کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا گیا ہے تو کیوں اور کیا وجہ کہ ان تمام یہودیوں کی روحوں کا دوبارہ بطور تناسخ ہمارے نبی صلے اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں آجانا قبول نہ کیا جائے۔ جن کے موجود ہو جانے پر نصوص صریحہ بیّنہ قرآن کریم شاہد ہیں۔ دیکھو خدا تعالےٰ صاف فرماتا ہے۔ واذ قلتم یا موسٰی لن نؤمن لک حتی نری اللہ جھرۃً فاخذتکم الصّاعقۃ وانتم تنظرون یعنے تم وہ وقت یاد کرو۔ جبکہ تم نے نہ کسی اور نے یہ کہا کہ ہم تیرے کہنے پر تو ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک ہم آپ ظاہر ظاہر خدا کو نہ دیکھ لیں۔ اور پھر تم کو بجلی نے پکڑا اور تم دیکھتے تھے اور اس آیت میں ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالےٰ نے اس آیت کے مضمون میں موجودہ یہودیوں کو گذشتہ لوگوں کے قائم مقام نہیں ٹھیرایا۔ بلکہ ان کو فی الحقیقت گذشتہ لوگ ہی ٹھیرا دیا۔ تو اس صورت میں قرآن کریم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک کے یہودیوں کے وہی نام رکھدئے۔ جو ان گذشتہ بنی اسرائیل کے نام تھے۔ کیونکہ جبکہ یہ لوگ حقیقتاً وہی لوگ قرار دئے گئے۔ تو یہ لازمی ہوا کہ نام بھی وہی ہوں۔ وجہ یہ کہ نام حقائق کے لئے مثل عوارض غیر منفک کے ہیں۔ اور عوارض لازمیہ اپنی حقائق سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب خوب متوجہ ہو کر سوچو کہ جبکہ خدا تعالےٰ نے صریح اور صاف لفظوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ہی ایسے ایسے بُرے کام حضرت موسےٰ کے عہد میں کئے تھے۔ تو پھر ایسی صریح اور کھلی کھلی نص کی تاویل کرنا اور احادیث کی بنیاد پر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو جو قرآن کریم کی رُو سے وفات یافتہ ہے پھر زمین پر اُتارنا کیسی بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ عزیزو اگر خدا تعالےٰ کی یہی عادت اور سنت ہے۔ کہ گذشتہ لوگوں کو پھر دنیا میں لے آتا ہے۔ تو نص قرآنی جو بتکرار در تکرار گذشتہ لوگوں کو مخاطب کر کے ان کے زندہ ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس سے درگذر کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اور اگر وہاں یہ دھڑکا دل کو پکڑتا ہے۔ کہ ایسے معنے گو خدا تعالیٰ کی قدرت سے تو بعید نہیں لیکن معقول کے برخلاف ہیں۔ اس لئے تاویل کیطرف رُخ کیا جاتا ہے۔ اور وہ معنے کئے جاتے ہیں۔ جو عند العقل کچھ بعید نہیں ہیں۔ تو پھر ایسا ہی حضرت عیسےٰ کے آنے کی پیشگوئی کے معنے کرنے چاہئیں کیونکہ اگر گذشتہ یہودیوں کا ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں زندہ ہو جانا

یا اگر بطریق تناسخ کے انکی روحیں پھر آجانا طریق معقول کے برخلاف ہے۔ تو حضرت مسیح کے نسبت کیونکر دوبارہ دنیا میں آنا تجویز کیا جاتا ہے۔ جن کی وفات پر آیت فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے۔ کیا یہودیوں کی روحوں کا دوبارہ دنیا میں آنا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید اور نیز طریق معقول کے برخلاف لیکن حضرت علیٰے کا بجسدہ العنصری پھر زمین پر آجانا بہت معقول ہے۔ پھر اگر نصوص بینہ صریحیہ قرآنیہ کو بباعث استبعاد ظاہری معنوں کے مؤل کر کے طریق صرف عن الظاہر اختیار کیا جاتا ہے تو پھر کیا وجہ کہ نصوص احادیثیہ کا صرف عن الظاہر جائز نہیں کیا۔ احادیث کی قرآن کریم سے کوئی اعلےٰ شان ہے۔ کہ تا ہمیشہ احادیث کے بیان کو گو کیسا ہی بعید از عقل ہو۔ ظاہر الفاظ پر قبول کیا جائے۔ اور قرآن میں تاویلات بھی کیجائیں۔ پھر ہم اصل کلام کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں۔ کہ بعض صاحب آیت وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم کی عمومیت سے انکار کر کے کہتے ہیں۔ کہ منکم سے صحابہ ہی مراد ہیں۔ اور خلافت راشدہ حقہ انہیں کے زمانہ تک ختم ہو گئی۔ اور پھر قیامت تک اسلام میں اس خلافت کا نام و نشان نہیں ہوگا۔ گویا ایک خواب و خیال کیطرح اس خلافت کا صرف تیس برس ہی دور کا تھا۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے اسلام ایک لازوال نحوست میں پڑ گیا۔ مگر میں پوچھتا ہوں۔ کہ کیا کسی نیک دل انسان کی ایسی رائے ہو سکتی ہے۔ کہ وہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کی نسبت تو یہ اعتقاد رکھے کہ بلاشبہ انکی شریعت کی برکت اور خلافت راشدہ کا زمانہ برابر چودہ سو برس تک رہا۔ لیکن وہ نبی جو افضل الرسل اور خیر الانبیاء کہلاتا ہے۔ اور جس کی شریعت کا دامن قیامت تک ممتد ہے انکی برکات گویا اس کے زمانہ تک ہی محدود رہیں۔ اور خدا تعالےٰ نے نہ چاہا۔ کہ کچھ بہت مدت تک انکی برکات کے نمونے اس کی روحانی خلیفوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوں۔ ایسی باتوں کو سن کر تو ہمارا بدن کانپ جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ لوگ بھی مسلمان ہی کہلاتے ہیں کہ جو سراسر چالاکی اور بے باکی کی راہ سے ایسے بے ادبانہ الفاظ منہ پر لے آتے ہیں کہ گویا اسلام کے برکات آگے نہیں بلکہ مدت ہوئی کہ اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے ؂

ماسوائے اس کے منکم کے لفظ سے یہ استدلال پیدا کرنا کہ چونکہ خطاب صحابہ سے ہے۔ اس لئے یہ خلافت صحابہ تک ہی محدود ہے عجیب عقلمندی ہے۔ اگر اسی طرح قرآن کی تفسیر ہو۔ تو پھر یہودیوں سے آگے بڑھ کر قدم رکھنا ہے۔ اب واضح ہو کہ منکم کا لفظ قرآن کریم میں قریباً بیاسی جگہ آیا ہے۔ اور بجز دو یا تین جگہ کے جہاں کوئی خاص قرینہ قائم کیا گیا ہے۔ باقی تمام مواضع میں منکم کے خطاب سے وہ تمام مسلمان مراد ہیں۔ جو قیامت تک پیدا ہوتے رہینگے

اب نمونہ کے طور چند وہ آیتیں ہم لکھتے ہیں۔ جن میں منکم کا لفظ پایا جاتا ہے۔

(۱) فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفرٍ فعدۃ من ایامٍ اُخر۔ یعنے جو تم میں مریض یا سفر پر ہو۔ تو اتنے ہی روزے اور رکھ لے۔ اب سوچو کہ کیا یہ حکم صحابہ سے خاص تھا۔ یا اس میں اور بھی مسلمان جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ شامل ہے۔ ایسا ہی نیچے کی آیتوں پر بھی غور کرو۔

(۲) ذالک یوعظ بہٖ من کان منکم یومن باللہ والیوم الاٰخر۔ یعنی یہ اسکو وعظ کیا جاتا ہے۔ جو تم میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے۔

(۳) والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً۔ یعنی تم میں سے جو جوروئیں چھوڑ کر فوت ہو جائیں۔

(۴) ولتکن منکم امۃٌ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر یعنے تم سے ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو نیکی کی دعوت کریں۔ اور امر معروف اور نہی منکر اپنا طریق رکھیں۔

(۵) انی لا اضیع عمل عاملٍ منکم من ذکرٍ او اُنثیٰ میں تم میں سے کسی عامل کا عمل ضائع نہیں کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت ہو۔

(۶) لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃً عن تراضٍ منکم ناجائز طور پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ۔ مگر باہم رضامندی کی تجارت سے

(۷) وان کنتم مرضیٰ او علیٰ سفرٍ او جاء احدٌ منکم من الغائط او لامستم النساء فلم تجدوا ماءً فتیمموا صعیداً طیباً ط یعنے اگر تم مریض ہو یا سفر پر

یا پاخانہ سے آؤ۔ یا عورتوں سے مباشرت کرو۔ اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمم کرلو۔

(۸) اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم یعنے اللہ اور رسول اور اپنے بادشاہوں کی تابعداری کرو۔

(۹) من عمل منکم سوءً بجہالۃ ثم تاب من بعدہ واصلح فانہ غفور الرحیم یعنے جو شخص تم میں سے بوجہ اپنی جہالت کے کوئی بدی کرے۔ اور پھر توبہ کرے اور نیک کاموں میں مشغول ہوجائے۔ پس اللہ غفور الرحیم ہے۔

(۱۰) فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب یعنی جو شخص تم سے ایسا کام کرے دنیا کی زندگی میں اسکو رسوائی ہوگی۔ اور قیامت کو اس کے لئے سخت عذاب ہے۔

(۱۱) وان منکم الا واردھا یعنے تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دوزخ میں وارد نہ ہو

(۱۲) ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین۔ یعنی ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔ جو تم میں سے آگے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو پیچھے رہنے والے ہیں۔

اب ان تمام مقامات کو دیکھو کہ منکم کا لفظ تمام مسلمانوں کیلئے عام ہے۔ خواہ اسوقت موجود تھے خواہ بعد میں قیامت تک آتے جائیں۔ ایسا ہی تمام دوسرے مقامات میں بجز دو تین موضعوں کے عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور تمام احکام میں بظاہر صورت مخاطب صحابہ ہی ہیں لیکن تخصیص صحابہ بجز قیام قرینہ کے جائز نہیں ورنہ ہر یک فاسق عذر کرسکتا ہے کہ صوم اور صلوۃ اور حج اور تقویٰ اور طہارت اور اجتناب عن المعاصی کے متعلق جسقدر احکام ہیں ان احکام کے مخاطب صرف صحابہ ہی تھے۔ اس لئے ہمیں نماز روزہ وغیرہ کی پابندی لازم نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے کلمات بجز ایک زندیق کے اور کوئی خداترس آدمی زبان پر نہیں لاسکتا۔

اگر کسی کے دل میں یہ خیال گذرے کہ اگر آیت وعد اللہ الذین امنوا فائدہ عموم کا دیتی ہے۔ یعنے مقصود الٰہی تعمیم تھی نہ تخصیص تو پھر منکم کا لفظ اس جگہ کیوں زیادہ کیا گیا۔ اور اگر

زیادت کی ضرورت ہی کیا تھی صرف اس قدر فرمایا ہوتا۔ کہ وعد اللہ الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعدہ ان ایمانداروں اور نیکوکاروں کے مقابل پر تھا۔ جو اس اُمت سے پہلے گذر چکے ہیں پس گویا تفصیل اس آیت کی یوں ہے کہ خدا تعالےٰ نے تم سے پہلے ان لوگوں کو روئے زمین پر خلیفے مقرر کیا تھا۔ جو ایماندار اور صالح تھے۔ اور اپنے ایمان کے ساتھ اعمال صالح جمع رکھتے تھے۔ اور خدا تعالےٰ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے بھی اے مسلمانو ایسے لوگوں کو جو انہیں صفات حسنہ سے موصوف ہوں۔ اور ایمان کے ساتھ اعمال صالح جمع رکھتے ہوں۔ خلیفے کرے گا پس منکم کا لفظ زائد نہیں۔ بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ تا اسلام کے ایمانداروں اور نیکوکاروں کیطرف اشارہ کرے۔ کیونکہ جب کہ نیکوکار اور ایماندار کا لفظ اس آیت میں پہلی اُمتوں اور اس اُمت کے ایمانداروں اور نیکوکاروں پر برابر حاوی تھا پھر اگر کوئی تخصیص کا لفظ نہ ہوتا۔ تو عبارت رکیک اور مبہم اور دور از فصاحت ہوتی۔ اور منکم کے لفظ سے یہ جتانا بھی منظور ہے۔ کہ پہلے بھی وہی لوگ خلیفے مقرر کئے گئے تھے۔ کہ جو ایماندار اور نیکوکار تھے اور تم میں بھی ایماندار اور نیکوکار ہی مقرر کئے جائیں گے۔ اب اگر آنکھیں دیکھنے کی ہوں تو عام معنے کی رو سے منکم کے لفظ کا زائد ہونا کہاں لازم آتا ہے۔ اور تکرار کلام کیونکر ہے۔ جبکہ ایمان اور عمل صالح اسی امت سے شروع نہیں ہوا۔ پہلے بھی مومن اور نیکوکار گذرے ہیں۔ تو اس صورت میں تمیز کامل بجز منکم کے لفظ کے کیونکر ہو سکتی تھی۔ اگر صرف اس قدر ہوتا کہ وعد اللہ الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت تو کچھ نہ معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ یہ کن ایمانداروں کا ذکر ہے آیا اس اُمت کے ایماندار یا گذشتہ اُمتوں کے۔ اور اگر صرف منکم ہوتا اور الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت نہ ہوتا۔ تو یہ سمجھا جاتا۔ کہ فاسق اور بدکار لوگ بھی خدا تعالےٰ کے خلیفے ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ فاسقوں کی بادشاہت اور حکومت بطور ابتلا کے ہے نہ بطور اصطفا کے اور خدا تعالےٰ کے حقانی خلیفے خواہ وہ روحانی خلیفے ہوں۔ یا ظاہری۔ وہی لوگ ہیں جو متقی اور ایماندار اور نیکوکار ہیں۔

اور یہ وہم کہ عام معنوں کی رو سے ان آیات کی آخر کی آیت یعنے ومن کفر بعد ذالک

فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ بالکل بے معنے ٹھیر جاتی ہے۔ ایسا بے ہودہ خیال ہے جو اس پر ہنسی آتی ہے۔ کیونکہ آیت کے صاف اور سیدھے یہ معنی ہیں۔ کہ اللہ جلشانہ خلیفوں کے پیدا ہونے کی خوشخبری دے کر پھر باغیوں اور نافرمانوں کو دھمکی دیتا ہے۔ کہ بعد خلیفوں کے پیدا ہونے کے جب وہ وقتاً فوقتاً پیدا ہوں۔ اگر کوئی بغاوت اختیار کرے۔ اور انکی اطاعت اور بیعت سے منہ پھیرے۔ تو وہ فاسق ہے۔ اب نادرستی ان معنوں کی کہاں ہے۔ اور واضح ہو کہ اس آیت کریمہ سے وہ حدیث مطابق ہے۔ جو پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں من لم یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ الجاھلیۃ جس شخص نے اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کیا۔ وہ جاہلیت کی موت پر مر گیا۔ یعنے جیسے جیسے ہر یک زمانہ میں امام پیدا ہوں گے۔ اور جو لوگ ان کو شناخت نہیں کریں گے۔ تو انکی موت کفار کی موت کے مشابہ ہوگی۔ اور معترض صاحب کا اس آیت کو پیش کرنا کہ قال اللہ انی منزلھا علیکم فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا۔ کہ منکم کا لفظ اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حاضرین کے حق میں آیا ہے ایک بے فائدہ بات ہے۔ کیونکہ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ قرآن کریم کا عام محاورہ جس سے تمام قرآن بھرا پڑا ہے۔ یہی ہے کہ خطاب عام ہوتا ہے۔ اور احکام خطابیہ تمام امت کیلئے ہوتے ہیں نہ صرف صحابہ کے لئے۔ ہاں جس جگہ کوئی صریح اور صاف قرینہ تحدید خطاب کا ہو وہ جگہ مستثنے ہے۔ چنانچہ آیات موصوفہ بالا میں خاص حواریوں کے ایک طائفہ نے نزول مائدہ کی درخواست کی۔ اسی طائفہ کو مخاطب کر کے جواب ملا۔ سو یہ قرینہ کافی ہے۔ کہ سوال بھی اسی طائفہ کا تھا۔ اور جواب بھی اُسی کو ملا۔ اور یہ کہنا کہ اس کی مثالیں کثرت سے قرآن میں ہیں بالکل جھوٹ اور دھوکہ دینا ہے۔ قرآن میں بیاسی کے قریب لفظ منکم ہے۔ اور چھ سو کے قریب اور اور صورتوں میں خطاب ہے۔ لیکن تمام خطابات احکامیہ وغیرہ میں تعمیم ہے اگر قرآن کے خطابات صحابہ تک ہی محدود ہوتے۔ تو صحابہ کے فوت ہو جانے کے ساتھ قرآن باطل ہو جاتا۔ اور آیت متنازعہ فیہا جو خلافت کے متعلق ہے۔ درحقیقت اس آیت سے مشابہ ہے۔ لکم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا کیا یہ بشریٰ صحابہ سے ہی خاص تھا۔ یا کسی

اور کو بھی اس سے حصہ ہے۔ اور معترض کا یہ کہنا کہ جو شخص اصلی معنوں سے جو خصوصیت مخاطبین ہی عدول کر کے اُس کے معنے عموم کے لیوے۔ اس کا ذمہ ہے کہ وہ دلیل یقینی سے اپنے عدول کو ثابت کرے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف معترض کو قرآن کریم سے بلکہ تمام الٰہی کتابوں کے اسلوب کلام سے کچھ بھی خبر نہیں ۔مشکل یہ ہے کہ اگر شتاب کار لوگ قبل اس کے جو پورے طور پر خوض کریں۔ اعتراض کرنے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ اگر معترض صاحب کو صحیح نیت سے تحقیق کا شوق تھا۔ تو وہ تمام ایسے موقع جہاں بظاہر نظر صحابہ مخاطب ہیں۔ جمع کر کے دیکھتے کہ اکثر اغلب اور بلا قیام قرینہ قرآن شریف میں کیا محاورہ ہے۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ جو اکثر اغلب محاورہ ثابت ہوگا۔ اسی کے مطابق اصلی معنے ٹھیریں گے۔ اور ان سے عدول کرنا بغیر قیام قرینہ جائز نہیں ہوگا۔ اب ظاہر ہو کہ اصل محاورہ قرآن کریم کا خطاب حاضرین میں عموم ہے۔ اور قرآن کریم کا چھ سو حکم اسی بنا پر عام سمجھا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ صحابہ تک محدود سمجھا جائے۔ پھر جو شخص عام محاورہ سے عدول کر کے کسی حکم کو صحابہ تک ہی محدود رکھے۔ اس کے ذمہ یہ بار ثبوت ہوگا۔ کہ قرائن قویہ سے یہ ثابت کرے۔ کہ یہ خطاب صحابہ سے ہی خاص ہے۔ اور دوسرے لوگ اس سے باہر ہیں۔ مثلاً اللہ جلشانہ قرآن کریم میں بظاہر صحابہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ کہ تم صرف خدا کی بندگی کرو۔ اور صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو۔ اور پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور کسی قسم کا فساد مت کرو۔ اور تم زکوٰۃ اور نماز کو قائم کرو۔ اور مقام ابراہیم سے جائے نماز ٹھیراؤ۔ اور خیرات میں ایکدوسرے سے سبقت کرو۔ اور مجھ کو یاد کرو۔ میں تم کو یاد کروں گا۔ اور میرا شکر کرو۔ اور مجھ سے دعا مانگو۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوں۔ ان کو مردے مت کہو۔ اور جو تم کو سلام علیکم کرے۔ اُس کا نام کافر اور بے ایمان مت رکھو۔ پاک چیزیں زمین کی پیداوار میں سے کھاؤ۔ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ مگر جو تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو وہ اتنے روزے پھر رکھے۔ تم ایکدوسرے کے مال کو ناحق کے طور پر مت کھاؤ۔ اور تم تقوےٰ اختیار کرو۔ تا فلاح پاؤ۔ اور تم خدا کی راہ میں اُن سے جو تم سے لڑیں لڑو لیکن حد سے مت بڑھو۔ اور کوئی زیادتی مت کرو۔ کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور تم خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ اور دانستہ اپنے تئیں ہلاکت میں مت ڈالو۔ اور لوگوں سے احسان

کہ خدا محسنین کو دوست رکھتا ہے۔ اور حج اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا کرو۔ اور اپنے پاس توشہ رکھو۔ کہ توشہ میں فائدہ ہے۔ کہ تم کسی دوسرے سے سوال نہیں کروگے یعنی سوال ایک ذلت ہے اس سے بچنے کے لئے تدبیر کرنی چاہیئے۔ اور تم صلاح اور اسلام میں داخل ہو۔ اور مشرکات سے نکاح مت کرو۔ جب تک ایمان نہ لاویں۔ اور مشرکین سے اے عورتو تم نکاح مت کرو۔ جب تک ایمان نہ لاویں۔ اور اپنے نفسوں کیلئے کچھ آگے بھیجو۔ اور خداتعالے کو اپنی قسموں کا عرضہ مت بناؤ۔ اور عورتوں کو دکھ دینے کی غرض سے بند مت رکھو۔ اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور جورُئیں رہ جائیں تو وہ چار مہینے اور دس دن نکاح کرنے سے رُکی رہیں۔ اگر تم طلاق دو۔ تو عورتوں کو احسان کے ساتھ رخصت کرو۔ اگر تمہیں خوف ہو تو نماز پیروں سے چلتے چلتے یا سوار ہونے کی حالت میں پڑھ لو۔ اگر اپنے صدقات لوگوں کو دکھلا کے دو تو یہ عموماً اچھی بات ہے۔ کہ تا لوگ تمہارے نیک کاموں کی پیروی کریں۔ اور اگر چھپا کر محتاجوں کو دو۔ تو یہ تمہارے نفسوں کیلئے بہتر ہے۔ جب تم کسی کو قرضہ دو۔ تو ایک نوشت لکھا لو۔ اور قرض ادا کرنے میں خدا سے ڈرو۔ اور کچھ باقی مت رکھو۔ اور جب تم کوئی خرید فروخت کرو۔ تو اسپر گواہ رکھ لو۔ اور اگر تم سفر میں ہو۔ اور کوئی کاتب نہ ملے۔ تو کوئی جائیداد قبضہ میں کرلو۔ تم سب ملکر خدا کی رسی سے پنجہ مارو اور باہم پھوٹ مت ڈالو۔ تم میں سے ایسے بھی ہونے چاہئیں کہ جو امر معروف اور نہی منکر کریں۔ تم خدا کی مغفرت کی طرف دوڑو۔ اور اگر تم میں سے کسی کی بیوی فوت ہو جاوے۔ تو وہ اس کی جائیداد میں سے نصف کا مالک ہے۔ بشرطیکہ اس کی کچھ اولاد نہ ہو۔ اور اگر اولاد ہو تو پھر اُس کو چہارم حصہ جائیداد بعد عمل بر وصیت پہنچے گا۔

یہ چند احکام بطور نمونہ ہمنے لکھے ہیں۔ اس میں ایک تھوڑی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ بظاہر یہ تمام خطاب صحابہ کی طرف ہے لیکن درحقیقت تمام مسلمان ان احکام پر عمل کرنے کیلئے مامور ہیں۔ نہ یہ کہ صرف صحابہ مامور ہیں وبس۔ غرض قرآن کا اصلی اور حقیقی اسلوب جس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ یہ ہے کہ اس کے خطاب کے مورد حقیقی اور واقعی طور پر وہ مسلمان ہیں۔ جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ گو بظاہر صورت خطاب صحابہ کی طرف راجع ہوتا ہے۔ پس جو شخص یہ دعویٰ کرے۔ کہ یہ وعدہ یا وعید صحابہ تک ہی محدود ہے وہ قرآن کے عام محاورہ سے

عدول کرتا ہے۔ اور جب تک پورا ثبوت اس دعوے کا پیش نہ کرے۔ تب تک وہ ایسے طریق کے اختیار کرنے میں ایک ملحد ہے۔ کیا قرآن صرف صحابہ کے واسطے ہی نازل ہوا تھا۔ اگر قرآن کے وعدے اور وعید اور تمام احکام صحابہ تک ہی محدود ہیں۔ تو گویا جو بعد میں پیدا ہوئے وہ قرآن سے بکلی بے تعلق ہیں۔ نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات۔

اور یہ کہنا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خلافت تیس سال تک ہوگی۔ عجیب فہم ہے۔ جس حالت میں قرآن کریم بیان فرماتا ہے۔ کہ ثلۃ من الاولین وثلۃ من الآخرین تو پھر اس کے مقابل پر کوئی حدیث پیش کرنا اور اس کے معنے مخالف قرآن قرار دینا معلوم نہیں کہ کس قسم کی سمجھ ہے اگر حدیث کے بیان پر اعتبار ہے تو پہلے ان حدیثوں پر عمل کرنا چاہیے۔ جو صحت اور وثوق میں اس حدیث پر کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری کی وہ حدیثیں جن میں آخری زمانہ میں بعض خلیفوں کی نسبت خبر دی گئی ہے۔ خاصکر وہ خلیفہ جس کی نسبت بخاری میں لکھا ہے۔ کہ آسمان سے اس کے لئے آواز آئے گی۔ کہ ھٰذا خلیفۃ اللہ المھدی اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ یا مرتبہ کی ہے۔ جو ایسی کتاب میں درج ہے۔ جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ لیکن وہ حدیث جو معترض صاحب نے پیش کی علماء کو اس میں کئی طرح کا جرح ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے۔ کیا معترض نے غور نہیں کی۔ کہ جو آخری زمانہ کی نسبت بعض خلیفوں کے ظہور کی خبریں دی گئی ہیں۔ کہ حارث آئیگا۔ مہدی آئیگا۔ آسمانی خلیفہ آئیگا یہ خبریں حدیثوں میں ہیں۔ یا کسی اور کتاب میں۔ احادیث سے یہ ثابت ہے۔ کہ زمانے تین ہیں اول خلافت راشدہ کا زمانہ۔ پھر فیج اعوج جس میں ملک عضوض ہوں گے اور بعد اس کے آخری زمانہ جو زمانہ نبوت کے نہج پر ہوگا۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا اول زمانہ اور پھر آخری زمانہ باہم بہت ہی مشابہ ہیں۔ اور یہ دونوں زمانے اس بارش کی طرح ہیں۔ جو ایسے خیر اور برکت سے بھری ہوئی ہو۔ کہ کچھ معلوم نہیں کہ برکت اس کے پہلے حصہ میں زیادہ ہے یا پچھلے میں۔

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ اللہ جلشانہ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ یعنے ہم نے اس کتاب کو اتارا۔ اور ہم ہی اس تنزیل کی محافظت کرینگے

اس میں اس بات کی تصریح ہے۔ کہ یہ کلام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اور اس کی تعلیم کو تازہ کرنے والے اور اس کا نفع لوگوں کو پہنچانے والے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کے وجود کا فائدہ کیا ہے۔ جس فائدہ کے وجود پر اس کی حقیقی حفاظت موقوف ہے۔ تو اس دوسری آیت سے ظاہر ہے۔ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بڑے فائدے دو ہیں جن کے پہنچانے کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے تھے۔

ایک حکمت فرقان یعنی معارف و دقائق قرآن دوسری تاثیر قرآن جو موجب تزکیہ نفوس ہے۔ اور قرآن کی حفاظت صرف اسی قدر نہیں جو اس کی صحت مکتوبہ کو خوب نگہبانی سے رکھیں۔ کیونکہ ایسے کام تو اوائل حال میں یہود اور نصاریٰ نے بھی کئے۔ یہاں تک کہ توریت کے نقطے بھی گن رکھے تھے۔ بلکہ اس جگہ معہ حفاظت ظاہری حفاظت فوائد و تاثیرات قرآنی مراد ہے۔ اور وہ موافق سنت اللہ کے تب ہی ہو سکتی ہے۔ کہ جب وقتاً فوقتاً نائب رسول آویں جنمیں ظلی طور پر رسالت کی تمام نعمتیں موجود ہوں۔ اور جن کو وہ تمام برکات دی گئی ہوں۔ جو نبیوں کو دی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ان آیات میں اسی امر عظیم کیطرف اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون۔

پس یہ آیت درحقیقت اس دوسری آیت انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کیلئے لبطور تفسیر کے واقعہ ہے۔ اور اس سوال کا جواب دے رہی ہے۔ کہ حفاظت قرآن کیونکر اور کس طور سے ہوگی۔ سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں اس نبی کریم کے خلیفے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا۔ اور خلیفہ کے لفظ کو اس اشارہ کے لئے اختیار کیا گیا۔ کہ وہ نبی کریم کے جانشین ہوں گے۔ اور اُس کی برکتوں سے حصہ پائیں گے۔ جیسا کہ پہلے زمانوں میں ہوتا

رہا۔ اور ان کے ہاتھ سے برجائی دین کی ہوگی۔ اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا یعنے ایسے وقتوں میں آئیں گے کہ جب اسلام تفرقہ میں پڑا ہوگا۔ پھر ان کے آنے کے بعد جو اُن سے سرکش رہیگا وہی لوگ بدکار اور فاسق ہیں۔ یہ اس بات کا جواب ہے کہ بعض جاہل کہا کرتے ہیں کہ کیا ہم پر اولیاء کا ماننا فرض ہے۔ سو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ بیشک فرض ہے۔ اور اُن سے مخالفت کرنے والے فاسق ہیں۔ اگر مخالفت پر ہی مریں۔

اس جگہ معترض صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی اور پھر اعتراض کیا ہے۔ کہ جب کہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی۔ تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے۔ نہ کسی نبی کی۔ مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کر کے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس امت میں خلیفوں کے پیدا ہونیکا وعدہ کیا ہے۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان کے وقتوں میں دین استحکام پکڑے گا۔ اور تنزلزل اور تذبذب دور ہوگا۔ اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا۔ پھر اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں۔ تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے۔ وہ بھی باطل ٹھیرتی ہے۔ کیونکہ جب دین کامل ہو چکا۔ تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ معترض بیخبر نے ناحق آیت الیوم اکملت لکم دینکم کو پیش کر دیا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ مجدد اور محدث دنیا میں آکر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں۔ یا زیادہ کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے۔ کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے۔ تب اس خوبصورت چہرے کو دکھلانے کے لئے مجدد اور محدث اور روحانی خلیفے آتے ہیں۔ نہ معلوم کہ ... بیچارے معترض نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا۔ کہ مجدد اور روحانی خلیفے دنیا میں آکر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں۔ نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے۔ بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں۔ اور معترض کا یہ خیال کہ اُنکی ضرورت ہی کیا ہے۔ صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ کہ معترض کو اپنے دین کی پروا نہیں اور کبھی اس نے غور نہیں کی کہ اسلام کیا چیز ہے۔ اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور

حقیقی ترقی کیونکر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے۔ اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے۔ کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معترض صاحب اس بات کو کافی سمجھتے ہیں۔ کہ قرآن موجود ہے۔ اور علماء موجود ہیں۔ اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے۔ پھر کسی مجدد کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجددوں اور روحانی خلیفوں کی اس امت میں ایسے ہی طور پر ضرورت ہے۔ جیسا کہ قدیم سے انبیاء کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے۔ اور ان کی تورات بنی اسرائیل کی تعلیم کے لئے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں آیت الیوم اکملت لکم ہے۔ اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے۔ کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے۔ جس کا نام توریت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے۔ لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے۔ کہ کوئی نئی کتاب اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ بلکہ اُن انبیاء کے ظہور کے مطالب یہ ہوتے تھے۔ کہ تا اُن کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ تعلیم توریت سے دُور پڑ گئے ہوں۔ پھر اُن کو توریت کے اصلی منشاء کی طرف کھینچیں اور جن کے دلوں میں کچھ شکوک اور دہریت اور بے ایمانی ہو گئی ہو۔ اُن کو پھر زندہ ایمان بخشیں۔ چنانچہ اللہ جلشانہ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ ولقد اٰتینا موسی الکتاب و قفینا من بعدہ بالرسل یعنے موسےٰ کو ہم نے توریت دی۔ اور پھر اس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے۔ تا توریت کی تعلیم کی تائید اور تصدیق کریں۔ اسیطرح دوسری جگہ فرماتا ہے۔ ثم ارسلنا رسلنا تترا۔ یعنے پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے درپے بھیجے پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیجکر پھر اس کی تائید اور تصدیق کیلئے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے۔ چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائیبل شہادت دے رہی ہے۔

اس کثرت ارسال رسل میں اصل بھید یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ عہد

موکد ہو چکا ہے۔ کہ جو اس کی سچی کتاب کا انکار کرے۔ تو اس کی سزا دائمی جہنم ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ والذین کفروا وکذبوا بآیتنا اولئک اصحب النار ھم فیھا خلدون یعنے جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی۔ وہ جہنمی ہیں۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اب جبکہ سزائے انکار کتاب الٰہی میں ایسی سخت تھی۔ اور دوسری طرف یہ مسئلہ نبوت اور وحی الٰہی کا نہایت دقیق تھا۔ بلکہ خود خدا تعالےٰ کا وجود بھی ایسا دقیق در دقیق تھا کہ جب تک انسان کی آنکھ خداداد نور سے منور نہ ہو۔ ہرگز ممکن نہ تھا۔ کہ سچی اور پاک معرفت اس کی حاصل ہو سکے۔ چہ جائیکہ اس کے رسولوں کی معرفت اور اس کے کتاب کی معرفت حاصل ہو۔ اس لئے رحمانیت الٰہی نے تقاضا کیا کہ اندھی اور نابینا مخلوق کی بہت ہی مدد کی جائے۔ اور صرف اس پر اکتفا نہ کیا جائے۔ کہ ایک مرتبہ رسول اور کتاب بھیجکر پھر باوجود امتداد ازمنہ طویلہ کے اُن عقاید کے انکار کیوجہ سے جن کو بعد میں آنے والے زیادہ اس سے سمجھ نہیں سکتے۔ کہ وہ ایک پاک اور عمدہ منقولات ہیں ہمیشہ کی جہنم میں منکروں کو ڈالدیا جائے۔ اور درحقیقت سوچنے والے کے لئے یہ بات نہایت صاف اور روشن ہے کہ وہ خدا جس کا نام رحمان اور رحیم ہے۔ اتنی بڑی سزا دینے کے لئے کیونکر یہ قانون اختیار کر سکتا ہے کہ بغیر پورے طور پر اتمام حجت کے مخالف بلاشک ایسے لوگوں کو جنہوں نے صدہا برسوں کے بعد قرآن اور رسول کا نام سُنا۔ اور پھر وہ عربی سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن کی خوبیوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ دائمی جہنم میں ڈالدے۔ اور کس انسان کی کانشنس اس بات کو قبول کر سکتی ہے۔ کہ بغیر اس کے کہ قرآن کریم کا منجانب اللہ ہونا اس پر ثابت کیا جائے۔ یونہی اُسپر چھری پھیر دی جائے۔ پس یہی وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے دائمی خلیفوں کا وعدہ دیا۔ تا وہ ظلی طور پر انوار نبوت پا کر دنیا کو ملزم کریں اور قرآن کریم کی خوبیاں اور اس کی پاک برکات لوگوں کو دکھلاویں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر ایک زمانہ کے لئے اتمام حجت بھی مختلف رنگوں سے ہوا کرتا ہے۔ اور مجدد وقت ان قوتوں اور ملکوں اور کمالات کے ساتھ آتا ہے۔ جو موجودہ مفاسد کا اصلاح پانا ان کمالات

پر موقوف ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ خدا تعالےٰ اسی طرح کرتا رہے گا۔ جب تک کہ اس کو منظور ہے۔ کہ آثار رشد اور اصلاح کے دنیا میں باقی رہیں۔ اور یہ باتیں بے ثبوت نہیں۔ بلکہ نظائر متواترہ اس کے شاہد ہیں۔ اور مختلف بلاد کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں کو چھوڑ کر اگر صرف بنی اسرائیل کے نبیوں اور مرسلوں اور محدثوں پر ہی نظر ڈالی جائے تو ان کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چودہ سو برس کے عرصہ میں یعنے حضرت موسےٰ سے حضرت مسیح تک ہزارہا نبی اور محدث ان میں پیدا ہوئے۔ کہ جو خادموں کیطرح کمربستہ ہو کر توریت کی خدمت میں مصروف رہے۔ چنانچہ اُن تمام بیانات پر قرآن شاہد ہے اور بائیبل شہادت دے رہی ہے۔ اور وہ نبی کوئی نئی کتاب نہیں لاتے تھے۔ کوئی نیا دین نہیں سکھاتے تھے۔ صرف توریت کے خادم تھے۔ اور جب بنی اسرائیل میں دہریت اور بے ایمانی اور بدچلنی اور سنگدلی پھیل جاتی تھی۔ تو ایسے وقتوں میں وہ ظہور کرتے تھے اب کوئی سوچنے والا سوچے کہ جس حالت میں موسےٰ کی ایک محدود شریعت کے لئے جو زمین کی تمام قوموں کیلئے نہیں تھی۔ اور نہ قیامت تک اس کا دامن پھیلا ہوا تھا۔ خدا تعالےٰ نے یہ احتیاطیں کیں۔ کہ ہزارہا نبی اس شریعت کی تجدید کے لئے بھیجے۔ اور بارہا آنے والے نبیوں نے ایسے نشان دکھلائے۔ کہ گویا بنی اسرائیل نے نئے سرے خدا کو دیکھ لیا تو پھر یہ اُمت جو خیر الامم کہلاتی ہے۔ اور خیر الرسل صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دامن سے لٹک رہی ہے۔ کیونکر ایسی بدقسمت سمجھی جائے۔ کہ خدا تعالےٰ نے صرف تئیس برس اس کی طرف نظر رحمت کر کے اور آسمانی انوار دکھلا کر پھر اس سے منہ پھیر لیا۔ اور پھر اس اُمت پر اپنے نبی کریم کی مفارقت میں صدہا برس گذرے اور ہزارہا طور کے فتنے پڑے اور بڑے بڑے زلزلے آئے۔ اور انواع اقسام کی دجالیت پھیلی۔ اور ایک جہان نے دین متین پر حملے کئے۔ اور تمام برکات اور معجزات سے انکار کیا گیا۔ اور مقبول کو نامقبول ٹھیرایا گیا لیکن خدا تعالےٰ نے پھر کبھی نظر اُٹھا کر اس امت کی طرف نہ دیکھا۔ اور اس کو کبھی اس اُمت پر رحم نہ آیا۔ اور کبھی اسکو یہ خیال نہ آیا کہ یہ لوگ بھی تو بنی اسرائیل کیطرح انسان ضعیف البنیان ہیں۔ اور یہودیوں کیطرح اُن کے پودے بھی آسمانی آبپاشی کے ہمیشہ

محتاج ہیں۔ کیا اس کریم خدا سے ایسا ہو سکتا ہے۔ جس نے اُس نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ کے مفاسد دُور کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ کیا ہم یہ گمان کر سکتے ہیں کہ پہلی امتوں پر تو خدا تعالےٰ کا رحم تھا۔ اس لئے اس نے توریت کو بھیج کر ہزارہا رسول اور محدث توریت کی تائید کیلئے اور دلوں کو بار بار زندہ کرنے کے لئے بھیجے لیکن یہ اُمت مورد غضب تھی اس لئے اس نے قرآن کریم کو نازل کر کے ان سب باتوں کو بھلا دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے علماء کو انکی عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا۔ اور حضرت موسےٰ کی نسبت تو صاف فرمایا۔

وکلم اللہ موسٰی تکلیما رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل وکان اللہ عزیزا حکیما یعنی خدا موسےٰ سے ہمکلام ہوا اور اس کی تائید اور تصدیق کے لئے رسُول بھیجے۔ جو مبشر اور منذر تھے۔ تاکہ لوگوں کی کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور نبیوں کا مسلسل گروہ دیکھ کر توریت پر دلی صدق سے ایمان لادیں اور فرمایا۔ ورسلا قد قصصناھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک۔ یعنی ہم نے بہت سے رسول بھیجے۔ اور بعض کا تو ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر بھی نہیں کیا۔ لیکن دین اسلام کے طالبوں کے لئے وہ انتظام نہ کیا۔ گویا جو رحمت اور عنایت باری حضرت موسےٰ کی قوم پر تھی۔ وہ اس امت پر نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ امتداد زمانہ کے بعد پہلے معجزات اور کرامات قصہ کے رنگ میں ہو جاتی ہیں۔ اور پھر آنے والی نسلیں اپنے گروہ کو ہر یک امر خارق عادت سے بے بہرہ دیکھ کر آخر گذشتہ معجزات کی نسبت شک پیدا کرتی ہیں۔ پھر جس حالت میں بنی اسرائیل کے ہزارہا انبیا کا نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ تو اس سے اور بھی بیدلی اس اُمت کو پیدا ہوگی۔ اور اپنے تئیں بد قسمت پاکر بنی اسرائیل کو رشک کی نگہ سے دیکھینگے۔ یا بد خیالات میں گرفتار ہو کر اُن کے قصوں کو بھی صرف افسانجات خیال کریں گے۔ اور یہ قول کہ پہلے اس سے ہزارہا انبیا ہو چکے اور معجزات بھی بکثرت ہوئے اس لئے اس اُمت کو خوارق اور کرامات اور برکات کی کچھ ضرورت نہیں تھی۔ لہذا خدا تعالیٰ نے ان کو سب باتوں سے محروم رکھا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ جنہیں وہ لوگ منہہ پر لاتے ہیں۔ جن کو ایمان کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔ ورنہ انسان

نہایت ضعیف اور ہمیشہ تقویت ایمان کا محتاج ہے۔ اور اس راہ میں اپنے خود ساختہ دلائل کبھی کام نہیں آسکتے۔ جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے۔ ہاں جھوٹا ایمان جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا۔ نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اس بات کو مستلزم نہیں کہ جو اس کی مناسب حفاظت سے بکلی دست بردار ہو جائے۔ مثلاً اگر کوئی گھر بنائے۔ اور اس کے تمام کمرے سلیقہ سے طیار کرے۔ اور اس کی تمام ضرورتیں جو عمارت کے متعلق ہیں۔ باحسن وجہ پوری کر دیوے اور پھر مدت کے بعد اندھیریاں چلیں۔ اور بارشیں ہوں۔ اور اس گھر کے نقش و نگار پر گرد و غبار بیٹھ جاوے۔ اور اس کی خوبصورتی چھپ جاوے۔ اور پھر اس گھر کا کوئی وارث اس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے مگر اس کو منع کر دیا جاوے۔ کہ گھر تو مکمل ہو چکا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے۔ افسوس کہ ایسے اعتراض کرنے والے نہیں سوچتے کہ تکمیل شے دیگر ہے اور وقتاً فوقتاً ایک مکمل عمارت کی صفائی کرانا یہ اور بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجدد لوگ دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے۔ ہاں گم شدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں۔ اور یہ کہنا کہ مجددوں پر ایمان لانا کچھ فرض نہیں۔ خدا تعالٰی کے حکم سے انحراف ہے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون یعنے بعد اس کے جو خلیفے بھیجے جائیں پھر جو شخص ان کا منکر رہے۔ وہ فاسقوں میں سے ہے۔

اب خلاصہ اس تمام تقریر کا کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ دلائل مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امت میں فساد اور فتنوں کے وقتوں میں ایسے مصلح آتے رہیں جن کو انبیاء کے کئی کاموں میں سے یہ ایک کام سپرد ہو۔ کہ وہ دین حق کی طرف دعوت کریں اور ہر ایک بدعت جو دین سے مل گئی ہو۔ اس کو دور کریں۔ اور آسمانی روشنی پا کر دین کی صداقت ہر پہلو سے لوگوں کو دکھلاویں۔ اور اپنے پاک نمونہ سے لوگوں کو سچائی اور محبت اور پاکیزگی کی طرف کھینچیں :۔

شہادت القرآن صفحہ ۲۸ تا ۴۸

" پھر بعض اور آیات ہیں. جن سے ثابت ہوتا ہے. کہ ضرور خداوند کریم نے یہی ارادہ فرمایا ہے
کہ روحانی معلم جو انبیاء کے وارث ہیں ہمیشہ ہوتے رہیں. اور وہ یہ ہیں. وعد اللہ الذین
آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من
قبلھم ولا یزال الذین کفروا تصیبھم بما صنعوا قارعۃ او تحل قریبًا من دارھم
حتّٰی یاتی وعد اللہ ان اللہ لا یخلف المیعاد الجزو نمبر ۱۳. وما کنا معذبین
حتّٰی نبعث رسولا. یعنی خدا تعالٰے نے تمہارے لئے اے مومنان امت محمدیہ وعدہ
کیا ہے. کہ تمہیں بھی وہ زمین میں خلیفہ کرے گا. جیسا کہ تم سے پہلوں کو کیا اور ہمیشہ
کفار پر کسی قسم کی کوفتیں جسمانی ہوں یا روحانی پڑتی رہینگی. یا اُن کے گھر سے نزدیک
آجائینگی. یہاں تک کہ خدا تعالٰے کا وعدہ آپہنچیگا اور خدا تعالٰے اپنے وعدوں میں
تخلف نہیں کرتا. اور ہم کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے. جب تک ایک رسول
بھیج نہ لیں:.

ان آیات کو اگر کوئی شخص تامل اور غور کی نظر سے دیکھے تو میں کیونکر کہوں کہ وہ
اس بات کو سمجھ نہ جائے. کہ خدا تعالٰے اس اُمت کے لئے خلافت دائمی کا صاف
وعدہ فرماتا ہے. اگر خلافت دائمی نہیں تھی. تو شریعت موسوی کے خلیفوں سے
تشبیہ دینا کیا معنے رکھتا تھا. اور اگر خلافت راشدہ صرف تیس برس تک رہکر پھر ہمیشہ
کیلئے اسکا دور ختم ہوگیا تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالٰے کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ
اس اُمت پر ہمیشہ کیلئے ابواب سعادت مفتوح رکھے. کیونکہ روحانی سلسلہ کی
موت سے دین کی موت لازم آتی ہے. اور ایسا مذہب ہرگز زندہ نہیں کہلا سکتا
جس کے قبول کرنے والے خود اپنی زبان سے ہی یہ اقرار کریں کہ تیرہ سو برس سے یہ مذہب
مرا ہوا ہے. اور خدا تعالٰے نے اس مذہب کے لئے ہرگز ارادہ نہیں کیا. کہ حقیقی زندگی
کا وہ نور جو نبی کریمؐ کے سینہ میں تھا. وہ توارث کے طور پر دوسروں میں چلا آوے.
افسوس کہ ایسے خیال پر جمنے والے خلیفے کے لفظ کو بھی جو استخلاف سے مفہوم ہوتا ہے
تدبر سے نہیں سوچتے. کیونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں. اور رسول کا جانشین حقیقی معنوں

کے لحاظ سے وہی ہو سکتا ہے۔ جو ظلی طور پر رسول کے کمالات اپنے اندر رکھتا ہو۔ اس واسطے رسول کریمؐ نے نہ چاہا کہ ظالم بادشاہوں پر خلیفہ کا لفظ اطلاق ہو۔ کیونکہ خلیفہ درحقیقت رسول کا ظل ہوتا ہے۔ اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں۔ لہٰذا خدا تعالےٰ نے ارادہ کیا۔ کہ رسولوں کے وجود کو جو تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف واولےٰ ہیں۔ ظلی طور پر ہمیشہ کیلئے تا قیامت قائم رکھے۔ سو اسی غرض سے خدا تعالےٰ نے خلافت کو تجویز کیا۔ تا دنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکات رسالت سے محروم نہ رہے۔ پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے۔ وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علت غائی کو نظرانداز کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ خدا تعالےٰ کا یہ ارادہ تو ہرگز نہیں تھا کہ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے۔ پھر بعد اس کے دنیا تباہ ہو جائے۔ کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ پہلے دنوں میں تو خلیفوں کا ہونا بجز شوکت اسلام پھیلانے کے کچھ اور زیادہ ضرورت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ انوار رسالت اور کمالات نبوت تازہ بتازہ پھیل رہے تھے اور ہزارہا معجزات بارش کیطرح ابھی نازل ہو چکے تھے۔ اور اگر خدا تعالےٰ چاہتا تو اس کی سنت اور قانون سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ بجائے ان چار خلیفوں کے اُس تیس برس کے عرصہ تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کو ہی بڑھا دیتا۔ اس حساب سے تیس برس کے ختم ہوتے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل ۹۳ برس کی عمر تک پہنچتے۔ اور یہ اندازہ اس زمانہ کی مقررہ عمروں سے نہ کچھ زیادہ اور نہ اس قانون قدرت سے کچھ بڑھ کر ہے۔ جو انسانی عمروں کے بارے میں ہماری نظر کے سامنے ہے۔

پس یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اس کو صرف اس امت کے تیس برس کا ہی فکر تھا۔ اور پھر انکو ہمیشہ کیلئے ضلالت میں چھوڑ دیا۔ اور وہ نور جو قدیم سے انبیاء سابقین کی امت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا۔ اس امت کیلئے دکھلانا اس کو منظور نہ ہوا۔ کیا عقل سلیم خدائے رحیم و کریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی ہرگز نہیں۔ اور پھر یہ آیت خلافت آئمہ پر گواہ ناطق ہے۔ ولقد کتبنا فی الزبور من

بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون۔ کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اسلامی خلافت دائمی ہے۔ اس لئے کہ یرثہا کا لفظ دوام کو چاہتا ہے وجہ یہ کہ اگر آخری نوبت فاسقوں کی ہو۔ تو زمین کے وارث وہی قرار پائیں گے۔ نہ صالح اور سب کا وارث وہی ہوتا ہے کہ جو سب کے بعد ہو۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جس حالت میں خدا تعالےٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا۔ کہ میں اسی طور پر اُمت کے خلیفے پیدا کرتا رہوں گا۔ جیسے موسےٰ کے بعد خلیفے پیدا کئے۔ تو دیکھنا چاہئے تھا کہ موسےٰ کی وفات کے بعد خدا تعالےٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اُس نے صرف تیس برس تک خلیفے بھیجے۔ یا چودہ سو برس تک اس سلسلہ کو لمبا کیا۔ پھر جس حالت میں خدا تعالےٰ کا فضل ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت موسےٰ علیہ السّلام سے کہیں زیادہ تھا چنانچہ اُس نے خود فرمایا وکان فضل اللہ علیک عظیماً۔ اور ایسا ہی اس اُمت کی نسبت فرمایا۔ کنتم خیر اُمۃٍ اُخرجت للنّاس تو پھر کیونکر ہو سکتا تھا۔ کہ حضرت موسےٰ کے خلیفوں کو چودہ سو برس تک سلسلہ ممتد ہو اور اس جگہ صرف تیس برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جاوے۔ اور نیز جبکہ یہ اُمت خلافت کے انوار روحانی سے ہمیشہ کے لئے خالی ہے۔ تو پھر آیت اُخرجتْ للنّاس کے کیا معنے ہیں۔ کوئی بیان تو کرے بمثل مشہور ہے کہ او خویشتن گم است کرا رہبری کند جبکہ اس اُمت کو ہمیشہ کیلئے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مردہ رکھنا ہی نظر ہے۔ تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو۔ اور لوگوں کی بھلائی اور راہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ کیا معنے رکھتا ہے۔ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے۔ سوا ے لوگو جو مسلمان کہلاتے ہو۔ برائے خدا سوچو کہ اس آیت کے یہی معنے ہیں۔ کہ ہمیشہ قیامت تک تم میں روحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی۔ اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے۔ اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی جو غیر مذہب والوں کو حق کی دعوت کرنے کے لئے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے۔ جسکو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں۔ پھر کیونکر کہتے ہو۔ کہ خلافت صرف تیس برس تک ہو کر

پھر زاویہ عدم میں مخفی ہو گئی۔ اتقوا اللہ! اتقوا اللہ! اتقوا اللہ!! صفحہ ۷۸ تا ۷۹ شہادۃ القرآن

" مماثلت تامہ کا ملہ استخلاف محمدی کی استخلاف موسوی مسیح موعود کا آنا ضروری ٹھہراتی ہے۔ جیسا کہ آیت مندرجہ ذیل سے مفہوم ہوتا ہے۔ یعنی آیت وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم صاف بتلا رہی ہے کہ ایک مجدد حضرت مسیح کے نام پر چودھویں صدی میں آنا ضروری ہے۔ کیونکہ امر استخلاف محمدی امر استخلاف موسوی سے اسی حالت میں اکمل اور اتم مشابہت پیدا کر سکتا۔ کہ جبکہ اوّل زمانہ اور آخری زمانہ باہم نہایت درجہ کی مشابہت رکھتے ہوں۔ اور آخری زمانہ کی مشابہت دو باتوں میں تھی۔ ایک امت کا حال ابتر ہونا اور دنیا کے اقبال میں ضعف آجانا۔ دینی دیانت اور تقوٰی میں فرق آجانا۔ دوسرے ایسے زمانہ میں ایک مجدد کا پیدا ہونا۔ جو مسیح موعود کے نام پر آئے۔ اور ایمانی حالت کو پھر بحال کرے۔ سو پہلی حالت کو ہمارے بھائی مسلمان صرف قبول ہی نہیں کرتے۔ بلکہ مسلمانوں کے ادبار اور ایک ایسی غیر قوم کا اقبال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ شہادۃ القرآن صفحہ ۶۲

" اور میں ایسے وقت میں آیا۔ جبکہ اندرونی حالت اکثر مسلمانوں کی یہودیوں کی طرح خراب ہو چکی تھی۔ اور روحانیت گم ہو کر صرف رسوم اور رسم پرستی ان میں باقی رہ گئی تھی۔ اور قرآن شریف میں ان امور کی طرف پہلے سے اشارہ کیا گیا تھا۔ جیسا کہ ایک جگہ مسلمانوں کے آخری زمانہ کے لئے قرآن شریف نے وہ لفظ استعمال کیا ہے۔ جو یہود کیلئے استعمال کیا تھا یعنی فرمایا۔ فینظر کیف تعملون جس کے یہ معنے ہیں کہ تم کو خلافت اور سلطنت دی جاویگی مگر آخری زمانہ میں تمہاری بد اعمالی کیوجہ سے وہ سلطنت تم سے چھین لی جاویگی جیسا کہ یہودیوں سے چھین لیگئی تھی۔ اور پھر سورۃ نور میں صریح اشارہ فرماتا ہے۔ کہ ہر ایک رنگ میں جیسے بنی اسرائیل میں خلیفے گذرے ہیں وہ تمام رنگ اس امت کے خلیفوں میں بھی ہوں گے۔ چنانچہ اسرائیلی خلیفوں میں سے حضرت عیسٰی ایسے خلیفے تھے۔ جنہوں نے نہ

تلوار اٹھائی۔ اور نہ جہاد کیا۔ سو اس امت کو بھی اسی رنگ کا مسیح موعود دیا گیا دیکھو آیت وعد اللہ الذین آمنوا الآیۃ اس آیت میں فقرہ کما استخلف الذین من قبلھم قابل غور ہے۔ کیونکہ اس سے سمجھا جاتا ہے۔ کہ محمدی خلافت کا سلسلہ موسوی خلافت کے سلسلہ سے مشابہ ہے۔ اور چونکہ موسوی خلافت کا انجام ایسے نبی پر ہوا یعنی حضرت عیسےٰ پر جو حضرت موسےٰ سے چودھویں صدی کے سر پر آیا۔ اور نیز کوئی جنگ۔ اور جہاد نہیں کیا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدی کا بھی اسی شان کا ہو۔

لکچر سیالکوٹ۔ صفحہ ۱۲

"پھر بعد اس کے تمہیں معلوم ہو اے دانشمند! کہ خدا نے قرآن شریف میں یہ ذکر کیا کہ اس نے پہلی امتوں کے ہلاک کر دینے کے بعد موسےٰ کو پیدا کیا۔ اور اسکو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی۔ اور اس کی قوم کو خلافت بخشی۔ اور ان میں سلسلہ ہدایت کا قائم کیا۔ اور اس سلسلہ کا خاتم الخلفاء حضرت عیسےٰ کو بنایا۔ پس حضرت عیسےٰ اس عمارت کی آخری اینٹ تھے۔ اور ایک دلیل تھے۔ اس عمارت کے زوال کی گھڑی پر اور ایک عبرت تھے۔ اس شخص کے لئے جو ڈرتا ہو۔ پھر خدا نے ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مکہ کی زمین میں مبعوث فرمایا۔ اور ان کو مثیل موسےٰ علیہ السلام بنایا۔ اور ان کے خلیفوں کا سلسلہ حضرت موسےٰ کے خلیفوں کے سلسلہ کی طرح اور ان کے مشابہ کر دیا۔ تاکہ یہ سلسلہ اس سلسلہ کا مددگار رہو۔ اور اس میں دیکھنے والوں کے لئے ایک نشان ہے۔ اور اگر تو چاہے۔ تو اس آیت کو پڑھ لے۔ وعد اللہ الذین آمنوا۔ الآیۃ اور اپنے ہوا و ہوس کا پیرو مت بن۔ کیونکہ اس آیت میں صاف وعدہ اس امت کے لئے ایسے خلیفوں کا ہے۔ جو ان خلیفوں کی طرح ہوں جو بنی اسرائیل میں گذر چکے ہیں۔ اور کریم جب وعدہ کرتا ہے۔ تو اسے پورا کرتا ہے۔ اور ہم ان تمام خلیفوں کے نام نہیں جانتے۔ جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں مگر اس امت کے اور اگلی امتوں کے چند گذرے ہوئے آدمی۔ اور خدا نے ان سب کے نام سے بھی ہم کو اطلاع نہیں دی پس ہم ان پر اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان کے ناموں کی تفصیل کو اپنے خدا کو سونپتے ہیں

مگر ہم قرآن کی نص کی رو سے اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اس بات پر ایمان لا دیں کہ آخری خلیفہ اسی امت میں سے ہو گا۔ اور وہ عیسٰےؑ کے قدم پر آئیگا۔ اور کسی مومن کی مجال نہیں کہ اس کا انکار کرے۔ کیونکہ یہ اس کا انکار نہیں۔ یہ قرآن کریم کا انکار ہے۔ ...... پس حاصل کلام یہ ہے کہ محمدی خلیفوں کا سلسلہ موسوی خلیفوں کے سلسلہ کی مانند واقع ہے اور اسی طرح بلند آسمان کے خدا کی طرف سے قرآن شریف میں وعدہ تھا۔ کس لئے کہ خدا نے اس سے پہلے بنی اسرائیل میں خلیفوں کا سلسلہ قائم کیا۔ اور ان کو خلافت کے لئے قبول کیا۔ اور بنی اسرائیل کو عزت دی۔ اور ان میں نبوت قائم کی۔ اور ان کو لمبی مہلت دی یہاں تک کہ زمانہ دراز ان پر گذر گیا۔ اور انہوں نے تقوٰی کو ترک کیا۔ پس جس وقت کہ چودہ سو برس موسٰے علیہ السلام کی بعثت سے ان پر گذرے۔ وہی موسٰے کہ جس سے خدا ہمکلام ہوا تھا۔ اور جسکو برگزیدہ کیا تھا۔ خدا تعالٰے نے حضرت عیسٰے بن مریم کو بنی اسرائیل میں مبعوث فرمایا۔ اور ان کو بنی اسرائیل کا خاتم الانبیاء ٹھہرایا۔ اور نبوت کی انتقال کی ساعت کے لئے ان کو دلیل ٹھیرایا۔ (خطبہ الہامیہ مترجمہ صفحہ ۳۹۔۴۰)

"وعد اللہ الذین آمنوا الخ یعنے خدا وعدہ دے چکا ہے۔ کہ اس دین میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد خلیفے پیدا کرے گا۔ اور قیامت تک اس کو قائم کریگا یعنے جس طرح موسٰے کے دین میں مدت ہائے دراز تک خلیفے اور بادشاہ بھیجتا رہا۔ ایسا اس جگہ بھی کرے گا۔ اور اسکو معدوم ہونے نہیں دے گا۔ اب قرآن شریف موجود ہے حافظ بیٹھے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ کفار نے کس دعوے کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں۔ کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا۔ اور ہم اسکو نابود کر دیں گے۔ اور ان کے مقابل پر یہ پیشین گوئی کی گئی۔ جو قرآن شریف میں موجود ہے۔ کہ ہرگز تباہ نہیں ہو گا۔ یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائیگا۔ اور پھیل جائے گا۔ اور اس میں بادشاہ ہوں گے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۱۷۳)

"ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور

دشمن زور میں آجاتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اب کام بگڑ گیا۔ اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائے گی۔ اور خود جماعت کے لوگ بھی تردد میں پڑ جاتے ہیں۔ اور انکی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور کئی بدقسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ تب خدا تعالےٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے۔ اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے۔ پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وقت میں ہوا۔ جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی۔ اور بہت سے بادیہ نشین نادان مرتد ہو گئے۔ اور صحابہ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے۔ تب خدا تعالےٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا۔ اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا اور اس وعدہ کو پورا کیا جو فرمایا تھا۔ ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔ یعنے خوف کے بعد پھر ہم ان کے پیر جما دیں گے۔ ایسا ہی حضرت موسےٰ علیہ السلام کے وقت ہوا۔ جبکہ حضرت موسےٰ مصر اور کنعان کی راہ میں پہلے اس سے جو بنی اسرائیل کو وعدہ کے موافق منزل مقصود تک پہنچا دیں فوت ہو گئے۔ اور بنی اسرائیل میں ان کے مرنے سے ایک بڑا ماتم برپا ہوا تھا۔ جیسا کہ توریت میں لکھا ہے۔ کہ بنی اسرائیل اس بے وقت موت کے صدمہ سے اور حضرت موسےٰ کی ناگہانی جدائی سے چالیس دن تک روتے رہے۔ ایسا ہی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا۔ اور صلیب کے واقعہ کے وقت تمام حواری تتر بتر ہو گئے۔ اور ایک ان میں سے مرتد بھی ہو گیا۔ (الوصیت صہ ۶)

"قرآن شریف نے اسرائیلی اور اسماعیلی سلسلوں میں خلافت کا کھلا کھلا اشارہ کیا ہے۔ جیسے اس آیت سے ظاہر ہے۔ وعد اللہ الذین الخ اسرائیلی سلسلہ کا آخری خلیفہ جو چودھویں صدی پر بعد از موسےٰ علیہ السلام آیا۔ وہ مسیح ناصری تھا۔ مقابل میں ضرور تھا۔ کہ اس امت کا مسیح بھی چودھویں صدی کے سر پر آوے۔ الحکم ۳۰ ستمبر ۱۹۰۲ء صہ ۹

۵۶/۲۴ مسیح موعود کی پیشگوئی صرف حدیثوں میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن شریف نے نہایت لطیف اشارت میں آنے والے مسیح کی خوشخبری دی ہے۔ جیساکہ اس نے وعدہ فرمایا ہے۔ کہ جس طرز اور طریق سے اسرائیلی نبوتوں میں سلسلہ خلافت قائم کیا گیا ہے وہی طرز اسلام میں ہوگی (دیکھو آیت وعداللہ الخ حاشیہ میں درج ہے) یہ وعدہ مسیح موعود کے آنے کی خوشخبری اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ جب سلسلہ خلافت انبیاء بنی اسرائیل میں غور کی جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ سلسلہ حضرت موسٰے سے شروع ہوا۔ اور پھر چودہ سو برس بعد حضرت عیسٰے علیہ السّلام پر ختم ہوگیا۔ اور اس نظام خلافت پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہودیوں کا مسیح موعود جس کے آنے کی یہود کو خوشخبری دی گئی تھی۔ چودہ سو برس بعد حضرت موسٰے علیہ السّلام کے آیا۔ اور غریبوں اور مسکینوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اس مماثلت کے پورا کرنے کے لئے جو قرآن شریف میں دونو سلسلہ خلافت اسرائیلی اور خلافت محمدیہ کے آخر میں بھی ایک مسیح موعود کا وعدہ ہو۔ جیساکہ خلافت موسویہ کے آخر میں ایک مسیح موعود کا وعدہ تھا۔ اور نیز تکمیل مشابہت دونوں سلسلوں کے لئے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جیساکہ خلافت موسویہ کے چودہ سو برس کی مدت پر مسیح موعود بنی اسرائیل کے لئے ظاہر ہوا تھا۔ ایسا ہی اور اس مدت کے مشابہ زمانہ میں خلافت محمدیہ کا مسیح موعود ہو ظاہر ہو۔ اور نیز تکمیل مشابہت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیسا یہودیوں کے علماء نے خلافت موسویہ کے مسیح موعود کو نعوذ باللہ کافر اور ملحد اور دجال قرار دیا تھا۔ ایسا ہی خلافت محمدیہ کے مسیح موعود کو اسلامی قوم کے علماء کافر اور ملحد اور دجال قرار دیں اور نیز تکمیل مشابہت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیساکہ خلافت موسویہ کا مسیح موعود ایسے وقت میں آیا تھا۔ کہ جبکہ یہودیوں کی اخلاقی حالت نہایت ہی خراب ہوگئی تھی۔ اور دیانت اور امانت اور تقوٰی اور طہارت اور باہمی محبت اور صلح کاری میں بہت فتور پڑ گیا تھا۔ اور انکی اس ملک کی بھی سلطنت جاتی رہی تھی۔ جس ملک میں مسیح موعود انکی دعوت کیلئے ظاہر ہوا تھا۔ ایسا ہی خلافت محمدیہ کا مسیح موعود قوم کی ایسی حالت اور ایسے ادبار کیوقت ظاہر ہو (ایام الصلح صفحہ ۵۱)

" اتنا نہیں سوچتے کہ اگر وہی عیسےٰ آئے۔ تو پھر تو وہ خاتم الانبیا ہو گیا۔ اگر کوئی کہے کہ تم بھی نبوت کے مدعی ہو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ویسا نبی نہیں ہوں۔ حضرت عیلے علیہ السلام براہ راست خدا کے نبی تھے۔ اور میری نبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واسطے اور فیوض سے ہے۔ پھر وہی عیلے کیونکر آسکتا ہے۔ جبکہ سورۃ نور میں جو آیۃ استخلاف ہے۔ اس میں وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم لکھا ہے۔ اور صحیح بخاری میں بھی امامکم منکم ہے (آخری لیکچر ص۲۱)

" اور اسی زمانہ کے لئے یہ پیشگوئی سورت نور میں موجود ہے۔ ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔ اس آیت کے معنے پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دین پر آخری زمانہ میں ایک زلزلہ آئیگا۔ اور خوف پیدا ہو جائیگا۔ کہ یہ دین ساری زمین پر سے گم نہ ہو جائے۔ تب خدا تعالےٰ دوبارہ اس دین کو روئے زمین پر متمکن کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشدیگا۔

(لیکچر لاہور ص۳۵۔ و اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۹ و ۱۷۲)

" اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب مبین میں فرمایا ہے۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا الخ کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے۔ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ کہ وہ ضرور ان کو زمین پر (اپنے ملک میں) خلیفہ بنائیگا۔ (ایسے ہی خلیفے) جیسا کہ ان سے پہلے بنائے اور ضرور وہ مستحکم و مضبوط کرے گا۔ ان کے دین کو جو اس نے پسند کیا ہے۔ ان کے لئے اور بدلہ دیگا۔ ان کے لئے خوف کو۔ امن سے وہ میری ہی پرستش کریں گے۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گے۔ اور جو شخص کفر و انکار کریگا اس کے بعد پس ایسے تمام لوگ فاسق ہیں۔ اور قائم کرو نماز اور زکوٰۃ دو اور اللہ و رسول کی اطاعت کرو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جاوے۔ (اے رسول) تو خیال نہ کر ان لوگوں کا جو کافر ہوئے۔ کہ وہ عاجز کرنے والے ہیں زمین میں ان کا ٹھکانا تو آگ ہے۔ جو بہت

برا ٹھکانہ ہے ؛

یہ ہے وہ بشارت جو ہمارے رب نے مومنوں کو دی ہے۔ اور مومنوں میں سے خلیفہ بننے والے لوگوں کی علامتیں بتا دی ہیں۔ پس جو شخص اللہ تعالےٰ کی درگاہ میں مانگنے کے لئے آیا۔ اور وہ بیحیائی کے راستے پر گامزن نہیں ہوا۔ اور مکر و فریب کی پٹیاں صراحت کی کلائی پر نہیں باندھیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس دلیل کو قبول کرے اور حیلے بہانے اور جھوٹی باتیں چھوڑ دے۔ اور صالحین کا طریق پکڑے۔

اور لیکن اس کی تفصیل تاکہ تیرے اوپر اس کی برہان ظاہر ہو جائے پس اے صاحبان عقل و فضل جان لو۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ان آیات میں مسلمان مردوں اور عورتوں سے وعدہ کیا ہے۔ کہ وہ ضرور ان میں سے بعض مومنوں کو خلیفہ بنائیگا۔ اور ان کے خوف کو مبدل بہ امن کر دے گا۔ پس یہی وہ بات ہے کہ جسکا مصداق پورے اور کامل طور پر ہم حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کو پاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی خلافت کا زمانہ ایک مصائب و آلام کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ محققین پر مخفی نہیں۔ کیونکہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم وفات پا گئے۔ تو اسلام اور مسلمانوں پر انواع و اقسام کی مصیبتیں نازل ہونی شروع ہو گئیں۔ اور بہت سارے منافق مرتد ہو گئے۔ اور کئی جھوٹے دعویدار نبوۃ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جن کے بہت سارے قبائل متبع ہو گئے۔ اور فتنوں نے ایک جوش مارا۔ اور مشکلات کی کثرت ہو گئی۔ اور قسم قسم کی بلاؤں نے دور و نزدیک سے مسلمانوں پر احاطہ کر لیا۔ اور مومنین ایک سخت زلزلہ کے ساتھ مبتلا کئے گئے۔ اور اس وقت ہر ایک نفس آزمائش میں ڈالا گیا۔ اور دہشت میں ڈالنے والے اور خوف دلانے والے حالات ظاہر ہو گئے۔ اور مومنین اضطرار کی حالت میں ہو چکے۔ گویا ایک انگارا تھا۔ جو ان کے دلوں میں بھڑکایا گیا۔ اور ایسی حالت ہو گئی۔ کہ گویا وہ چھری کے ساتھ ذبح کر دئے گئے ہیں اور کبھی وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فراق میں روتے تھے۔ اور کبھی فتنوں کیوجہ سے جو جلا دینے والی آگ کی طرح ان پر ظاہر ہوئے اور امن و امان کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اور وہ لوگ جن کو فتنہ انگیزوں نے اپنی شرارت سے فتنوں میں مبتلا کر دیا

تھا ایسے مغلوب ہو گئے کہ جیسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ پر گھاس ہوتی ہے۔ پس مومن لوگ گھبراہٹ اور خوف میں زیادہ ہو گئے۔ اور ان کے دل دہشت اور گھبراہٹ سے بھر گئے۔ تو ایسے وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حاکمِ زمان اور خلیفۂ رسول بنائے گئے۔ پس آپ پر ان باتوں کی وجہ سے جو آپ نے ملاحظہ کیں۔ منافق اور کافروں سے سخت ہم و غم سوار ہو گیا۔ اور موسم ربیع کی بارش کی طرح روتے تھے۔ اور آپ کے آنسو چشموں کی طرح بہتے تھے۔ اور رات دن اللہ تعالےٰ سے آپ اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی چاہتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب میرے باپ خلیفہ بنائے گئے اور اللہ تعالیٰ نے امر خلافت آپ کو تفویض کیا۔ تو آپ نے مجرد خلیفہ بنتے ہی فتنوں کو مشاہدہ کیا کہ ہر طرف سے موجزن ہیں۔ اور جھوٹے نبوت کے مدعی جوش میں ہیں۔ اور منافق مرتد لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ آپ پر اس قدر مصائب پڑے کہ اگر پہاڑوں پر اتنی مصیبتیں پڑتیں۔ تو وہ ٹوٹ جاتے۔ اور دم بھر میں چور چور ہو جاتے۔ لیکن آپ کو رسولوں کی طرح ایک صبر عطا کیا گیا۔ یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آئی اور جھوٹے مدعیان نبوت قتل کئے گئے۔ اور مرتد ہلاک کر دئے گئے۔ اور فتنے اور مصائب کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اور امر خلافت مضبوط ہو گیا۔ اور اللہ نے مومنوں کو مصیبت سے نجات دی۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدلدیا۔ اور ان کے دین کو مضبوط کر دیا۔ اور زمانے کو حق پر قائم کر دیا۔ اور مفسدین کے چہرے سیاہ کر دئے گئے۔ اور اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور اپنے بندے صدیق کی مدد کی۔ اور طاغوت اور بتوں کو تباہ کر دیا۔ اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈالدیا۔ پس وہ شکست کھا گئے۔ اور انہوں نے حق کی طرف رجوع کیا۔ اور سرکشی سے توبہ کی۔ اور یہ وعدہ تھا اللہ غالب کی طرف سے جو تمام سچوں سے زیادہ سچا ہے پس تو دیکھ کہ کس طرح خلیفہ بنانے کا وعدہ اپنے تمام لوازم و نشانات کے ساتھ حضرت ابوبکر رض کی ذات میں پورا ہو گیا۔ اور تو اللہ سے دعا کر کہ وہ تیرا سینہ اس تحقیق کے لئے کھولدے۔ اور تو غور کر کہ کیسی خراب حالت تھی مسلمانوں کی جس وقت ابوبکر کو خلیفہ بنایا گیا۔ اور اسلام کن

مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ پھر کس طرح اللہ نے اسلام کو غلبہ دیا۔ اور اس کو ایک گہرے کنوئیں سے نکالا۔ اور جھوٹے نبیوں کو سخت عذاب کے ساتھ قتل کیا گیا۔ اور مرتدین چوپایوں کیطرح ہلاک کر دئے گئے۔ اور اللہ نے مومنین کو امن عطا کیا بجائے خوف کے جس میں وہ مردوں کیطرح پڑے تھے۔ اور پھر کسطرح مومن مسلمان خوش ہوتے تھے اس عذاب کے دور ہونے پر۔ اور مبارکباد دیتے تھے۔ حضرت ابو بکر رض کو۔ اور مرحبا و خوش آمدید کہتے تھے اس کو۔ اور تعریف کرتے تھے۔ اور اس کی تعظیم و تکریم میں جلدی کرتے تھے۔ اور اس کی محبت اپنے دلوں میں بٹھاتے تھے۔ اور تمام باتوں میں اس کی اطاعت کرتے تھے۔ اور اس کے شکر گذار تھے۔ اور انہوں نے اپنے دلوں کو جلا دی اور اپنی کھیتوں کو سیراب کیا۔ اور محبت میں بڑھ گئے۔ اور خوب جدوجہد سے اس کی اطاعت کی۔ اور وہ اس کو مبارک اور انبیاء کی طرح مؤید سمجھا کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ صدیق کی سچائی اور گہرے یقین کے سبب سے تھا۔ اور بخدا وہ اسلام کے لئے آدم ثانی اور خیر الانام کے انوار کے لئے مظہر اول تھا۔ اور وہ نبی نہیں تھا۔ ولیکن انبیاء کے قویٰ اس میں تھے۔ اور اس کی سچائی ہی کے سبب اسلام کا گلشن اپنی کامل تروتازگی کیطرف لوٹا۔ اور اسلام نے اپنی زینت اور ٹھنڈک تیروں کے صدمات کے بعد حاصل کی۔ اور زنگارنگ کے اس کے پھول پیدا ہوئے۔ اور اس کی شاخیں غبار سے صاف ہو گئیں۔ اور اسلام اس سے قبل ایک میّت کی مانند تھا۔ کہ جس پر مذبہ کیا جا چکا ہو۔ اور ایک قحط کے بھگائے ہوئے اور مصائب سے زخمی اور سفروں سے ذبح کئے ہوئے اور قسما قسم کی تھکان سے دُکھ دئے ہوئے اور شعلوں والی دوپہر کے جلے بھنے ہوئے کی مانند تھا۔ پھر خدا تعالیٰ نے اس کو ان تمام مصائب سے نجات دی۔ اور تمام آفات سے اس کو چھڑا دیا۔ اور عجیب تائیدات سے اس کی تائید کی۔ یہاں تک کہ اسلام نے بادشاہوں کا قصد کیا۔ اور گردنوں کا مالک ہو گیا۔ اس کے بعد کہ وہ درماندہ ہو گیا تھا۔ اور خاک پر بچھ گیا تھا۔ پس منافقوں کی زبانیں باندھی گئیں۔ اور مومنوں کے چہرے چمک اُٹھے اور ہر ایک نفس نے اپنے رب کی حمد کی۔ اور صدیق کا شکر بجالایا۔ اور اس کے پاس مطیع

ہو کر بر خلاف کافر کے اور اس شخص کے جو کہ فاسقوں سے تھا۔ آیا۔ اور یہ سب کچھ اس بندہ کا اجر تھا۔ کہ جس کو خدا تعالےٰ نے چن لیا تھا۔ بعد اس کے ساتھ خالص دوستی کا ٹھی تھی اور اس سے راضی ہوا تھا۔ اور اس کو عافیت بخشی تھی۔ اور خدا تعالےٰ محسنوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا ؂

پس حاصل مقصد یہ ہے کہ یہ تمام آیات صدیق رضؓ کی خلافت کی خبر دے رہی ہیں۔ اور ان کا کوئی اور مصداق نہیں ہے۔ پس آپ تحقیق کی نظر سے اس عاجز پر غور کیجئے اور خوف خدا کیجئے۔ اور متعصب مت بنئے۔ پھر دیکھئے کہ یہ تمام آیات آئندہ کی پیشگوئیاں ہیں تاکہ ان کے ظہور کے وقت مومنوں کا ایمان بڑھ جائے۔ اور وہ حضرت باری تعالےٰ کے وعدوں کو پہچان لیں۔ پس ضرور خدا تعالےٰ نے ان آیات میں یہ خبر دی۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد فتنے ہوں گے۔ اور اسلام پر مصائب ٹوٹیں گے اور ان میں یہ وعدہ تھا۔ کہ وہ ضرور اس زمانہ میں بعض مومنوں کو خلیفہ بنائے گا۔ اور بعد خوف کے ان کو امن دے گا۔ اور ان کے متزلزل دین کو تقویت بخشیگا۔ اور مفسدین کو ہلاک کرے گا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اس پیشگوئی کا مصداق حضرت ابو بکر رضؓ اور ان کے زمانہ کے سوا کوئی نہیں۔ پس انکار مت کیجئے اور دلیل تو ظاہر ہو گئی ہے کہ ابو بکر رضؓ نے اسلام کو اس حالت میں پایا تھا۔ کہ گویا وہ ایسی دیوار ہے کہ شریر لوگوں کے شر کے سبب گر پڑنے کو ہے۔ پس خدا تعالےٰ نے اس کو صدیقؓ کے ہاتھوں ایک چونہ گچ مضبوط اونچے قلعہ کی طرح بنا دیا۔ کہ جس کی چھتیں لوہے کی ہیں۔ اور انہیں غلاموں کیطرح فرمانبردار فوج ہے۔ پس غور کیجئے کہ کیا اس میں آپ کے لئے کوئی شک کی گنجائش ہے۔ یا اس کی نظیر کا پچھلی جماعتوں میں ہونا آپ کے نزدیک ممکن ہے۔

ترجمہ سر الخلافۃ صفحہ ۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الفرقان مکیۃ وھی سبع وسبعون اٰیۃ

۵/۲۵ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ
لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ
فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝
وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ
شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ
ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا
نُشُوْرًا ۝

خدا تعالیٰ اپنی ہر ایک صفت میں واحد لاشریک ہے۔ اپنی صفت الوہیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ فرقان کریم کی آیات بینات میں اس قدر اس مضمون کی تائید پائی جاتی ہے جو کسی پر مخفی نہیں۔ جیسا کہ وہ عزاسمہ ان آیات میں فرماتا ہے یعنے خدا وہ خدا ہے۔ جو تمام زمین وآسمان کا اکیلا مالک ہے۔ کوئی اس کا حصہ دار نہیں اس کا کوئی بیٹا نہیں۔ اور نہ اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک۔ اور اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ اور پھر ایک حد تک اس کے جسم اور اس کی طاقتوں اور اس کی عمر کو محدود کرتا ہے اور مشرکوں نے بجز اس خدائے حقیقی کے اور ایسے ایسے خدا مقرر کر رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ آپ پیدا شدہ مخلوق ہیں۔ اپنے ضرر اور نفع کے مالک نہیں ہیں۔ اور نہ موت اور زندگی اور جی اٹھنے کے ہیں۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ صاف صاف طور پر فرما رہا ہے۔ کہ بجز میرے کوئی اور خالق نہیں اس جگہ ظاہر ہے۔ کہ اگر کسی مخلوق کو موت اور حیات کا مالک بنا دینا اور اپنی صفات میں شریک کر دینا اسکی

عادت میں داخل ہوتا تو وہ بطور استثنار ایسے لوگوں کو ضرور باہر رکھ لیتا اور ایسی علی توحید کی ہمیں ہرگز تعلیم نہ دیتا۔ (ازالہ اوہام ص۳۱۵)

" اور اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے۔ کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقرری میں محصور اور محدود پیدا کیا ہے۔ جس سے وجود اس ایک فاطر اور محدّد کا ثابت ہوتا ہے۔

براہین احمدیہ صفحہ ۳۳۵

" قرآن شریف نے وید کی طرح بے وجہ اور محض زبردستی کے طور پر اللہ جلشانہ کو تمام ارواح اور ہر ایک ذرہ ذرہ اجسام کا مالک نہیں ٹھیرایا۔ بلکہ اس کی ایک وجہ بیان کی ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ لہ ملك السمٰوات والارض. خلق کل شیٔ فقدرہٗ تقدیرا یعنی زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے۔ سب خدا تعالےٰ کی ملکیت ہے۔ کیونکہ وہ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اور پھر ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔ تا محدود چیزیں ایک محدّد پر دلالت کریں۔ جو خدا تعالیٰ ہے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اجسام اپنے اپنے حدود میں مقید ہیں۔ اور اس حد سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ارواح بھی مقید ہیں۔ اور اپنی مقررہ طاقتوں سے زیادہ کوئی طاقت نہیں پیدا کر سکتے۔ اب پہلے ہم اجسام کے محدود ہونے کے بارہ میں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ مثلاً چاند ایک مہینے میں اپنا دورہ ختم کر لیتا ہے۔ یعنی انتیس یا تیس دن تک۔ مگر سورج تین سو چونسٹھ دن میں اپنے دورہ کو پورا کرتا ہے۔ اور سورج کو یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ اپنے دورہ کو اس قدر کم کرے۔ جیسا کہ چاند کے دورہ کا مقدار ہے۔ اور نہ چاند کی یہ طاقت ہے کہ اس قدر اپنے دورہ کے دن بڑھا دے کہ جس قدر سورج کے لئے دن مقرر ہیں۔ اور اگر تمام دنیا اس بات کیلئے اتفاق بھی کرے کہ ان دونوں نیّروں کے لئے کچھ کمی بیشی کر دیں۔ تو یہ ہرگز ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ اور نہ خود سورج اور چاند میں یہ طاقت ہے کہ اپنے اپنے دوروں میں کچھ تغیر تبدل کر ڈالیں

پس وہ ذات جس نے ان ستاروں کو اپنی اپنی حد پر ٹھیرا رکھا ہے۔ یعنی جو ان کا محدد اور حد باندھنے والا وہی خدا ہے۔ ایسا ہی انسان کے جسم اور ہاتھی کے جسم میں بڑا فرق ہے۔ اگر تمام ڈاکٹر اس بات کیلئے اکٹھے ہوں۔ کہ انسان اپنی جسمانی طاقتوں اور جسم کی ضخامت میں ہاتھی کے برابر ہو جاوے۔ تو یہ ان کے لئے غیر ممکن ہے۔ اور اگر یہ چاہیں کہ ہاتھی محض انسان کے قد تک محدود رہے۔ تو یہ بھی ان کے لئے غیر ممکن ہے۔ پس اس جگہ بھی ایک تحدید ہے یعنی حد باندھنا جیسا کہ سورج اور چاند میں ایک تحدید ہے۔ اور وہی تحدید ایک محدد یعنی حد باندھنے والے پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اس ذات پر دلالت کرتی ہے۔ جس نے ہاتھی کو وہ مقدار بخشا۔ اور انسان کے لئے وہ مقدار مقرر کیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ان تمام جسمانی چیزوں میں عجیب طور پر اس کی حد بندی مشاہدہ ہوتی ہے۔ ان کیڑوں کی مقدار سے لیکر جو بغیر دوربین کے دکھائی نہیں دے سکتے۔ ان بڑی بڑی مچھلیوں کی مقدار تک جو ایک بڑے جہاز کو بھی چھوٹے سے لقمے کی طرح نگل سکتی ہیں۔ جسمانی اجسام میں ایک عجیب نظارہ حد بندی کا نظر آتا ہے۔ کوئی جانور اپنے جسم کی رو سے اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی وہ تمام ستارے جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ اپنی اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے۔ پس یہ حد بندی دلالت کر رہی ہے۔ کہ در پردہ کوئی حد باندھنے والا ہے۔ یہی معنے اس مذکورہ بالا کی آیت کے ہیں۔ کہ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ○

اب واضح ہو کہ جیسا کہ یہ حد بندی اجسام میں پائی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ حد بندی ارواح میں بھی ثابت ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ جس قدر انسانی رُوح اپنے کمالات پر ظاہر کر سکتا ہے۔ یا یوں کہو کہ جس قدر کمالات کی طرف ترقی کر سکتا ہے۔ وہ کمالات ایک ہاتھی کے روح کو باوجود ضخیم اور جسیم ہونے کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہر ایک حیوان کی رُوح بلحاظ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے اپنے نوع کے دائرہ کے اندر محدود ہے۔ اور وہی کمالات حاصل کر سکتے ہیں۔ کہ جو اس کے نوع کے لئے مقرر اور مقدر ہیں۔ پس جسطرح اجسام کی حد بندی اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ ان کا کوئی حد باندھنے والا اور خالق

ہے۔ اسی طرح ارواح کی طاقتوں کی حد بندی اس بات پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ ان کا بھی کوئی خالق اور حد باندھنے والا ہے۔ اور اس جگہ تناسخ کا لغو اور بیہودہ جھگڑا پیش کرنا خدا تعالےٰ کے کاموں میں اختلاف ڈالنا ہے۔ کیونکہ عقل صریح شہادت دیتی ہے۔ کہ یہ دونوں حد بندیاں ایک ہی انتظام کے ماتحت ہیں۔ اور ان دونوں حد بندیوں سے ایک ہی مقصود ہے۔ اور وہ یہ کہ تا حد بندی سے حد باندھنے والے کا پتہ لگ جائے۔ اور تا معلوم ہو جائے کہ جیسا کہ وہ اجسام کا خالق اور حد باندھنے والا ہی ایسا ہی وہ ارواح کا خالق اور حد باندہنے والا ہے (چشمہ معرفت ص۹)

"فرماتا ہے۔ لتکون للعالمین نذیرا۔ یعنے ہم نے اس لئے بھیجا ہے۔ کہ تمام دنیا کو ڈراوے۔ لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا۔ اس کے منہ سے بھی یہی نکلا۔ کہ میں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اور کسی کیطرف نہیں بھیجا گیا۔ اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی۔ کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغ عام کا عین موقعہ پر ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغ عام کا دروازہ کھل گیا تھا۔ چشمہ معرفت ص۶۸

"یہ آیت بھی روحوں کا مخلوق ہونا ثابت کرتی ہے۔ وخلق کل شیئ فقدرہٗ تقدیرا۔ یعنے خدا وہ ہے کہ جس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور کوئی چیز اس کی پیدائش سے باہر نہیں۔ اور اس نے پیدا کر کے ہر ایک کے جسم اور طاقتوں اور قوتوں اور خواص اور صورت اور شکل کو ایک حد کے اندر محدود کر دیا۔ تا اس کا محدود ہونا محدد پر دلالت کرے۔ جو ذات باری عزاسمہ ہے۔ مگر آپ وہ غیر محدود ہے۔ اسلئے اس کی نسبت سوال نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کا محدد کون ہے۔ غرض آیت ممدوحہ بالا میں خدا تعالےٰ نے صاف فرما دیا کہ ہر ایک چیز جو ظہور پذیر ہوئی ہے۔ معہ اپنی تمام قوتوں

اور طاقتوں کے خدا کی پیدا کردہ ہے۔ پس یہی کامل توحید ہے۔ جو خدا تعالےٰ کو تمام فیوض کا سرچشمہ قرار دیتی ہے۔ اور کوئی ایسی چیز قرار نہیں دیتی جو اسکی پیدا کردہ نہیں یا اسی کے سہارے سے جیتی نہیں (چشمہ معرفت ص۱۵۶)

" دلیل دوم۔ جو انی ہے۔ یعنی معلول سے علت کی طرف دلیل لیگئی ہے۔ دیکھو سورۃ الفرقان لم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیئ فقدرہ تقدیرا۔ یعنے اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک نہیں، وہ سب کا خالق ہے۔ اور اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقرری پر پیدا کیا ہے۔ کہ جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتی بلکہ اسی اندازہ میں محصور اور محدود ہے۔ اس کی شکل منطقی اس طرح پر ہے۔ کہ ہر جسم اور روح ایک اندازہ مقرری میں محصور اور محدود ہو تو اس کا کوئی حاصر اور محدود ضرور ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک جسم اور روح کے لئے ایک حاصر اور محدود ہے۔ اب اثبات قضیہ اولیٰ کا یعنے محدود القدر ہونے اشیاء کا اس طرح پر ہے کہ جمیع اجسام اور ارواح میں جو جو خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ عقل تجویز کر سکتی ہے۔ کہ ان خواص سے زیادہ خواص ان میں پائے جاتے۔ مثلاً انسان کی دو آنکھیں ہیں۔ اور عند العقل ممکن تھا۔ کہ اس کی چار آنکھیں ہوتیں۔ دو منہ کی طرف اور دو پیچھے کی طرف۔ تاکہ جیسا آگے کی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ ویسا ہی پیچھے کی چیزوں کو بھی دیکھ لیتا۔ اور کچھ شک نہیں کہ چار آنکھ کا ہونا بہ نسبت دو آنکھ کے کمال میں زیادہ اور فائدہ میں دو چند ہے۔ اور انسان کے پر نہیں اور ممکن تھا۔ کہ مثل اور پرندوں کے اس کے پر بھی ہوتے۔ اور علےٰ ہذا القیاس نفس ناطقہ انسانی بھی ایک خاص درجہ میں محدود ہے۔ جیسا کہ وہ بغیر تعلیم کسی معلم کے خود بخود مجہولات کو دریافت نہیں کر سکتا۔ قاسر خارجی سے کہ جیسے جنون یا مخوری ہے۔ سالم الحال نہیں رہ سکتا۔ بلکہ فی الفور اس کی قوتوں اور طاقتوں میں تنزل واقع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بذاتہ ادراک جزئیات نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس کو شیخ محقق بو علی سینا نے نمط سابع اشارات میں بتصریح لکھا ہے۔ حالانکہ عند العقل ممکن تھا۔

کہ ان سب آفات اور عیوب سے بچا ہوا ہوتا۔ پس جن جن مراتب اور فضائل کو انسان اور اس کی روح کے لئے عقل تجویز کر سکتی ہے۔ وہ کس بات سے ان مراتب سے محروم ہے آیا تجویز کسی اور مجوز سے یا خود اپنی رضامندی سے۔ اگر کہو کہ اپنی رضامندی سے تو یہ صریح خلاف ہے۔ کیونکہ کوئی شخص اپنے حق میں نقص روا نہیں رکھتا۔ اور اگر کہو کہ تجویز کسی اور مجوز سے تو مبارک ہو کہ وجود خالق ارواح اور اجسام کا ثابت ہو گیا۔ اور یہی مدعا تھا۔ پرانی تحریریں صفحہ ۵

« ورناں ورن بھانے جے کئی وڈا کرے جے اے وڈے تتھ وڈیائیاں جے بھاوے دے

یعنی طرح طرح کی تقدیر ہے۔ جسکو چاہے۔ بڑا کرے۔ اسی بڑے کے ہاتھ بڑائیاں ہیں۔ جسکو چاہے دیدے۔ اب دیکھو۔ ایسے طور سے تقدیر کو ماننا خاص اسلام کا اعتقاد ہے اور یہی تعلیم تمام قرآن میں بھری پڑی ہے۔ اور ہر یک عزت اور ذلت خدا تعالےٰ کی طرف سے مقدر ہے۔ جسکو چاہتا ہے۔ عزیز بنا دیتا ہے۔ اور جسکو چاہتا ہے۔ ذلیل کر دیتا ہے مگر وید کے ماننے والوں کا یہ ہرگز اعتقاد نہیں وہ تو انسان کے ذرہ ذرہ رنج اور راحت کو کسی پہلے نامعلوم جنم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ خلق کل شیئی فقدرہ تقدیرا۔

یعنے آپ خدا نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ اور اس کا اندازہ بھی آپ اپنے اختیار سے مقرر کر دیا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۸)

۲۵/۵ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ج

اور کہینگے کہ یہ جھوٹ بنا لیا ہے۔ ایک بڑی جماعت نے متفق ہو کر قرآن شریف کو تالیف کیا ہے۔ ایک آدمی کا کام نہیں۔

براہین احمدیہ صفحہ ۵۶۱ و ۴۹۱

"اب خلاصہ اس تقریر کا یہ ہے کہ اگر آنحضرت امی نہ ہوتے۔ تو مخالفین اسلام بالخصوص یہودی اور عیسائی جن کو علاوہ اعتقادی مخالفت کے یہ بھی حسد اور بغض دامنگیر تھا۔ کہ بنی اسرائیل میں سے رسول نہیں آیا بلکہ ان کے بھائیوں میں سے جو بنی اسرائیل میں آیا وہ کیونکر ایک صریح امر خلاف واقعہ پاکر خاموش رہتے۔ بلاشبہ ان پر یہ بات بہ کمال درجہ ثابت ہو چکی تھی۔ کہ جو کچھ آنحضرتؐ کے منہہ سے نکلتا ہے۔ وہ کسی امی یا ناخواندہ کا کام نہیں۔ اور نہ دس بیس آدمیوں کا کام ہے، تب ہی تو وہ اپنی جہالت سے اعانہ علیہ قوم اخرون کہتے تھے۔ اور جو ان میں سے دانا اور واقعی اہل علم تھے۔ وہ بخوبی معلوم کر چکے تھے۔ کہ قرآن انسانی طاقتوں سے باہر ہے۔ اور ان پر یقین کا دروازہ ایسا کھل گیا تھا۔ کہ ان کے حق میں خدا نے فرمایا۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔

(براہین احمدیہ ص۲۹۵)

۸/۲۵ عرب کے کفار کا ایک یہ اعتراض خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں لکھا ہے کہ یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق یعنے یہ تو کھانا کھاتا ہے۔ اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ ان کے نزدیک روٹی کھانا یا عمدہ کھانا استعمال کرنا شان نبوت کے برخلاف تھا اور نیز یہ اعتراض تھا کہ نبی گوشہ گزین ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ بازاروں میں بھی پھرے

(حاشیہ چشمہ معرفت ص۲۸۲)

۲۱/۲۵ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ط

یعنے ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ تمام نبی نہ کھانا کھاتے ہیں۔ اور نہ بازاروں میں پھرتے ہیں۔ اور پہلے ہم بنص قرآنی ثابت کر چکے ہیں کہ دنیوی حیات کے لوازم میں سے طعام کا کھانا ہے۔ سو چونکہ وہ اب تمام نبی طعام نہیں

کھاتے لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب فوت ہو چکے ہیں۔ جن میں بوجہ کلّیہ حضرت مسیح بھی داخل ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۳)

۳۱/۲۵ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○

یاد رکھو۔ قرآن شریف حقیقی برکات کا سرچشمہ اور نجات کا سچا ذریعہ ہے ان لوگوں کی اپنی غلطی ہے۔ جو قرآن شریف پر عمل نہیں کرتے۔ عمل نہ کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو وہ ہے۔ جسکو اس پر اعتقاد ہی نہیں۔ اور وہ اس کو اللہ تعالیٰ کا کلام ہی نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ تو بہت دور پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اور نجات کا شفا بخش نسخہ ہے۔ اگر وہ اس پر عمل نہ کریں تو کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے ساری عمر میں کبھی اسے پڑھا ہی نہیں۔ پس ایسے آدمی جو اللہ تعالےٰ کے کلام سے ایسے غافل اور لاپرواہ ہیں۔ انکی ایسی مثال ہے۔ کہ ایک شخص کو معلوم ہے۔ کہ فلاں چشمہ نہایت ہی مصفا اور شیریں اور خنک ہے۔ اور اسکا پانی بہت سے امراض کے واسطے اکسیر اور شفا ہے۔ یہ علم اس کو یقینی ہے۔ لیکن باوجود اس علم کے اور باوجود پیاسا ہونے اور بہت سے امراض میں مبتلا ہونے کے وہ اس کے پاس نہیں جاتا۔ تو یہ اس کی کیسی بدقسمتی اور جہالت ہے۔ اسے چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ وہ اس چشمہ پر منہہ رکھ دیتا۔ اور سیراب ہوکر اس کے لطف اور شفا بخش پانی سے حظ اٹھاتا۔ مگر وہ باوجود علم کے اس سے ویسا ہی دُور ہے۔ جو موت آکر خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس شخص کی حالت بہت ہی عبرت بخش اور نصیحت خیز ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہی ہو رہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ساری ترقیوں اور کامیابیوں کی کلید یہی قرآن شریف ہے۔ جس پر ہمکو عمل کرنا چاہیئے۔ مگر نہیں اس کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی۔ ایک شخص جو نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اور پھر نری ہمدردی ہی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کے حکم اور ایما سے اس طرف بلاوے۔ تو اسے

کذاب اور دجال کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا قابل رحم حالت اس قوم کی ہوگی۔ (تقریروں کا مجموعہ ص۳۹)

۳۳/۲۵ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○

یعنے کافر کہتے ہیں کہ کیوں قرآن ایک مرتبہ ہی نازل نہیں ہوا۔ ایسا ہی چاہیے تھا۔ تا وقتاً فوقتاً ہم تیرے دل کو تسلی دیتے رہیں۔ اور تا وہ معارف اور علوم جو وقت سے وابستہ ہیں۔ اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوں۔ کیونکہ قبل از وقت کسی بات کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو اس مصلحت سے خدا نے قرآن شریف کو تیئیس برس تک نازل کیا۔ تا اس مدت تک موعودہ نشان بھی ظاہر ہو جائیں۔ (حقیقۃ الوحی ص۳۴۲)

۴۲/۲۵ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ○

اور تیرے ساتھ ہنسی سے ہی پیش آئیں گے۔ اور ٹھٹھا مار کر کہینگے۔ کیا یہی ہے جسکو خدا نے اصلاح خلق کے لئے مقرر کیا۔ یعنی جن کا مادہ ہی خبیث ہے۔ ان سے صلاحیت کی اُمید مت رکھو۔ براہین احمدیہ ص۵۱۱

ہو ان لوگوں نے تجھے ایک ہنسی کی جگہ سمجھ رکھا ہے۔ وہ طنزاً کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے کہ جسکو خدا نے ہم میں دعوت کیلئے کھڑا کیا۔ (براہین پنجم جدید ص۳)

۴۵/۲۵ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

اور تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لیجاتی

میں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ جو صدر اسلام کا وقت تھا۔ اس زمانہ پر ایک وسیع نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے کیونکر ایمان لانے والوں کو مذکورہ بالا ادنے درجہ سے اعلےٰ درجہ تک پہنچا دیا۔ کیونکہ ایمان لانے والے اپنی ابتدائی حالت میں اکثر ایسے تھے۔ کہ جس حالت کو وہ ساتھ لیکر آئے تھے وہ حالت جنگلی وحشیوں سے بدتر تھی۔ اور درندوں کی طرح انکی زندگی تھی۔ اور اس قدر بداخلاق اور بداعمال میں مبتلا تھے۔ کہ انسانیت سے باہر ہو چکے تھے۔ اور ایسے بے شعور ہو چکے تھے۔ کہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہم بداعمال ہیں۔ یعنی نیکی اور بدی کی شناخت کی حس بھی جاتی رہی تھی۔ پس قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نے جو پہلا اثر ان پر کیا۔ تو وہ یہ تھا۔ کہ ان کو محسوس ہو گیا۔ کہ ہم پاکیزگی کے جامہ سے بالکل برہنہ اور بداعمالی کے گند میں گرفتار ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ ان کی پہلی حالت کی نسبت فرماتا ہے۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل سبیلا۔ یعنی "یہ لوگ چارپایوں کیطرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر" پھر جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک صحبت اور قرآن حمید کی دلکش تاثیر سے ان کو محسوس ہو گیا۔ کہ جس حالت میں ہم نے زندگی بسر کی ہے وہ ایک وحشیانہ زندگی ہے۔ اور سراسر بداعمالیوں سے ملوث ہے۔ تو انہوں نے روح القدس سے قوت پاکر نیک اعمال کیطرف حرکت کی۔ (لیکچر چشمہ معرفت ص ۵۶)

۵۰/۲۵ لِّنُحْیِۦَ بِہٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا

یعنے قرآن کے ساتھ ہم نے زمین مردہ کو زندہ کیا۔ ایسا ہی حشر میں بھی ہوگا

ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۲

۶۱/۲۵ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَھُمْ نُفُوْرًا ۝ تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ

فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّ
قَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ
النَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ
اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا ۝ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝

یعنے جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے۔ کہ تم رحمٰن کو سجدہ کرو۔ تو وہ رحمان کے نام سے متنفر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں۔ کہ رحمان کیا چیز ہے (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور مصدر خیرات دائمی ہے۔ جس نے آسمان میں برج بنائے۔ برجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا۔ جو کہ عامہ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں۔ اسی رحمان نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائی۔ جو کہ ایکدوسرے کے بعد دورہ کرتے رہتے ہیں۔ تا جو شخص طالب معرفت ہو۔ وہ ان دقائق حکمت سے فائدہ اٹھاوے۔ اور جہل اور غفلت کے پردے سے خلاصی پاوے۔ اور جو شخص شکر نعمت کرنے پر مستعد ہیں۔ جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں۔ تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دعا دیتے ہیں۔ اور تشبہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں۔ کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس ان آیات میں خدا تعالےٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے۔ کہ اس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر ایک برے بھلے پر محیط ہو رہی ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۴۷)

" قبل اسلام میں آنے کے ان لوگوں کی حالت وہ تھی۔ کہ یاکلون کما یاکل الطعام

چار پایوں کیطرح کھانے پینے کے سوائے ان کا کوئی مشغل ہی نہ تھا۔ یہ تو حالت کفر تھی۔ اس کے بعد ان کی حالت اسلامی کی یہ تعریف ہے کہ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا۔ اپنے رب کی عبادت میں سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات گذار دیتے ہیں۔ وہ کھانا پینا سب بھول گئے۔ اور پہلا نقشہ بھی بالکل بدل گیا۔ کلمہ طیبہ ص۲۹

کل

" پھر رسالت کی طرف دیکھو کہ اصل غرض رسالت کی کیا ہوتی ہے۔

اوّل یہ کہ رسول ضرورت کے وقت پر آئے۔ اور پھر اس ضرورت کو بہ وجہ احسن پورا کرے۔ سو یہ فخر بھی ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ عرب اور دنیا کی حالت جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی تھے۔ کھانے پینے کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا اور نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالےٰ نے ایک طرف ان کا نقشہ کھینچکر بتلایا۔ کہ یاکلون کما یاکل الانعام پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا۔ یُبِیْتُوْن لربھم سجدًا وّ قیامًا کی حالت ہوگئی۔ یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گذار دیتے ہیں۔ اللہ اللہ کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سبب سے ایک بے نظیر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی۔ حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزان اعتدال پر قائم کردیا اور مردار خوار اور مردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا۔ دو ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال کہ یبیتون لربھم سجدًا وّ قیامًا اور علمی کا یہ حال کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیع زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

الحکم ۳۰ اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱

" دوسرا معجزہ (آنحضرت صلعم کا) تبدیل اخلاق ہے۔ کہ یا تو وہ اولٰئک کالانعام

بل ھم اضل سبیلاً۔ چارپایوں سے بھی بدتر تھے۔ یا یبیتون لربھم سجداً و قیاماً۔ رات نمازوں میں گذارنے والے ہو گئے۔ بدر ۹ مئی ۱۹۰۸ء

۲۵/۷۳ لا یشھدون الزور

جھوٹوں کی مجلس میں نہیں بیٹھتے۔ (اسلامی فلاسفی ص۱۲۶)

۲۵/۷۳ واذا مروا باللغو مروا کراما

اور اگر کوئی لغو بات کسی سے سنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو۔ تو بزرگانہ طور پر طرح دے کر چلے جاتے ہیں۔ اور ادنٰے ادنٰے بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے۔ یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے۔ اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور صلحکاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے۔ کہ ادنٰے ادنٰے باتوں کو خیال میں نہ لاویں۔ اور معاف فرماویں۔ اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے۔ سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں۔ کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے۔ یا بہ نیت ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔ سو صلحکاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرماویں۔ اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں۔ لیکن اگر ایذا صرف لغو کی مد میں داخل نہ ہو۔ بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے تو صلحکاری کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جاوے۔ تو اس خلق کا نام عفو ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۹)

۲۵/۷۳ بسا اوقات ریا اور حلم کا جنگ ہو جاتا ہے کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سُنکر اس کا نفس جوش مارتا ہے۔ تقوٰی تو اس کو سکھلاتا ہے۔ کہ وہ غصہ ہونے سے باز رہے جیسے قرآن کہتا ہے۔ واذا مروا باللغو مروا کراما۔

ایسا ہی بےصبری کے ساتھ اسے اکثر جنگ کرنا پڑتا ہے۔ بےصبری سے مراد یہ ہے کہ اسکو راہ تقوای میں اس قدر دقتوں کا مقابلہ ہے۔ کہ مشکل سے وہ منزل مقصود پر پہنچتا ہے۔ اس لئے بےصبر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک کنواں پچاس ہاتھ تک کھودنا ہے۔ اگر دو چار ہاتھ کے بعد کھودنا چھوڑ دیا جاوے۔ تو محض یہ ایک بدظنی ہے۔ اب تقوای کی شرط یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے اس کو اخیر تک لیجائے۔ اور بےصبر نہ ہو جائے۔

(الحکم ۱۷، ۱ جون ۱۹۰۳ء)

۷۵/۲۵ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا

قرآنی آیات سے ثابت ہے کہ نکاح سے شہوت رانی غرض نہیں۔ بلکہ بدخیالات اور بدنظری اور بدکاری سے اپنے تئیں بچانا۔ اور نیز حفظ صحت بھی غرض ہے۔ اور پھر نکاح سے ایک اہم غرض بھی ہے۔ جس کی طرف قرآن کریم میں یعنے سورۃ الفرقان میں اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ الآیہ یعنے مومن وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں۔ کہ اے ہمارے خدا ہمیں اپنی بیویوں کے بارے میں اور فرزندوں کے بارے میں دل کی ٹھنڈک عطا کر۔ اور ایسا کر کہ ہماری بیویاں اور ہمارے فرزند نیک بخت ہوں۔ اور ہم ان کے پیشرو بنیں۔

(آریہ دھرم صفحہ ۱۸)

" انسان کو سوچنا چاہیئے کہ اسے اولاد کی خواہش کیوں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کو محض طبعی خواہش ہی تک محدود نہ کر دینا چاہئے۔ کہ جیسے پیاس لگتی ہے یا بھوک لگتی ہے لیکن جب یہ ایک خاص اندازہ سے گذر جائے۔ تو ضرور اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔ کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ اب اگر انسان خود مومن اور عبد نہیں بنتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے اصل منشار کو پورا نہیں کرتا ہے۔ اور پورا حق عبادت

ادا نہیں کرتا۔ بلکہ فسق وفجور میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کے لئے خواہش کیا نتیجہ رکھیگی؟ صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لئے وہ اپنا ایک اور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ خود کونسی کمی کی ہے۔ جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب تک اولاد کی خواہش محض اس غرض کیلئے نہ ہو۔ کہ وہ دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالےٰ کی فرمانبردار ہو کر اس کے دین کی خادم بنے۔ بالکل فضول بلکہ ایک قسم کی معصیت اور گناہ ہے۔ اور باقیات صالحات کی بجائے اس کا نام باقیات سیّات رکھنا جائز ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں صالح اور خداترس اور خادم دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں۔ تو اس کا یہ کہنا بھی نرا دعوےٰ ہی دعوےٰ ہوگا۔ جب تک کہ وہ خود اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے۔ اگر خود فسق وفجور کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور منہ سے کہتا ہے کہ میں صالح اور متقی اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوے میں کذاب ہے صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے۔ اور اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بناوے۔ تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہوگی۔ اور ایسی اولاد حقیقت میں اس قابل ہوگی۔ کہ اسکو باقیات صالحات کا مصداق کہیں لیکن اگر یہ خواہش اسلئے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے۔ اور وہ ہمارے املاک واسباب کی وارث ہو۔ یا وہ بڑی نامور اور مشہور آدمی ہو۔ تو اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔

یاد رکھو! کسی نیکی کو بھی اسلئے نہیں کرنا چاہئے۔ کہ اس نیکی کے کرنے پر ثواب یا اجر ملیگا۔ کیونکہ اگر محض اس خیال پر نیکی کیجائے تو وہ ابتغاء مرضات اللہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس ثواب کیخاطر ہوگی۔ اور اس سے اندیشہ ہوسکتا ہے۔ کہ کسی وقت وہ اسے چھوڑ بیٹھے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہر روز ہم سے ملنے کو آئے۔ اور ہم اس کو ایک روپیہ دیا کریں۔ تو وہ بجائے خود یہی سمجھیگا۔ کہ میرا جانا صرف روپیہ کے لئے ہے۔ جس دن سے روپیہ نہ ملے اسی دن سے آنا چھوڑ دے گا۔

غرض یہ ایک قسم کا باریک شرک ہے۔ اس سے بچنا چاہئے۔ نیکی کو محض اس لئے کرنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ خوش ہو۔ اور اس کی رضا حاصل ہو۔ اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اسپر کوئی ثواب ہو یا نہ ہو۔ ایمان تب ہی کامل ہوتا ہے۔ جبکہ یہ وسوسہ اور وہم درمیان سے اُٹھ جاوے۔ اگرچہ یہ سچ ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ اِن اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدنظر نہیں رکھنا چاہیے دیکھو اگر کوئی مہمان یہاں محض اسلئے آتا ہے۔ کہ وہاں آرام ملیگا۔ ٹھنڈے شربت ملیں گے یا تکلیف کے کھانے ملیں گے۔ تو وہ گویا ان اشیاء کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ خود میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حتی المقدور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اسکو آرام پہنچاوے۔ اور وہ پہنچاتا ہے۔ لیکن مہمان کا خود ایسا خیال کرنا اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔ تو غرض مطلب یہ ہے کہ اولاد کی خواہش صرف نیکی کے اصول پر ہونی چاہیئے اس لحاظ سے اور خیال سے نہ ہو کہ وہ ایک گناہ کا خلیفہ باقی رہے:

اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں ہوئی تھی حالانکہ خدا نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر کے درمیان ہی اولاد دے دی تھی۔ یہ سلطان احمدؐ اور فضل احمد قریباً اسی عمر میں پیدا ہو گئے تھے۔ اور نہ کبھی مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ بڑے بڑے دنیا دار اور اعلےٰ عہدوں پر پہنچکر مامور ہوں۔ غرض جو اولاد معصیت اور فسق کی زندگی بسر کرنے والی ہو۔ اس کی نسبت تو سعدیؒ کا یہ فتویٰ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے ؎

کہ پیش از پدر مردہ بہ ناخلف

پھر ایک اور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں۔ اور اولاد ہوتی بھی ہے۔ مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ کہ وہ اولاد کی تربیت اور ان کو عمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالےٰ کی فرمانبردار بنانے کی سعی اور فکر کریں۔ نہ کبھی ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدنظر رکھتے ہیں ؛

میری اپنی تو یہ حالت ہے۔ کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں ہے کہ جس میں میں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لئے دعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی

اولاد کو بری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتدا میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں۔ تو ان کو تنبیہ نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بیباک ہوتے جاتے ہیں ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکا اپنے جرائم کیوجہ سے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس آخری وقت میں اس نے خواہش کی کہ میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ جب اسکی ماں آئی۔ تو اس نے ماں کے پاس جاکر اُسے کہا۔ کہ میں تیری زبان کو چوسنا چاہتا ہوں۔ جب اسنے زبان نکالی تو اُسے کاٹ کھایا۔ دریافت کرنے پر اُس نے کہا۔ کہ اسی ماں نے مجھے پھانسی پر چڑھایا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مجھے پہلے ہی روکتی تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں۔ مگر نہ اس لئے کہ وہ خادم دین بنیں۔ بلکہ اس لئے کہ دنیا میں ان کا کوئی وارث ہو۔ اور جب اولاد ہوتی ہے۔ تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقاید کی اصلاح کی جاتی ہے۔ اور نہ اخلاقی حالت کو درست کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہو سکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا۔ جب وہ اس سے قاصر ہے۔ تو اور نیکیوں کی امید اس سے کیا ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اولاد کی خواہش کو اس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے۔

ربّنا ھب لنا من ازواجنا و ذریٰتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماماً۔ یعنے خدا تعالےٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسر آسکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر ایک شے پر مقدم کرنے والے ہوں۔ اور آگے کھول کر کہدیا کہ واجعلنا للمتقین اماماً اولاد اگر نیک اور متقی ہو۔ تو یہ ان کا امام ہی ہو گا۔ اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دعا ہے۔ الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صلا

یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک شخص جسکو کوئی خواب سچی آوے۔ یا الہام کا دروازہ اسپر کھلا ہو۔ وہ اس نام سے موسوم ہو سکتا ہے۔ بلکہ امام کی حقیقت کوئی اور امر

جامع اور حالت کاملہ تامہ ہے۔ جس کیوجہ سے آسمان پر اس کا نام امام ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ صرف تقویٰ اور طہارت کیوجہ سے کوئی شخص امام نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ واجعلنا للمتقین اماما۔ پس اگر ہر ایک متقی امام ہے۔ تو پھر تمام مومن متقی امام ہی ہوئے۔ اور یہ امر منشا آیت کے برخلاف ہے۔ اور ایسا ہی بموجب نص قرآن کریم کے ہر ایک ملہم اور صاحب رویا صادقہ امام نہیں ٹھہر سکتا۔ (ضرورۃ الامام صفحہ ۲)

---

۷۷ / ۲۵ — اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝

اوہ جو تھاں سوہاوناں اوپر محل مرار — سچ کرنی دے پائے در گھر محل پیار

یعنے وہ بہشت اونچا مکان ہے۔ اس میں عمارتیں خوب ہیں۔ اور راست بازی سے وہ مکان ملتا ہے۔ اور پیار اس محل کا دروازہ ہے۔ جس سے لوگ گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ شعر اس آیت مذکورہ بالا سے اقتباس لیا گیا ہے۔ جو قرآن شریف میں ہے یعنے جو لوگ راست باز ہیں۔ اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ انہیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دی جائے گی۔ جو نہایت خوبصورت مکان اور آرام کی جگہ ہے۔ دیکھو اس جگہ صریح باوا صاحب نے اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا اب بھی کچھ شک باقی ہے کہ باوا صاحب قرآن شریف کے ہی تابعدار تھے۔ اس قسم کا بیان بہشت کے بارہ میں وید میں کہاں ہے۔ بلکہ انجیل میں بھی نہیں۔ تب ہی تو بعض نابینا عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں جسمانی بہشت کا ذکر ہے۔ مگر نہیں جانتے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ جسم اور روح جو دونوں خدا تعالےٰ کی راہ میں دنیا میں کام کرتے رہے ان دونوں کو جزا ملے گی۔ یہی تو پورا بدلا ہے۔ کہ روح کو روح کی خواہش کے مطابق اور جسم کو جسم کی خواہش کے مطابق بدلا ملے۔ لیکن دنیوی کدورتوں اور کثافتوں سے وہ جگہ بالکل پاک ہوگی۔ اور لوگ اپنی پاکیزگی میں فرشتوں کے مشابہ ہوں گے۔ اور بایں ہمہ

جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے لذت اور سرور میں ہوں گے۔ اور روح کی چمک جسم پر پڑے گی۔ اور جسم کی لذت میں روح شریک ہوگا۔ اور یہ بات دنیا میں حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ دنیا میں جسمانی لذت روحانی لذت سے روکتی ہے۔ اور روحانی لذت جسمانی لذت سے مانع آتی ہے۔ مگر بہشت میں ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس روز دونوں لذتوں کا ایک دوسری پر عکس پڑے گا۔ اور اسی حالت کا نام سعادت عظمےٰ ہے غرض باوا صاحب نے یہ نکتہ معرفت قرآن شریف سے لیا ہے۔ کیونکہ دوسری تمام قومیں اس سے غافل ہیں۔ اور ان کے عقیدے اس کے برخلاف ہیں۔ (ست بچن صـ ۹۸)

۷۸/۲۵ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ ج فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ۝

کافروں کو کہہ اگر تم خدا کی بندگی نہ کرو۔ تو وہ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے سو تم نے بجائے طاعت اور بندگی کے جھٹلانا اختیار کیا۔ سو عنقریب اس کی سزا تم پر وارد ہونے والی ہے۔ (براہین احمدیہ صـ ۲۳۸)

" اور چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرر ہے۔ کہ رحمت خاصہ انہی کے شامل حال ہوتی ہے۔ کہ جو رحمت کے طریق کو یعنے دعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں۔ اس باعث سے جو لوگ اس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ طرح طرح کے آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کی طرف اللہ تعالےٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یعنے ان کو کہدے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم دعا نہ کرو۔ اور اس کے فیضان کے خواہاں نہ ہو۔ براہین احمدیہ صـ ۲۴۳

" جانوروں کی زندگی دیکھ لو۔ کہ محنتیں ان سے لی جاتی ہیں۔ اور ان کو ذبح کیا جاتا ہے۔ پس جو انسان خدا تعالےٰ سے قطع تعلق کرتا ہے۔ اس کی زندگی کی ضمانت

نہیں رہتی۔ چنانچہ فرمایا قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم یعنی اگر تم اللہ کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا رکھتا ہے۔ یاد رکھو جو دنیا کے لئے خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یا اس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اللہ تعالےٰ انکی کچھ پرواہ نہیں رکھتا۔

الحکم ۱۰۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء ص۳

" قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم اس کے مفہوم مخالف سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی پرواہ کرتا ہے۔ اور وہ وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو سعادت مند ہوتے ہیں۔ وہ تمام کسریں ان کے اندر سے نکل جاتی ہیں۔ جو خدا سے دور ڈالدیتی ہیں۔ اور جب انسان اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ اور خدا سے صلح کر لیتا ہے۔ تو خدا اس کے عذاب کو بھی ٹالدیتا ہے۔ خدا کو کوئی ضد تو نہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی صاف طور پر فرمایا ہے۔ ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم یعنے خدا نے تم کو عذاب دیکر کیا کرنا ہے۔ اگر تم دیندار ہو جاؤ۔

طاعون بڑا خطرناک عذاب ہے۔ بیوی بچے ہی نہیں تباہ ہوتے۔ بلکہ یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ جنازہ کا بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے دوسرے جو زندہ رہتے ہیں وہ بھی مفقود العقل اور زندہ در گور ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ گھر والے مردے کو باہر پھینک آئے ہیں۔ اور کتوں نے اسکو کھایا اور وہ بھی طاعون سے ہلاک ہو گئے۔ اس خوفناک مرض میں تعہد خدمت کا بھی نہیں ہو سکتا۔ تیمار داروں کو نفرت اور خوف ہوتا ہے۔ خدا تعالےٰ نے جو یہ فرمایا قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کا منشا یہ ہے کہ جیسے تم نے میرے شعار کو چھوڑ دیا ہے۔ میں تمہاری بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا تجہیز و تکفین بھی ایک شعار ہے۔ اور اب تو یہ ایک رسم ہو گئی ہے۔ اور اس سے بڑھکر نہیں۔

الحکم ۱۰۔ ستمبر سنہ ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶

" ان لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالےٰ کے احکام کی پیروی یا پرواہ نہیں کرتے اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گذار دیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم یعنے میرا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے۔ اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔

الحکم ۱۰۔ اگست سنہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱

" مورکھ وہ انسان ہے۔ جو اس ضروری سفر کا کچھ بھی فکر نہیں رکھتا۔ خدا تعالےٰ اس شخص کی عمر کو بڑھا دیتا ہے۔ جو سچ مچ اپنی زندگی کا طریق بدلکر خدا تعالےٰ کا ہی ہو جاتا ہے۔ ورنہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم یعنی ان کو کہدو کہ خدا تعالیٰ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے۔ اگر تم اس کی بندگی اور عبادت نہ کرو۔ (الحکم ۱۳۔ اگست سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

" خدا تعالےٰ کو تو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہے کہ تم اس کی طرف میلان رکھو یا نہ رکھو۔ وہ فرماتا ہے۔ قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم اگر اس کی طرف رجوع کرو گے تو تمہارا ہی اس میں فائدہ ہوگا۔ انسان جس قدر اپنے وجود کو مفید اور کار آمد ثابت کرے گا۔ اسی قدر اس کے انعامات کو حاصل کرے گا۔ (تقریریں صفحہ ۳۲)

" اگر خدا تعالیٰ کیطرف انسان جھکے۔ تو وہ رحم کرتا ہے لیکن جب انسان لاپرواہی کرے تو وہ غنی بے نیاز ہے۔ اس کو کسی کی کیا پرواہ ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاء کم لوگوں کو کہدے اگر تم دعا نہ کرو۔ تو میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔ بیشک وہ کریم رحیم اور حلیم ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔ (کلمہ طیبہ صفحہ ۸)

" جب انسان کا ایک اصول ہو جائے۔ کہ زیستن از بہر خوردن است۔ اس وقت

انکی نظر خدا تعالیٰ پر نہیں رہتی۔ بلکہ وہ دنیا کے کاروبار اور تجارت ہی میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ اور رجوع کا خیال بھی نہیں رہتا۔ اس وقت اس کی زندگی قابل قدر وجود نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَاؤُکُمْ یعنے میرا رب تمہاری کیا پرواہ رکھتا ہے۔ اگر تم اس کی بندگی نہ کرو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس ملک میں ہیضہ کی خطرناک وبا پڑی تھی۔ اس کے پہلے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کشف کے ذریعہ سے یہ نظارہ دکھا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا میدان ہے۔ اور اس میں ایک بہت بڑی لمبی نالی ہے۔ جس پر قصابوں نے بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں۔ اور چھریاں انکی گردنوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے دیکھ رہے ہیں۔ گویا آسمانی حکم کا انتظار کرتے ہیں۔ اور میں پاس ہی ٹہل رہا ہوں۔ اتنے میں میں نے یہ آیت پڑھی۔ قل ما یعبؤا بکم ربی لولا دعاءکم یہ آیت سنتے ہی انہوں نے چھریاں پھیر دیں۔ اور وہ بھیڑیں تڑپنے لگیں۔ انکو تڑپتے دیکھ کر وہ قصاب بولے کہ تم کیا ہو؟ گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔ غرض اس کے بعد ہیضہ کی وہ خطرناک وبا پڑی کہ الامان پس جو انسان خدا تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں کرتا اس کا رتبہ اور قدر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔

(تقریروں کا مجموعہ صہ۲۸ والحکم ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء ۶ صہ۵)

"یعنی انکو کہدے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے۔ اگر تم اسکی پرستش نہ کرو۔ اور اس کے حکموں کو نہ سنو! (تریاق القلوب صفحہ ۶۰)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ مَکِّیَّۃٌ وَھِیَ مِائَتَانِ وَسَبْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

۴/۴ کوئی نبی اور ولی قوت عشقیہ سے خالی نہیں ہوتا یعنی ان کی فطرت میں حضرت احدیت نے بندگان خدا کی بھلائی کے لئے ایک قسم کا عشق ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ پس یہی عشق کی آگ ان سے سب کچھ کراتی ہے۔ اور اگر ان کو خدا کا یہ حکم بھی پہنچے کہ اگر تم

دعا اور غمخواری خلق اللہ نہ کرو۔ تو تمہارے اجر میں کچھ قصور نہیں۔ تب بھی وہ اپنے فطرتی جوش سے رہ نہیں سکتے۔ اور ان کو اس بات کی طرف خیال بھی نہیں ہوتا۔ کہ ہمکو اس جان کنی سے کیا اجر ملیگا۔ کیونکہ ان کے جوشوں کی بنا رکسی غرض پر نہیں۔ بلکہ وہ سب کچھ قوتِ عشقیہ کی تحریک سے ہے۔ اسی کیطرف اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

خدا اپنے نبی کو سمجھاتا ہے۔ کہ اس قدر غم اور درد کہ تو لوگوں کے مومن بن جانے کے لئے اپنے دل پر اُٹھاتا ہے۔ اس سے تیری جان جاتی رہیگی۔ سو وہ عشق ہی تھا جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جان کی کچھ پرواہ نہ کی۔ پس حقیقی پیری امریدی کا یہی احوال ہے۔ اور صادق اسی سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ خدا کا قدیمی احوال ہے۔ کہ قوت عشقیہ صادقوں کے دلوں میں ضرور ہوتی ہے۔ تا وہ سچے غمخوار بننے کے لائق ٹھیریں۔ جیسے والدین اپنے بچے کے لئے ایک قوت عشقیہ رکھتے ہیں تو ان کی دعا بھی اپنے بچوں کی نسبت قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص صاحب قوت عشقیہ ہے۔ وہ خلق اللہ کے لئے حکم والدین رکھتا ہے۔ اور خواہ نخواہ دوسروں کا غم اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ کیونکہ قوت عشقیہ اس کو نہیں چھوڑتی اور یہ خداوند کریم کی طرف سے ایک انتظامی بات ہے۔ کہ اس نے بنی آدم کو مختلف فطرتوں پر پیدا کیا ہے۔ مثلاً دنیا میں بہادروں اور جنگ جو لوگوں کی ضرورت ہے سو بعض فطرتیں جنگ جوئی کی استعداد رکھتی ہیں۔

اسی طرح دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ کہ جن کے ہاتھ خلق اللہ کی اصلاح ہوا کرے۔ سو بعض فطرتیں یہی استعداد لیکر آتی ہیں۔ اور قوت عشقیہ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ (الحکم ۲۰۔ اگست ۱۹۰۶ء صہ ۱۲) مکتوبات احمدیہ صہ ۲۲

ماموَر من اللہ جب آتا ہے۔ تو اس کی فطرت میں سچی ہمدردی رکھی جاتی ہے۔

اور یہ ہمدردی عوام سے بھی ہوتی ہے۔ اور جماعت سے بھی۔ اس ہمدردی میں ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آپ کل دنیا کیلئے مامور ہو کر آئے تھے۔ اور آپ سے پہلے جس قدر نبی آئے۔ وہ مختص القوم اور مختص الزمان کے طور پر تھے۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کل دنیا اور ہمیشہ کے لئے نبی تھے۔ اس لئے آپ کی ہمدردی بھی کامل ہمدردی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالے فرماتا ہے لعلك باخعٌ نفسك ان لا یکونوا مومنین۔ اس کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ کیا تو ان کے مومن نہ ہونے کی فکر میں اپنی جان دیدیگا۔ اس آیت سے اس درد اور فکر کا پتہ لگ سکتا ہے۔ جو آپ کو دنیا کی تبہ حالت دیکھ کر ہوتا تھا۔ کہ وہ مومن بن جاوے۔ یہ تو آپ کی عام ہمدردی کے لئے ہے۔ اور یہ معنے بھی اس آیت کے ہیں کہ مومن کو مومن بنانے کی فکر میں اپنی جان دے دیگا یعنی ایمان کو کامل بنانہیں۔

اسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالے فرماتا ہے۔ یا ایھا الذین امنوا امنوا باللہ ورسولہ بظاہر تو تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن جب حقیقت حال پر غور کیا جاوے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کئی مراتب ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالے تکمیل چاہتا ہے۔ غرض مامور کی ہمدردی مخلوق کے ساتھ اس درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد اس سے متاثر ہوتا ہے۔ الحکم ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صٹ

" کیا تو اسی غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔
براہین احمدیہ صنہ۵۱

" یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ رسالت میں ایک امر ظاہر ہوتا ہے۔ اور ایک مخفی ہوتا ہے۔ مثلاً لا الہ الا اللہ ایک کلمہ ہے۔ جسے رسالتمآب نے بایں الفاظ لوگوں کو پہنچا دینا تھا۔ مگر رسالت کے یہ ظاہری معنے ہیں۔ ہم جب اور زیادہ غور کر کے بطون کیطرف جاتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی رسالت جو لا الہ الا اللہ کے ساتھ بطور ایک جزء غیر منفک کے شامل ہوئی ہے۔ یہ صورت ابلاغ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوت قدسیہ کے زور سے اس تبلیغ کو باثر بنانے میں لانظیر نمونہ دکھلایا ہے۔ اور قرآن کریم سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ آپ کو کس قدر سوزش اور گدازش لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ فرمایا۔

لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین

یعنی کیا تو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا۔ اس فکر میں کہ یہ مومن کیوں نہیں بنتے۔ یہ پکی بات ہے کہ ہر نبی صرف لفظ لیکر نہیں آتا۔ بلکہ اپنے اندر وہ ایک درد اور گداز بھی رکھتا ہے۔ جو اپنی قوم کی اصلاح کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہ درد اور اضطراب کسی بناوٹ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ فطرتاً اضطراری طور پر اس سے صادر ہوتا ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کی پرورش میں مصروف ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے اس کو حکم بھی دیا جاوے۔ کہ اگر وہ اپنے بچے کو دودھ نہ بھی دے۔ اور اس طرح پر اس کے ایک دو بچے مر بھی جاویں۔ تو اس کو معاف ہیں۔ اور اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی کیا بادشاہ کے اس حکم پر کوئی ماں خوش ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ بادشاہ کو گالیاں دیگی۔ وہ دودھ دینے سے رک ہی نہیں سکتی۔ یہ بات اس کی طبیعت میں طبعاً موجود ہے۔ اور دودھ دینے میں اس کو کبھی بھی بہشت میں جانا یا اس کا معاوضہ پانا مرکوز اور ملحوظ نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ جوش طبعی ہے۔ جو اس کو فطرت نے دیا ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو چاہیئے تھا۔ کہ جانوروں کی مائیں بکری بھینس۔ یا گائے یا پرندوں کی مائیں اپنے بچوں کی پرورش سے علیحدہ ہو جائیں۔ ایک فطرت ہوتی ہے۔ ایک عقل ہوتی ہے۔ اور ایک جوش ہوتا ہے۔ ماؤں کا اپنے بچوں کی پرورش میں مصروف ہونا یہ فطرت ہے۔ اسی طرح پر ماموریں جو آتے ہیں۔ انکی فطرت میں بھی ایک بات ہوتی ہے وہ کیا؟ مخلوق کے لئے دلسوزی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے لئے ایک گدازش وہ طبعی طور پر چاہتے ہیں کہ لوگ ہدایت پا جاویں۔ اور خدا تعالےٰ میں

زندگی حاصل کریں۔ پس یہ وہ سر ہے۔ جو لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے دوسرے حصہ میں یعنے اظہار رسالت محمدیہ میں رکھا ہوا ہے۔ جیسے پیغام پہنچانے والے عام طور پر پہنچا دیتے ہیں۔ اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ اس پر عمل ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ تبلیغ صرف کان ہی تک محدود رہتی ہے۔ برخلاف اس کے ماموران الٰہی کان تک بھی پہنچاتے ہیں اور اپنی قوت قدسی کے زور آور ذریعہ سے دل تک بھی پہنچاتے ہیں۔ اور یہ بات کہ جذب اور عقد ہمت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے۔ جب کہ وہ خدا تعالےٰ کی چادر کے نیچے آجاتا ہے۔ اور ظل اللہ بنتا ہے۔ پھر وہ مخلوق کی ہمدردی اور بہتری کے لئے اپنے اندر ایک اضطراب پاتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مرتبہ میں کل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ مخلوق کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ (الحکم ۲۴۔ جولائی ۱۹۰۲ء صہ)

"پس یہ نور ہدایت جو خارق عادت طور پر عرب کے جزیرہ میں ظہور میں آیا۔ اور پھر دنیا میں پھیل گیا یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلی سوزش کی تاثیر تھی۔ ہر ایک قوم توحید سے دور اور مہجور ہو گئی مگر اسلام میں چشمہ توحید جاری رہا۔ یہ تمام برکتیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ جو یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پس پہلے نبیوں کی اُمت میں جو اس درجہ کی صلاح و تقویٰ پیدا نہ ہوئی۔ اس کی یہی وجہ تھی۔ کہ اس درجہ کی توجہ اور دلسوزی اُمت کیلئے ان نبیوں میں نہیں تھی۔ (حقیقۃ الوحی صنا)

"اس طرح وہ خاص اور اعلیٰ فطرت کا آدمی جس کو دوسرے لفظوں میں نبی کہتے ہیں۔ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پھر وہ نبی بوجہ اس کے کہ ہمدردی بنی نوع کا اس کے دل میں کمال درجہ پر جوش ہوتا ہے۔ اپنی روحانی توجہات اور تضرع اور انکسار سے

یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا جو اس پر ظاہر ہوا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس کو شناخت کریں اور نجات پاویں۔ اور وہ دلی خواہش سے اپنے وجود کی قربانی خدا تعالٰے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور اس تمنا سے کہ لوگ زندہ ہو جائیں۔ کئی موتیں اپنے لئے قبول کر لیتا ہے اور بڑے مجاہدات میں اپنے تئیں ڈالتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے۔ لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔ یعنے کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ کہ یہ کافر لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ (حقیقۃ الوحی)

" غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اُٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا۔ اور دعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جور وجفا اُٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے۔ لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔ کیا تو اس غم اور سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اُٹھا رہا ہے۔ اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۲۳۲)

" ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی۔ کہ تمام کفار ان کے زمانہ کے جو انکی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں۔ مگر یہ مراد انکی پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالٰے نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین۔ یعنے کیا تو اس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ کہ یہ لوگ کیوں نہیں ایمان لاتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے ایمان لانے کے لئے اس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دعا کرتے تھے۔ کہ اندیشہ تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں۔ اس لئے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر۔ اور اس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا۔ کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپرواہ ہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اور ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اے نبی (علیہ السلام) جس قدر تو عقد ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی روح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کیلئے دعا کرتا ہے۔ تیری دعاؤں کے پرتاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے۔ لیکن شرط قبولیت دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے بخت متعصب اور لاپرواہ اور گندی فطرت کا انسان نہ ہو۔ ورنہ دعا قبول نہ ہو گی۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم ص۲۶)

" یعنی کیا تو اس غم سے ہلاک ہو جائیگا۔ کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لائے مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تو ان کے غم میں ہلاک ہونے کے قریب ہے۔ (نور القرآن ص۳۰)

۶۳/۲۶ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ؁

میرے ساتھ میرا رب ہے۔ عنقریب وہ میرا راہ کھول دے گا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۳)

" بہ تحقیق میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے راہ بتلائے گا۔

براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۵

۹۱/۲۶ پھر اس درجہ سے اوپر جو ابھی ہم نے بہشتیوں اور دوزخیوں کیلئے

بیان کیا ہے. ایک اور درجہ دخول جنت اور دخول جہنم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے. اور وہ حشر اجساد کے بعد اور جنت عظمےٰ یا جہنم کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے. اور بوجہ تعلق جسد کامل قوای میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر اور خدا تعالیٰ کی تجلی رحم یا تجلّی قہر کا حسب حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہو کر اور جنت عظمےٰ کو بہت قریب پا کر جہنم کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذات یا عقوبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں. جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے. وازلفت الجنة للمتقین وبرزت الجحیم للغاوین اس دوسرے درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے بلکہ اعلےٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں. جو بہشتی ہونے کی حالت میں بہشتی انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں.

ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۹

۲۱۵/۲۶ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ آلہ وسلم کو جب وانذر عشیرتک الاقربین کا حکم ہوا تو آپ نے نام بنام سب کو خدا کا پیغام پہنچایا. الحکم ۳۰ رنومبر سنہ ۱۹۰۱ء

---

۲۲۰ — ۲۲۱/۲۶ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ○ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ

یعنے خدا پر توکل کر جو غالب اور رحم کرنے والا ہے. وہی خدا جو تجھے دیکھتا ہے. جب تو دعا اور دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے. وہی خدا جو تجھے اس وقت دیکھتا تھا. کہ جب تو تخم کے طور پر راستبازوں کی پشتوں میں چلا آتا تھا. یہاں تک کہ اپنی بزرگ والدہ آمنہ معصومہ کے پیٹ میں پڑا.

(تریاق القلوب صفحہ ۶۸)

۲۲۸ و ۲۲۲ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝
۲۶
تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ
السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ وَالشُّعَرَآءُ
يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ
وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا
يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا
مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

پس یاد رہے کہ رحمانی الہام اور وحی کیلئے اول شرط یہ ہے کہ انسان محض خدا کا ہو جائے۔ اور شیطان کا کوئی حصہ اس میں نہ رہے۔ کیونکہ جہاں مردار ہے۔ ضرور ہے کہ وہاں کتے بھی جمع ہو جائیں۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ مگر جس میں شیطان کا حصہ نہیں رہا۔ اور وہ سفلی زندگی سے ایسا دور ہوا۔ کہ گویا مر گیا۔ اور راستباز اور وفادار بندہ بن گیا۔ اور خدا کی طرف آگیا۔ اس پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا۔ (حقیقۃ الوحی ص ۱۳۸)

" کیا میں تم کو خبر دوں کہ جنات کن لوگوں پر اترا کرتے ہیں۔ جنات انہی پر اترا کرتے ہیں۔ کہ جو دروغگو اور معصیت کار ہیں۔ اور اکثر انکی پیشگوئیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں۔ کہ جو گمراہ ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شاعر لوگ قافیہ اور ردیف کے پیچھے ہر ایک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی کسی حقانی صداقت کے پابند نہیں رہتے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ کرتے نہیں اور ظالموں کو عنقریب معلوم ہوگا۔ کہ ان کا مرجع اور مآب کونسی جگہ ہے (براہین ص ۲۲۳)

" شاعر تو اگر مر بھی جاویں تو صداقت اور راستی و ضرورت حقہ کا اپنے کلام میں التزام نہ کر سکیں۔ وہ تو بغیر فضول گوئی کے بول ہی نہیں سکتے۔ اور ان کی ساری کُل فضول اور جھوٹ پر ہی چلتی ہے۔ اگر جھوٹ نہیں۔ یا فضول گوئی نہیں۔ تو پھر شعر بھی نہیں۔ اگر تم ان کا فقرہ فقرہ تلاش کرو۔ کہ کس قدر حقائق و دقائق ان میں جمع ہیں۔ کس قدر راستی اور صداقت کا التزام ہے۔ کس قدر حق اور حکمت پر قیام ہے کس قدر ضرورت حقہ سے وہ باتیں ان کے منہ سے نکلی ہیں۔ اور کیا کیا اسرار بے مثل و مانند ان میں لپٹے ہوئے ہیں۔ تو تمہیں معلوم ہو کہ ان تمام خوبیوں میں سے کوئی بھی خوبی ان کی مردہ عبارت میں پائی نہیں جاتی۔ ان کا تو یہ حال ہوتا ہے۔ کہ جس طرف قافیہ ردیف ملتا نظر آیا۔ اُسی طرف جھک گئے۔ اور جو مضمون دل کو اچھا لگا وہی جھک ماری۔ نہ حق اور حکمت کی پابندی ہے اور نہ فضول گوئی سے پرہیز ہے اور نہ یہ خیال ہے۔ کہ اس کلام کے بولنے کے لئے کونسی سخت ضرورت در پیش ہے۔ اور اس کے ترک کرنے میں کون سا نقصان عاید حال ہے۔ ناحق بے فائدہ فقرہ سے فقرہ ملاتے ہیں۔ سر کی جگہ پاؤں اور پاؤں کی جگہ سر لگاتے ہیں۔ سراب کی چمک تو بہت ہے۔ پر حقیقت دیکھو تو خاک بھی نہیں۔ شعبدہ باز کی طرح صرف کھیل ہی کھیل۔ اصلیت دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نادان طاقت اور ناتوان اور گلے گندے ہیں۔ آنکھیں اندھی اور اسیر عشوہ گری ان کی نسبت نہایت ہی نرمی کیجئے۔ تو یہ کہئے کہ وہ سب ضعیف اور ہیچ ہونے کیوجہ سے عنکبوت کی طرح ہیں۔ اور ان کے اشعار بیت عنکبوت ہیں۔ ان کی نسبت خداوند کریم نے خوب فرمایا ہے۔ والشعراء یتبعھم الغاؤن۔ یعنے شاعروں کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں۔ جنہوں نے حق اور حکمت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا۔ شاعر تو وہ لوگ ہیں۔ جو قافیہ اور مضمون کی تلاش میں ہر ایک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ حقانی باتوں پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ اور جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ کرتے نہیں۔ سو ظالم لوگ جو خدا کے حقانی کلام کو شاعروں کے کلام سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو گا۔ کہ کس طرف

پھر پینگے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۳۹۲)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُورَۃُ النَّمل مکیۃ ھی ثلث وتسعون اٰیۃ

۹/۲۷ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوۡدِیَ اَنۡ بُوۡرِكَ مَنۡ
فِی النَّارِ وَمَنۡ حَوۡلَهَا ؕ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○

یعنے جب موسے آیا تو پکارا گیا۔ کہ برکت دیا گیا ہے۔ جو آگ میں ہے۔ اور اللہ تعالےٰ پاک ہے۔ تجسّم اور تحیّز سے۔ اور وہ رب ہے۔ تمام عالموں کا اب دیکھئے اس آیت میں صاف فرما دیا۔ کہ جو آگ میں ہے۔ اور اس کے گرد میں ہے۔ اس کو برکت دی گئی۔ اور خدا تعالےٰ نے پکار کر اس کو برکت دی اس سے معلوم ہوا کہ آگ میں وہ چیز تھی۔ جس نے برکت پائی۔ نہ کہ برکت دینے والا۔ وہ تو نُوۡدِیَ کے لفظ میں آپ اشارہ فرما رہا ہے۔ کہ اس نے آگ کے اندر اور گرد کو برکت دی۔ اس سے ثابت ہوا کہ آگ میں خدا نہیں تھا۔ اور نہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے۔ بلکہ اللہ جلشانہ اس وہم کا خود دوسری آیت میں ازالہ فرماتا ہے۔ وَسبحان اللہ رب العٰلمین یعنے خدا تعالےٰ اس حلول اور نزول سے پاک ہے۔ وہ ہر ایک چیز کا رب ہے۔

اور اسی طرح خروج ۳ باب آیت ۲ میں لکھا ہے۔ کہ اس وقت خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلے میں سے اس پر ظاہر ہوا۔ (جنگ مقدس صفحہ ۲)

۱۰/۲۷ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ

ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ

اور لوگوں نے محض ظلم کی راہ سے انکار کیا۔ حالانکہ ان کے دل یقین کر گئے

براہین احمدیہ صفحہ ۵۶۱ سطر الحق دہلی طبع ۶

۲۵/۲۷ قرآن شریف میں ایک ملکہ کا قصہ لکھا ہے۔ جو آفتاب پرست تھی۔ اور اس کا نام بلقیس تھا۔ اور وہ اپنے ملک کی بادشاہ تھی۔ اور ایسا ہوا کہ اس وقت کے نبی نے اس کو دھمکی دے بھیجی کہ تجھے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیے۔ ورنہ ہمارا لشکر تیرے پر چڑھائی کرے گا۔ اور پھر تیری خیر نہیں ہوگی۔ پس وہ ڈر گئی۔ اور اس نبی کے پاس حاضر ہونے کے لئے شہر سے روانہ ہوئی۔ اور قبل اس کے کہ وہ حاضر ہو اسکو متنبہ کرنے کے لئے ایک ایسا محل طیار کیا گیا۔ جس پر نہایت مصفا شیشہ کا فرش تھا اور اس فرش کے نیچے نہر کی طرح ایک خندق طیار کی گئی تھی۔ جس میں پانی بہتا تھا۔ اور پانی میں مچھلیاں چلتی تھیں۔ جب وہ آکر اس جگہ پہنچی تو اس کو حکم دیا گیا۔ کہ محل کے اندر آجا۔ تب اس نے نزدیک جاکر دیکھا۔ کہ پانی زور سے بہ رہا ہے۔ اور اس میں مچھلیاں ہیں۔ اس نظارہ سے اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اٹھالیا۔ کہ ایسا نہ ہو کہ پانی میں تر ہو جائے۔ تب اس نبی نے اس ملکہ کو جس کا نام بلقیس تھا۔ آواز دی کہ اے بلقیس تو کس قسم کی غلطی میں گرفتار ہو گئی۔ یہ تو پانی نہیں ہے۔ جس سے ڈر کر تو نے پاجامہ اوپر اُٹھالیا۔ یہ تو شیشہ کا فرش ہے۔ اور پانی اس کے نیچے ہے۔ اس مقام میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے۔ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ۔ یعنی اس نبی نے کہا کہ اے بلقیس تو کیوں دھوکا کھاتی ہے۔ یہ تو شیش محل کے شیشے ہیں۔ جو اوپر کی سطح پر بطور فرش کے لگائے گئے ہیں۔ اور پانی جو زور سے بہ رہا ہے۔ وہ تو ان شیشوں کے نیچے ہے۔ نہ کہ یہ خود پانی ہے تب وہ سمجھ گئی۔ کہ میری مذہبی غلطی پر مجھے ہوشیار کیا گیا ہے۔ اور میں نے فی الحقیقت جہالت کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ جو سورج کی پوجا کرتی تھی۔

تب وہ خدائے واحد لاشریک پر ایمان لائی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے یقین کر لیا۔ کہ وہ طاقت عظمے جس کی پرستش کرنی چاہیے۔ وہ تو اور ہے اور میں دھوکہ میں رہی۔ اور سطحی چیز کو معبود ٹھیرا لیا۔ اور اس نبی کی تقریر کا ماحصل یہ تھا۔ کہ دنیا ایک شیش محل ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور عناصر وغیرہ جو کچھ کام کر رہے ہیں۔ در اصل ان کے کام نہیں۔ یہ تو بطور شیشوں کے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر بلقیس نے سچے دل سے سورج کی پوجا سے توبہ کی۔ اور سمجھ لیا کہ وہ طاقت ہی اور ہے۔ کہ سورج سے کام کراتی ہے۔ اور یہ تو صرف شیشے ہیں۔

(نسیم دعوت صلا)

"قرآن شریف میں ایک شہزادی بلقیس نام کا ایک عجیب قصہ لکھا ہے جو سورج کی پوجا کرتی تھی۔ شاید وید کی پیرو تھی۔ حضرت سلیمان نے اس کو بلایا اور اس کے آنے سے پہلے ایسا محل طیار کیا۔ جس کا فرش شیشے کا تھا۔ اور شیشہ کے نیچے پانی بہ رہا تھا۔ جب بلقیس نے حضرت سلیمان کے پاس جانے کا قصد کیا۔ تو اس نے اس شیشہ کو پانی سمجھا۔ اور اپنا پاجامہ پنڈلی سے اوپر اٹھا لیا۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ دھوکا مت کھا۔ یہ پانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ شیشہ ہے۔ پانی اس کے نیچے ہے۔ تب وہ عقلمند عورت سمجھ گئی۔ کہ اس پیرایہ میں میرے مذہب کی غلطی انہوں نے ظاہر کی ہے۔ اور یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ سورج اور چاند اور دوسرے روشن اجرام شیشہ کی مانند ہیں۔ اور ایک پوشیدہ طاقت ہے۔ جو ان کے پردہ کے نیچے کام کر رہی ہے۔ اور وہی خدا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اس جگہ فرمایا۔ صرح ممرد من قواریر۔ سو دنیا کو خدا نے شیش محل سے مثال دی ہے۔ جاہل ان شیشوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور دانا اس پوشیدہ طاقت کے پرستار ہیں۔ مگر وید نے اس شیش محل کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا۔ اور ان ظاہری شیشوں کو پرمیشور سمجھ لیا۔ اور پوشیدہ طاقت سے بیخبر رہا (چشمہ معرفت صفحہ ۲۷۷)

۳۵/۷۷ پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبت نفس امارہ کو ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہجاتی ہے۔ اور وہ وقت قریب آجاتا ہے۔ کہ حضرت عزت جلشانہ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کرلیں۔ اور اس پر اپنا پورا تصرّف اور دخل کرلیں۔ اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم و برہم کردیں۔ اور نفسانی قوٰے کے قریہ کو ویران کردیں اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلادیں۔ اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈالدیں۔ اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ان الملوك اذا دخلوا قریۃ افسدوھا واجعلوا اعزۃ (اہلھا) ذلۃ وکذالك یفعلون۔ اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم صہ ۹)

۴۵/۴۷ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ۔

خدا نے قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے کہ دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے۔ جس کی زمین کا فرش نہایت مصفا شیشوں سے کیا گیاہے اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا ہے۔ جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے۔ اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہئے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں۔ مگر صاف اور شفاف سو یہ بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں۔ جیسے آفتاب و ماہتاب وغیرہ یہ وہی صاف شیشے ہیں جکی غلطی سے پرستش کی گئی۔ اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے۔ جو ان شیشوں کے پردے میں پانی کیطرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے۔ اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے۔ کہ انہی شیشوں کی طرف کام کو منسوب کر رہے ہیں۔ جو ان کے نیچے کی طاقت دکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیت کریمہ کی ہے۔ جو انہ صرح ممرد

من قواریر ہے۔ غرضیکہ چونکہ خدا تعالےٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی شناخت کیلئے صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ کافی نہ تھا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۳۵)

" جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی اس آیت میں الحمد للہ رب العٰلمین اسی کیطرف اشارہ ہے یعنی مختلف رنگوں اور پیرایوں اور عالموں میں جو دنیا کا نظام قائم رکھنے کیلئے زمین و آسمان کی چیزیں کام کر رہی ہیں۔ یہ وہ نہیں کام کرتیں۔ بلکہ خدائی طاقت انکے نیچے کام کر رہی ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں بھی فرمایا۔ صرح ممرد من قواریر یعنے دنیا ایک شیش محل ہے۔ جس کے شیشوں کے نیچے زور سے پانی چل رہا ہے۔ کہ یہی شیشے ہیں۔ حالانکہ پانی ان کے نیچے ہے (نسیم دعوت ص۵۹)

" دیکھو آیت ۲۴ میں تفصیل۔

" اس جگہ ایک قرآنی نکتہ ہے جو حضرت سلیمان علیہ السّلام نے ملکہ سبا کو اس کی آفتاب پرستی کی غلطی پر آگاہ کرنے کے لئے صرح ممرد کی شکل میں دکھایا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے۔ کہ انہ صرح ممرد من قواریر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ اجرام علوی و اجسام سفلی میں نظر آتا ہے۔ جن میں سے بعض کی جاہل لوگ پرستش بھی کرتے ہیں۔ تمام یہ چیزیں ہیچ اور معدوم محض ہیں پرستش کے لائق نہیں۔ اور جو کچھ بظاہر ان میں طاقتیں نظر آتی ہیں۔ ان کی طرف منسوب کرنا ایک دھوکا ہے۔ بلکہ ایک ہی طاقت عظمیٰ ان سب کے نیچے پوشیدہ ہے۔ کہ جو درحقیقت ان سے الگ ہے۔ اور وہی یہ سب کرشمے دکھلا رہی ہے۔ جیسا اس صرح ممرد کے نیچے پانی تھا۔ اور اس صرح کا عین نہیں تھا۔ بلکہ اس سے الگ تھا۔ مگر بلقیس کی نظر سقیم میں عین دکھائی دیا تھا۔ تب ہی اس نے ان شیشوں کو یعنے پانی

کے دریا کی طرح سمجھا۔ اور اپنی پنڈلیوں پر سے پاجامہ اُٹھا لیا۔ یہ اس کو ایسا ہی دھوکا لگا تھا۔ جیسا اس کو آفتاب پرستی میں لگا تھا۔ کہ وہ طاقت عظمیٰ اس کو نظر نہ آئی کہ جو در پردہ آفتاب سے عجائب کام ظہور میں لائی۔ اور اس سے الگ تھی۔ اسی طرح دنیا ایک ایسے شیشے کی طرح ہے۔ جس کی زمین کا فرش نہایت مصفا شیشوں سے کیا گیا۔ اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا ہے۔ جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے۔ اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے۔ جیسے پانی سے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں۔ سو یہ نکتہ کہ جو تمام عالم کے انکشاف حقیقت کے لئے عمدہ ترین اصول ہے۔ اہل اللہ سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اور جس طرح اللہ جلشانہ نے بلقیس کی نسبت فرمایا ہے۔ فلما رأيته حسبته لجة وكشفت عن ساقيها قال انه صرح ممرد من قوارير۔ یعنے بلقیس نے اس شیش محل کو جس کا فرش مصفا اور شفاف شیشے تھے۔ اور نیچے ان کے پانی بہتا تھا۔ اپنی غلط فہمی سے بہتا پانی خیال کیا۔ ایسا ہی اہل اللہ کی نسبت لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یعنی وہ پانی جو انکی شیشوں کے فرش کے نیچے یعنی اُن کی فانی حالت کے تحت منجانب اللہ بہتا ہے۔ اور کبھی اپنی سختی اور کبھی اپنی نرمی دکھاتا ہے۔ اور کبھی تلخ اور شور اور بے مزہ کی صورت میں اور کبھی شیریں اور خوشگوار پانی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اور کبھی طوفان کی طرح قوت غضبی کے زور سے بہتا ہے۔ اور کبھی نہایت آہستگی اختیار کرتا ہے۔ اس پانی کو جاہل خیال کرتا ہے۔ کہ یہ نفسانی جذبات کا پانی ہے۔ اور اہل اللہ کی شان عظیم سے منکر ہو جاتا ہے۔ یا شک میں پڑ جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا نفس بہت سے صیقلوں کے شیشہ کی صفت پر آگیا ہے۔ اور جو کچھ ایک جاہل کو پانی اور پانی کا زور نظر آتا ہے۔ وہ الٰہی چشمہ ہے۔ جو اس شیشے کے نیچے بہتا ہے

(الحکم ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

" دوسرے عقلی معجزات ہیں۔ جو اس خارق عادت عقل کے ذریعہ سے ظہور پذیر

ہوتے ہیں۔ جو الہام الٰہی سے ملتی ہے۔ جیسے حضرت سلیمان کا وہ معجزہ جو صرح ممرد من قواریر ہے۔ جسکو دیکھ کر بلقیس کو ایمان نصیب ہوا۔

ازالہ اوہام صفحہ ۳۰۲

۴۹-۵۳
۲۷
وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ○ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ○ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ○ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۔

اور شہر میں نو شخص ایسے تھے۔ جن کا پیشہ ہی فساد تھا۔ اور اصلاح کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے باہم قسمیں کھائیں۔ کہ رات کو پوشیدہ طور پر شبخون مار کر اس شخص کو اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دو۔ اور پھر ہم اس کے وارثوں کو جو خون کا دعویدار ہوگا۔ کہینگے۔ کہ ہم تو ان لوگوں کے قتل کرنے کے وقت اس موقعہ پر حاضر نہ تھے۔ اور ہم سچ سچ کہتے ہیں لیئے یہ بہانہ بنائیں گے۔ کہ ہم تو قتل کرنے کے وقت فلاں فلاں جگہ گئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اب بھی مجرم لوگ ایسے ہی بہانے بنایا کرتے ہیں۔ تا مقدمہ نہ چلے۔ پھر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ تو دیکھ کہ ان کے مکر کا انجام کیا ہوگا۔ ہم نے ان کو اور ان کی تمام قوم کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ گھر جو

ویران پڑے ہوئے ہیں۔ یہ انہی کے گھر ہیں۔ ہم نے اس لئے ان کو یہ سزا دی۔ کہ یہ ہمارے برگزیدہ بندوں پر ظلم کرتے تھے۔ اور باز نہیں آتے تھے۔ پس ہمارا یہ عذاب ان لوگوں کیلئے ایک نشان ہے۔ جو جانتے ہیں۔ اور ہم نے ان ظالموں کے ہاتھ سے ان ایمانداروں کو نجات دے دی۔ جو متقی اور پرہیزگار تھے۔ سو خدا کا مکر یہ تھا۔ کہ جب شریر آدمی شرارت میں بڑھتے گئے۔ تو ایک مدت تک خدا نے اپنے ارادہ عذاب کو مخفی رکھا۔ اور جب ان کی شرارت نہایت درجہ تک پہنچ گئی۔ بلکہ انہوں نے ایک بڑا مکر کر کے خدا کے برگزیدوں کو قتل کرنا چاہا۔ تب وہ پوشیدہ عذاب خدا نے ان پر ڈالدیا۔ جس کی ان کو کچھ بھی خبر نہ تھی۔ اور ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس طرح ہم نیست و نابود کئے جائیں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ خدا کے برگزیدہ بندوں کو ستانا اچھا نہیں۔ آخر خدا پکڑتا ہے۔ کچھ مدت تک تو خدا اپنے ارادہ کو مخفی رکھتا ہے۔ اور وہی اس کا ایک مکر ہے۔ مگر جب شریر آدمی اپنی شرارت کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ تب خدا اپنے ارادہ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ پس نہایت بدقسمت وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو خدا کے برگزیدہ بندوں کے مقابل پر محض شرارت کے جوش سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں آخر خدا انکو ہی ہلاک کرتا ہے۔ اس کے بارے میں رومی صاحب کا یہ شعر نہایت عمدہ ہے۔

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

(چشمہ معرفت ۱۹۳)

۱۵/۲۷ وَمَكَرُوْا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔

یعنی کافروں نے اسلام کے مٹانے کیلئے ایک مکر کیا اور ہم نے بھی ایک مکر کیا یعنی یہ کہ ان کو اپنی مکاریوں میں بڑھنے دیا تا وہ ایسے درجہ شرارت پر پہنچ

جائیں۔ کہ جو سنت اللہ کے موافق عذاب نازل ہونے کا درجہ ہے۔ اس مقام میں شاہ عبدالقادر صاحب کیطرف سے موضح القرآن میں سے ایک نوٹ ہے۔ جس کی عبارت ہم بلفظہٖ درج کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ یعنی ان کے ہلاک ہونے کے اسباب پورے ہوتے تھے۔ جب تک شرارت حد کو نہ پہنچی۔ تب تک ہلاک نہیں ہوئے تم عبارت دیکھو صفحہ ۵۲۸ قرآن مطبع فتح الکریم ان تمام آیات سے ثابت ہوا۔ کہ عذاب الٰہی جو دنیا میں نازل ہوتا ہے۔ وہ تبھی کسی پر نازل ہوتا ہے۔ کہ جب وہ شرارت اور ظلم اور تکبر اور علو اور غلو میں نہایت کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کافر خوف سے مرا جاتا ہے۔ اور پھر بھی عذاب الٰہی کے لئے اس پر صاعقہ پڑے اور ایک مشرک اندیشہ عذاب سے جان بلب ہو۔ اور پھر بھی اس پر پتھر برسیں خداوند تعالیٰ نہایت درجہ کا رحیم اور حلیم ہے۔ عذاب کے طور پر صرف اسی کو اس دنیا میں پکڑتا ہے۔ جو اپنے ہاتھ سے عذاب کا سامان طیار کرے۔

(انوار الاسلام صد ۱۴)

۸۲-۸۳
وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً
مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا
بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ
كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ
اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا
اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَوَقَعَ الْقَوْلُ
عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝

میرے دل میں ڈالا گیا۔ کہ یہی طاعون ہے۔ اور یہی وہ دابۃ الارض ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں وعدہ تھا کہ آخری زمانہ میں ہم اس کو نکالیں گے

اور وہ لوگوں کو اس لئے کاٹیگا۔ کہ وہ ہمارے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے
جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ الخ اور جب مسیح موعود کے بھیجنے
سے خدا کی حجت ان پر پوری ہو جائے گی۔ تو ہم زمین میں سے ایک جانور نکال کر
کھڑا کریں گے۔ وہ لوگوں کو کاٹیگا اور زخمی کرے گا۔ اس لئے کہ لوگ خدا کے
نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اور پھر آگے فرمایا ہے۔ ویوم نحشر من کل الخ
ترجمہ۔ اس دن ہم ہر ایک اُمت میں سے اس گروہ کو جمع کریں گے۔ جو ہمارے نشانوں
کو جھٹلاتے تھے۔ اور ان کو ہم جدا جدا جماعتیں بنادیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ
عدالت میں حاضر کئے جائیں گے۔ تو خدائے عز وجل اُن کو کہیگا۔ کہ کیا تم نے میری
نشانوں کی بغیر تحقیق کے تکذیب کی۔ یہ تم نے کیا کیا۔ اور ان پر بوجہ ان کے ظالم
ہونے کے حجت پوری ہو جائیگی۔ اور وہ بول نہ سکیں گے۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ یہی دابۃ الارض جو ان آیات میں مذکور ہے۔ جس کا
مسیح موعود کے زمانہ میں ظاہر ہونا ابتدا سے مقرر ہے۔ یہی وہ مختلف صورتوں
کا جانور ہے جو مجھے عالم کشف میں نظر آیا۔ اور دل میں ڈالا گیا۔ کہ یہ طاعون کا کیڑا
ہے۔ اور خدا تعالےٰ نے اس کا نام دابۃ الارض رکھا ہے۔ کیونکہ زمین کے کیڑوں
میں سے ہی یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے پہلے چوہوں پر اس کا اثر ہوتا ہے
اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ انسان کو ایسا ہی ہر ایک
جانور کو یہ بیماری ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کشفی عالم میں اس کی مختلف شکلیں نظر آئیں
اور اس بیان پر کہ دابۃ الارض درحقیقت مادہ طاعون کا نام ہے۔ جس سے طاعون
پیدا ہوتی ہے۔ مفصلہ ذیل قرائن اور دلایل ہیں۔

(۱) یہ کہ دابۃ الارض کے ساتھ عذاب کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا
ہے۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْاَرْضِ یعنے جب انپر
آسمانی نشانوں اور عقلی دلایل کے ساتھ حجت پوری ہو جائے گی۔ تب دابۃ الارض
زمین سے نکالا جائیگا۔ اب ظاہر ہے کہ دابۃ الارض عذاب کے موقعہ پر زمین سے

نکالا جائے گا۔ نہ یہ کہ ایسا ہی بیہودہ طور پر ظاہر ہوگا۔ جس کا نہ کچھ نفع نہ نقصان اور اگر کہو کہ طاعون تو ایک مرض ہے۔ مگر دابۃ الارض لغوی معنوں کے رو سے ایک کیڑا ہونا چاہئے۔ جو زمین میں سے نکلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حال کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ طاعون کو پیدا کرنے والا وہی ایک کیڑا ہے۔ جو زمین میں سے نکلتا ہے۔ بلکہ ٹیکا لگانے کے لئے وہی کیڑے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور ان کا عرق نکالا جاتا ہے۔ اور خوردبین سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شکل یوں ہے (..) یعنی یہ شکل دو نقطہ گویا آسمان پر بھی نشان کسوف و خسوف دو کے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اور ایسا ہی زمین میں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے۔ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات بعض کی تفسیر ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں یہ مرکب لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد کیڑا لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ آیت فلما قضینا علیہ الموت ما دلھم علی موتہ الا دابۃ الارض تاکل منسأتہ یعنی ہم نے سلیمان پر جب موت کا حکم جاری کیا۔ تو جنات کو کسی نے ان کے مرنے کا پتہ نہ بتایا۔ مگر گھن کے کیڑے نے کہ جو سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا۔ سورۃ السبا جزو ۲۲۔ اب دیکھو اس جگہ بھی ایک کیڑے کا نام دابۃ الارض رکھا گیا ہے۔ پس اس سے زیادہ دابۃ الارض کے اصلی معنوں کی دریافت کیلئے اور کیا شہادت ہوگی۔ کہ خود قرآن شریف نے اپنے دوسرے مقام میں دابۃ الارض کے معنے کیڑا کیا ہے۔ سو قرآن کے برخلاف اس کے اور معنے کرنا یہی تحریف اور الحاد اور دجل ہے۔ (نزول المسیح ص۴۳)

۲۷/۸۳ دابۃ الارض بھی یہی طاعونی کیڑا ہے۔ بکلیم کاٹنے کو کہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ہلاک کر رہا ہے۔ (بدر۔ ۲۵۔ اپریل ۱۹۰۶ء)

؎ اور دابۃ الارض سے مراد کوئی لایعقل جانور نہیں۔ بلکہ بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ

آدمی کا نام ہی دابۃ الارض ہے۔ اور اس جگہ لفظ دابۃ الارض سے ایک ایسا طائفہ انسانوں کا مراد ہے۔ جو آسمانی روح اپنے اندر نہیں رکھتے۔ لیکن زمینی علوم و فنون کے ذریعے سے منکرین اسلام کو لاجواب کرتے ہیں۔ اور اپنا علم کلام اور طریق مناظرہ تائید دین کی راہ میں خرچ کرکے بجان و دل خدمتِ شریعت غرّا بجالاتے ہیں۔ سو وہ چونکہ درحقیقت زمینی ہیں۔ آسمانی نہیں۔ اور آسمانی روح کامل طور پر اپنے اندر نہیں رکھتے اور نہ کامل وفاداری اس لئے چہرہ ان کا تو انسانوں کا ہے مگر بعض اعضاء ان کے بعض دوسرے حیوانات سے مشابہ ہیں۔ اسی کیطرف اللہ جلشانہ اشارہ فرماتا ہے۔ واذا وقع القول الآیۃ یعنے جب ایسے دن آئیں گے۔ جو کفار پر عذاب نازل ہو اور ان کا وقت مقدر قریب آجائے گا۔ تو ہم ایک گروہ دابۃ الارض کا زمین سے نکالیں گے۔ وہ گروہ متکلمین کا ہوگا۔ جو اسلام کی حمایت میں تمام ادیان باطلہ پر حملہ کرے گا۔ یعنے وہ علماء ظاہر ہوں گے۔ جن کو علم کلام اور فلسفہ میں ید طولیٰ ہوگا۔ وہ جابجا اسلام کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اسلام کی سچائیوں کو استدلالی طور پر مشارق مغارب میں پھیلائیں گے۔ اور اس جگہ اخرجنا کا لفظ اس وجہ سے اختیار کیا۔ کہ آخری زمانہ میں ان کا خروج ہوگا۔ نہ حدوث یعنی تخمی طور پر یا کم مقدار کے طور پر تو پہلے ہی سے تھوڑے بہت ہر ایک زمانہ میں وہ پائے جائیں گے۔ لیکن آخری زمانہ میں بکثرت اور نیز اپنے کمال لائق کے ساتھ پیدا ہونگے اور حمایت اسلام میں جابجا واعظین کے منصب پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور شمار میں بہت بڑھ جائیں گے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۰۱)

" دابۃ الارض کے دو معنے ہیں۔ ایک تو وہ علماء جن کو آسمان سے حصہ نہیں ملا وہ زمین کے کیڑے ہیں۔ دوسرے دابۃ الارض سے مراد طاعون ہے۔ دابۃ الارض تاکل منساتہ قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک انسان میں معاصیت پیدا نہ ہو۔ یہ زمین کا کیڑا ہے۔ اور طاعون کی نسبت بھی سب نبیوں نے پیشگوئی کی

تھی۔ کہ مسیح کے وقت پھیلیگی تکلمہ الناس تکلیم کاٹنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور خود قرآن شریف نے ہی فیصلہ کر دیا ہے۔ اس سے آگے لکھدیا ہے کہ وہ اس لئے لوگوں کو کھائیگی۔ کہ ہمارے مامور پر ایمان نہیں لائے۔ (الحکم ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صد ۳)

۹۰/۲۷ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ۔

یعنی نیکی کرنے والوں کے دن اس نیکی سے زیادہ بدلہ ملیگا۔ اور وہ ہر ایک ڈر سے اس دن امن میں رہیں گے۔ لیکن جو شخص دنیا میں صراط مستقیم پر نہیں چلا۔ وہ اس وقت بھی چل نہیں سکیگا۔ اور دوزخ میں گرے گا۔ اور جہنم کا ہیمہ بن جائیگا۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ (اگلی آیت میں) فرماتا ہے۔ کہ (آئینہ کمالات اسلام صد ۱۴۲)

۹۱/۲۷ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَکُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

یعنی بدی کرنے والے اس دن جہنم میں گرائے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا کہ یہ جزا در حقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں۔ جو تم دنیا میں کرتے تھے۔ یعنی خدا تعالےٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ بلکہ نیکی کے اعمال جنت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہو جائیں گے۔

(آئینہ کمالات اسلام صد ۱۴۲)

۹۴/۲۷ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا

اور یہ کہ سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں۔ وہ تمہیں ایسے نشان دکھائیگا جنہیں تم شناخت کر لو گے۔

(تصدیق النبی صد ۱۵)

" اور کہہ خدا رب کامل صفتوں کا مالک ہے۔ عنقریب وہ تمہیں اپنے نشان دکھلائیگا۔ ایسے نشان کہ تم اُن کو شناخت کرلو گے۔ اور خدا تمہارے عملوں سے غافل نہیں ہے۔ (براہین صفحہ ۳۳۰)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃُ الۡقَصَصِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانٍ وَّثَمَانُوۡنَ اٰیَۃً

۳۹/۲۸ فَاَوۡقِدۡ لِیۡ یٰہَامٰنُ عَلَی الطِّیۡنِ فَاجۡعَلۡ لِّیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤی اِلٰہِ مُوۡسٰی ۙ وَ اِنِّیۡ لَاَظُنُّہٗ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ○

(یہ ایک الہام کی عبارت ہے جو آیت قرآنی کا ٹکڑا ہے۔ اس کا ترجمہ حضرت اقدس نے اپنے مناسب حال یوں بیان فرمایا ناقل) اور اس نے اس تکفیر کے منصوبے کو دلوں میں جمانے کے لئے ایک ہامان کو اپنا پیشرو بناکر اس کو کہا۔ کہ اس تکفیر کے کاروبار کو تو اپنی مہر سے پختہ کردے۔ تا اس شخص کی حقیقت کھل جائے۔ کیونکہ میں تو اس کو جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ سو اس ہامان نے ایسا ہی کیا۔ اور سب سے پہلے میرے کفر پر مہر لگائی۔ (تریاق القلوب صد۳۷)

" کہ کسی فتنہ یا آزمائش کی آگ بھڑکا تا میں موسیٰ کے خدا پر یعنی اس شخص کے خدا پر مطلع ہوجاؤں۔ کہ کیونکر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہے۔ یا نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔ (براہین احمدیہ صد۵۱)

۶۰/۲۸ وَمَا کُنَّا مُہۡلِکِی الۡقُرٰۤی اِلَّا وَ اَہۡلُہَا ظٰلِمُوۡنَ

یعنی ہمنے کبھی کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا۔ مگر صرف ایسی حالت میں کہ جب اُس کے

رہنے والے ظلم پر کمر بستہ ہوں۔

یاد رہے کہ اگرچہ شرک بھی ایک ظلم بلکہ ظلم عظیم ہے مگر اس جگہ ظلم سے مراد وہ سرکشی ہے جو حد سے گذر جائے۔ اور مفسدانہ حرکات انتہا تک پہنچ جائیں ورنہ اگر مجرد شرک ہو۔ جس کے ساتھ ایذا اور تکبر اور فساد منضم نہ ہو۔ اور ایسا تجاوز از حد نہ ہو۔ جو واعظوں پر حملہ کریں۔ اور ان کے قتل کرنے پر آمادہ ہوں۔ یا معصیت پر پورے طور پر سرنگوں ہو کر بالکل خوف خدا دل سے اٹھالیں۔ تو ایسے شرک باکی اور گناہ کے لئے وعدہ عذاب آخرت ہے اور دنیوی عذاب صرف اعتدار اور سرکشی اور حد سے زیادہ بڑھنے کیوقت نازل ہوتا ہے۔ (انوار الاسلام)

۸۹/۲۸ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قف كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

تو بجز خدا کے اور کسی سے مرادیں مت مانگ۔ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک اسی کی ذات باقی رہ جائے گی۔ اسی کے ہاتھ میں حکم ہے۔ اور وہی تمہارا مرجع ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۳۶۰)

" پھر دوسرا حصہ اس توحید کا یہ ہے کہ جیسا کوئی چیز بجز خدا کے خود بخود موجود نہیں۔ ایسا ہی ہر ایک چیز بجز خدا کے اپنی ذات میں فانی اور ہالک ہونے سے بری نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ کل شیئٍ ھالک الا وجھہ یعنے ہر ایک چیز معرض ہلاکت میں ہے۔ اور مرنے والی ہے۔ بجز خدا کی ذات کے کہ وہ موت سے پاک ہے۔ اور اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا کہ کل من علیھا فان یعنے ہر ایک جو زمین پر ہے۔ آخر مرے گا۔ پس جیسا کہ خدا نے اس آیت میں کہ وخلق کل شیئٍ ہے لفظ کل کے ساتھ جو احاطہ تام کے لئے

آتا ہے۔ ہر ایک چیز کو جو اس کے سوا ہے۔ مخلوق میں داخل کر دیا۔ ایسا ہی اس لفظ کل کے ساتھ اس آیت میں جو کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ہے اور نیز اس آیت میں کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ہے۔ ہر ایک چیز کے لئے بجز اپنی ذات کے موت ضروری ٹھیرا دی۔ پس جیسا کہ جسمی ترکیب میں اختلال ہو کر جسم پر موت آتی ہے۔ ایسا ہی روحانی صفات میں تغیرات پیدا ہو کر روح پر موت آ جاتی ہے مگر جو لوگ وجہ اللہ میں محو ہو کر مرتے ہیں۔ اور انکی زندگی خدا کی زندگی کا ایک ظل ہوتا ہے۔ اور پلید روحوں میں بھی عذاب دینے کے لئے ایک حس پیدا کی جاتی ہے۔ مگر وہ نہ مُردوں میں داخل ہوتے ہیں۔ نہ زندوں میں۔ جیسا کہ ایک شخص جب سخت درد میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو وہ بدحواسی کی زندگی اس کے لئے موت کے برابر ہوتی ہے۔ اور زمین و آسمان اس کی نظر میں تاریک دکھائی دیتے ہیں۔ چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰیَۃً

۲۹/۳ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔

یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے۔ کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بنگئے اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے۔ کہ احسب الناس الخ جب تک انسان آزمایا نہ جائے فتن میں نہ ڈالا جائے۔ وہ کب ولی بن سکتا ہے۔

الحکم ۱۷۔ جون ۱۹۰۳ء صفحہ

" دیکھو آیت ۲۹/۱ میں اس آیت کی لطیف تفسیر۔

" جب سے نبوت کا سلسلہ جاری ہوا ہے۔ یہی قانون چلا آیا ہے۔ قبل از وقت ابتلا ضرور آتے ہیں۔ تا کچوں اور پکوں میں امتیاز ہو۔ اور مومنوں اور منافقوں میں بین فرق نمودار ہو۔ اسی لئے خدا تعالٰے نے فرمایا ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یہ لوگ یہ گمان کر بیٹھے ہیں۔ کہ وہ صرف اتنا ہی کہنے پر نجات پا جائیں۔ کہ ہم ایمان لائے۔ اور ان کا کوئی امتحان نہ ہو۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں بھی امتحان اور آزمائش کا سلسلہ موجود ہے۔ جب دنیوی نظام میں یہ نظیر موجود ہے۔ تو روحانی عالم میں یہ کیوں نہ ہو۔ بغیر امتحان اور آزمائش کے حقیقت نہیں کھلتی۔ آزمائش کے لفظ سے یہ کبھی دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو جو عالم الغیب اور علیم السّر و الخفی ہے۔ امتحان یا آزمائش کی ضرورت ہے۔ اور بدون امتحان اور آزمائش کے اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا خیال کرنا نہ صرف غلطی بلکہ کفر کی حد تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰے کی عظیم الشان صفات کا انکار ہے۔ امتحان یا آزمائش سے اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ تا حقائق مخفیہ کا اظہار ہو جاوے۔ اور شخص زیر امتحان پر اس کی حقیقت ایمان منکشف ہو کر اسے معلوم ہو جائے۔ کہ وہ کہاں تک اللہ کے ساتھ صدق اخلاص اور وفا رکھتا ہے۔ اور ایسا ہی دوسرے لوگوں کو اس کی خوبیوں پر اطلاع ملے۔ پس یہ خیال باطل ہے۔ کہ اگر کوئی کرے کہ اللہ تعالیٰ جو امتحان کرتا ہے۔ تو اس سے پایا جاتا ہے اس کو علم نہیں۔ اس کو تو ذرہ ذرہ کا علم ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک آدمی کی ایمانی کیفیتوں کے اظہار کیلئے اس پر ابتلا آویں۔ اور وہ امتحان کی چکی میں پیسا جاوے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے۔

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است
زیر آں گنج کرم بنہادہ است

ابتلاؤں اور امتحانوں کا آنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے کشف حقائق نہیں ہوتا۔ الحکم ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء۔ جلد ۱

" لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ ہم مومن ہیں اور مسلمان ہیں۔ لیکن وہ اصل میں نہیں سمجھتے زبانی اقرار تو آسان بات ہے۔ لیکن کر کے دکھانا اور بات ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ احسب الناس الآیۃ یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ مومن اور پکے ایماندار ہیں۔ اور ابھی وہ آزمائے نہیں گئے۔ جب تک آزمائش نہ ہو۔ ایمان کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بہت لوگ ہیں جو آزمائش کے وقت پھسل جاتے ہیں اور تکلیف کے وقت ان کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ ایک یہودی کا قصہ لکھا ہے جو کہ ایک بڑا طبیب گذرا ہے۔ اور جس کا نام ابوالخیر تھا۔ کہ ایک دفعہ وہ ایک کوچہ میں سے گذر رہا تھا۔ جبکہ اس نے ایک شخص کو یہ پڑھتے ہوئے سُنا کہ احسب الناس الآیۃ۔ اگرچہ وہ یہودی تھا۔ اس نے آیت کو سُن کر اپنے ہاتھوں سے ایک دیوار پر ٹیک لگائی۔ اور سر جھکا کر رونے لگا۔ جب رو چکا تو اپنے گھر آیا اور جب وہ سو گیا۔ تو اس نے خواب میں دیکھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ اور انہوں نے آکر فرمایا۔ کہ اے ابوالخیر تعجب ہے تیرے جیسا فضل و کمال والا انسان مسلمان نہ ہو۔ صبح جب اٹھا تو اس نے تمام شہر میں اعلان کر دیا کہ میں آج مذہب اسلام قبول کرتا ہوں۔ (بدر ۲۸۔ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱)

" انسان بات کو تو پورا کر لیتا ہے۔ مگر ابتلا کے سامنے ٹھیرنا مشکل ہے۔ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون یعنی کیا لوگ یونہی سمجھتے ہیں۔ کہ ایمان لائیں۔ اور امتحان نہ ہو۔ غرض امتحان ضروری شے ہے۔ اس سلسلہ میں جو داخل ہوتا ہے۔ وہ ابتلاء سے خالی نہیں رہ سکتا ہمارے بہت سے لوگ ایسے ہیں۔ کہ وہ ایک طرف ہیں۔ اور ماں باپ الگ۔

الحکم صفحہ ۹۔ ۲۴۔ اگست سنہ ۱۹۰۲ء وتحفہ سالانہ صفحہ ۳۶

" قرآن شریف سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ کہ

ابتلاء آویں جیسے فرمایا أحسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون یعنی کیا لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ صرف آمنا کہنے سے چھوڑے جاویں اور وہ فتنوں میں نہ پڑیں۔ انبیاء علیہم السلام کو دیکھو ابتلاء میں کس قدر دکھ ملتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کیطرف دیکھو کہ آپ کی مکی زندگی میں کس قدر دکھ اٹھانے پڑے۔ طائف میں جب آپ گئے۔ تو اس قدر آپ کو پتھر مارے۔ کہ خون جاری ہو گیا۔ تب آپ نے فرمایا کہ کیسا وقت ہے۔ میں کلام کرتا ہوں اور لوگ منہہ پھیر لیتے ہیں۔ اور پھر کہا اے میرے رب میں اس دکھ پر صبر کروں گا جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے۔ سید عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں کہ عشق کا خاصہ ہے۔ کہ مصائب آتے ہیں۔ ... مصائب اور تکالیف پر اگر صبر کیا جاوے۔ اور خدا تعالیٰ کی قضا کے ساتھ رضا ظاہر کی جاوے۔ تو وہ مشکلکشائی کا مقدمہ ہوتی ہے ؎

ہر بلا کیں قوم را او دادہ است
زیر آں یک گنج کرم بنہادہ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی تکالیف کا نتیجہ تھا۔ کہ مکہ فتح ہو گیا۔

(الحکم ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

"مومن کو چاہیئے کہ دوسرے کے حالات سے عبرت پکڑے۔ کیا تم تعجب کرتے ہو کہ جس امتحان میں خدا تعالےٰ نے یہود کو ڈالا تھا۔ وہی امتحان تمہارا بھی کیا گیا ہو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ الم احسب الناس الخ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۲)

"کتاب بحر الجواہر میں لکھا ہے کہ ابو الخیر نام ایک یہودی تھا۔ جو پارسا طبع اور راست باز آدمی تھا۔ اور خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک جانتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بازار میں چلا جاتا تھا۔ تو ایک مسجد سے اس کو آواز آئی۔ کہ ایک لڑکا قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ رہا تھا۔ الم احسب الناس الخ یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ یونہی

وہ نجات پا جائیں گے۔ صرف اس کلمہ سے کہ ہم ایمان لائے اور ابھی خدا کی راہ میں ان کا امتحان نہیں کیا گیا۔ کہ کیا ان میں ایمان لانے والوں کی سی استقامت اور صدق اور وفا بھی موجود ہے۔ یا نہیں؟ اس آیت نے ابوالخیر کے دل پر بڑا اثر کیا۔ اور اس کے دل کو گداز کر دیا۔ تب وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر زار زار رویا۔ رات کو حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی خواب میں آئے۔ اور فرمایا۔ ابا الخیرا عجبنی ان مثلك مع کمال فضلك ینکر بنبوتی۔ یعنے اے ابوالخیر مجھے تعجب آیا کہ تیرے جیسا انسان باوجود اپنے کمال فضل اور بزرگی کے میری نبوت سے انکار کرے۔ پس صبح ہوتے ہی ابوالخیر مسلمان ہو گیا۔ اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۶)

" کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف زبانی قیل و قال پر ہی ان کو چھوڑ دیا جاویگا اور صرف اتنا کہنے سے ہی کہ ہم ایمان لے آئے۔ دیندار سمجھے جاویں گے۔ اور ان کا امتحان نہ ہوگا۔ بلکہ امتحان اور آزمائش کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یاد رکھو کہ ہمارے پاس کوئی ایسی پھونک نہیں۔ جس سے کوئی شخص یکدفعہ ابدال میں داخل ہو جائے۔ سب انبیاء کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ ترقی مدارج کے لئے آزمائش ضروری ہے اور جب تک کوئی شخص آزمائش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا۔ دیندار نہیں بن سکتا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ دُکھ کے بعد ہمیشہ راحت ہوا کرتی ہے یاد رکھو کہ جو شخص خدا کی راہ میں دُکھ اور مصیبت برداشت کرنے کے لئے طیار نہیں۔ وہ کاٹا جائے گا۔ ترقی ہمیشہ مصائب اور تکالیف کے بعد ہوتی ہے۔ اور ایمانی حالت کا پتہ اسی وقت لگتا ہے۔ جب تکالیف اور مصائب آویں۔ روحانی فوائد حاصل کرنے کے لئے پہلے اپنے آپ کو دُکھ اور تکالیف اٹھانے کے لئے تیار کر دینا چاہیے۔ شعر

عشق اوّل سرکش و خونی بود
تا گریزد هر کہ بیرونی بود

(بدر ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

"کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ بے امتحان کئے صرف زبانی ایمان کے دعوے سے چھوٹ جاویں گے۔ (براہین ص۵۰۹ و آئینہ کمالات ص۳۰۴)

"صرف قول ہی نجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس قول کے ساتھ ابتلا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھُم لا یفتنون۔ صدر اوّل کے مسلمان تھے۔ جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا۔ ہم مسلمان ہیں۔ (آخری لیکچر)

۶/۲۹ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

وہ تو بے نیاز مطلق ہے (براہین احمدیہ۔ صفحہ ۳۷۴)

۹/۲۹ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ ؕ

یعنے ہماری یہی سنت مستمرہ قدیمہ ہے۔ کہ جو لوگ ایمان لاویں۔ ہم ان کو صالحین میں داخل کر لیا کرتے ہیں۔ اب حضرت مولوی صاحب دیکھئے کہ لندخلنّہم میں نون ثقیلہ ہے لیکن اس جگہ آپ کی طرز پر معنے کئے جائیں تو اس قدر فساد لازم آتا ہے۔ جو کسی پر پوشیدہ نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑتا ہے۔ کہ یہ قاعدہ آیندہ کے لئے باندھا گیا ہے۔ اور اب تک کوئی نیک اعمال بجا لا کر صالحین میں داخل نہیں کیا گیا۔ گو آیندہ کیلئے گنہگار لوگوں کی توبہ منظور ہے۔ اور پہلے اس سے دروازہ بند رہا ہے۔ سو آپ سوچیں کہ ایسے معنے کرنا کس قدر مفاسد کو مستلزم ہے۔

(الحق دھلی ص۳۴)

۹/۲۹ اہل سلوک کے مشکلات کو اللہ تعالیٰ اٹھا دیتا ہے۔ اور ان کو صالحین میں

داخل کر دیتا ہے۔ جیسا فرماتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ

یعنے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے۔ ہم ان کو ضرور ضرور صالحین میں داخل کر دیتے ہیں۔

دفع وہم اور صلاحیت کے اقسام

اس پر بعض اعتراض کرتے ہیں کہ اعمال صالحہ کرنے والے صالحین ہوتے ہیں۔ پھر ان کو صالحین میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے اصل بات یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ صلاحیت کی دو قسم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان تکالیف شاقہ اٹھا کر نیکیوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے نیکیاں کرتا ہے۔ لیکن ان کے کرنے میں اسے تکلیف اور بوجھ معلوم ہوتا ہے اور اندر نفس کے کشاکش موجود ہوتی ہے۔ اور جب وہ نفس کی مخالفت کرتا ہے۔ تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اعمال صالحہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کا منشا ہے۔ اس وقت وہ تکالیف شاقہ اور محنتیں جو خود نیکیوں کے لئے برداشت کرتا ہے۔ اُٹھ جاتی ہیں۔ اور طبعی طور پر وہ صلاحیت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تکالیف تکالیف نہیں رہتی ہیں اور نیکیوں کو ایک ذوق اور لذت سے کرتا ہے۔ اور ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ کہ پہلا نیکی کرتا ہے۔ مگر تکلیف اور تکلف سے اور دوسرا ذوق اور لذت سے وہ نیکی اس کی غذا ہو جاتی ہے۔ جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور وہ تکلف اور تکلیف جو پہلے ہوتی تھی۔ اب ذوق وشوق اور لذت سے بدل جاتی ہے یہ مقام ہوتا ہے۔ صالحین کا جن کے لئے فرمایا۔

وَلَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ

اس مقام پر پہنچ کر کوئی فتنہ اور فساد مومن کے اندر نہیں رہتا۔ نفس کی شرارتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے جذبات پر فتح پا کر مطمئن ہو کر دار الامان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے آگے فرمایا ہے۔

۱۱/۲۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ فَاِذَآ اُوْذِیَ فِی اللّٰہِ جَعَلَ فِتْنَۃَ النَّاسِ کَعَذَابِ اللّٰہِ

اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو زبانی تو ایمان کے دعوے کرتے ہیں اور مومن ہونے کی لاف وگزاف مارتے رہتے ہیں۔ مگر جب معرض امتحان و ابتلا میں آتے ہیں۔ تو ان کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اس فتنہ و ابتلا کے وقت ان کا ایمان اللہ تعالیٰ پر ویسا نہیں رہتا۔ بلکہ شکایت کرنے لگتے ہیں اسے عذاب الٰہی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ لوگ بڑے ہی محروم ہیں۔ جن کو صالحین کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہی تو وہ مقام ہے۔ جہاں انسان ایمانی مدارج کے ثمرات کو مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اپنی ذات پر انکا اثر پاتا ہے۔ اور نئی زندگی اسے ملتی ہے۔ لیکن یہ زندگی پہلے ایک موت کو چاہتی ہے۔ اور یہ انعام و برکات امتحان و ابتلا کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ ہمیشہ عظیم الشان محنت ابتلا سے آتی ہے۔ اور ابتلا مومن کے لئے شرط ہے۔ جیسے

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لا یفتنون۔ یعنے کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں۔ کہ وہ اتنے ہی کہہ دینے پر چھوڑ دئے جاویں۔ کہ ہم ایمان لائے۔ اور وہ آزمائے نہ جاویں۔ ایمان کے امتحان کیلئے۔ مومن کو ایک خطرناک آگ میں پڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس کا ایمان اس آگ سے اسکو صحیح سلامت نکال لاتا ہے۔ اور وہ آگ اس پر گلزار ہو جاتی ہے۔ مومن ہو کر ابتلا سے کبھی بےفکر نہیں ہونا چاہئے۔ اور ابتلا پر زیادہ ثبات قدم دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور حقیقت میں جو سچا مومن ہے۔ ابتلا میں اسکے ایمان کی حلاوت اور لذت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے عجائبات پر اس کا ایمان بڑھتا ہے۔ اور وہ پہلے سے بہت زیادہ خدا کی طرف توجہ کرتا اور دعاؤں سے فتحیاب اجابت پاتا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ انسان خواہش تو واسطے مدارج اور مراتب کی کرے۔ اور ان تکالیف سے

بچنا چاہیے۔ جو ان کے حصول کیلئے ضروری ہیں۔

یقیناً یاد رکھو کہ ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے۔ اس کے بغیر ایمان ایمان کامل ہوتا ہی نہیں۔ اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلا ملتی ہی نہیں۔ دنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے۔ کہ دنیوی آسائشوں اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے قسم قسم کی مشکلات اور رنج وتعب اٹھانے پڑتے ہیں۔ طرح طرح کے امتحان میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے۔ اور پھر بھی وہ محض خدا تعالےٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر خدا تعالےٰ جیسی نعمت عظمےٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں۔ یہ بدون امتحان کیسے میسّر آسکے۔ پس جو چاہتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کو پاوے۔ اسے چاہیئے کہ وہ ہر ایک ابتلا کے لئے طیار ہو جاوے جب اللہ تعالےٰ کوئی سلسلہ قائم کرتا ہے۔ جیسا کہ اس وقت اس نے اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ تو جو لوگ اس میں اوّلاً داخل ہوتے ہیں۔ ان کو قسم قسم کی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہر طرف سے گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ۔ یہاں تک کہ ان کو کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو یہاں سے نکال دیں گے۔ یا اگر ملازم ہے تو اس کے موقوف کرانے کے منصوبے ہوتے ہیں۔ جس طرح ممکن ہوتا ہے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں۔ اور اگر ممکن ہو۔ تو جان لینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ ایسے وقت میں جو لوگ ان دھمکیوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ اور امتحان کے ڈر سے کمزوری ظاہر کرتے ہیں۔ یاد رکھو خدا تعالےٰ کے نزدیک ان کے ایمان کی ایک پیسہ بھی قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ابتلاء کے وقت خدا سے نہیں انسان سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وجبروت کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ بالکل ایمان نہیں لایا کیونکہ دھمکی کو اس کے مقابلہ میں وقعت دیتا اور ایمان چھوڑنے کو طیار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صالحین میں داخل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ اور مفہوم ہے اس آیت کا۔

ومن الناس من یقول اٰمنّا فاذا اوذی فی اللہ

(الحکم صفحہ۱۔ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء)

18/29 اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ط

تم اے مشرکو بجز خدا کے صرف بے جان بتوں کی پرستش کرتے ہو۔ اور سراسر جھوٹ پر جم رہے ہو۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۳)

44/29 وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ط

یعنے یہ مثالیں ہم لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں۔ پر ان کو معقول طور پر وہی سمجھتے ہیں۔ کہ جو صاحب علم اور دانشمند ہیں۔ (براہین احمدیہ صـ ۲۷۱)

49 و 50/29 وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ۔

اور اس سے پہلے تو کسی کتاب کو نہیں پڑہتا تھا۔ اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا تا باطل پرستوں کو شک کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوتی۔ بلکہ وہ آیات بیّنات ہیں۔ جو اہل علم لوگوں کے سینوں میں ہیں۔ اور ان سے انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔ ان آیات سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمی ہونا کمال وضاحت ثابت ہورہا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فے الحقیقت امی اور ناخواندہ نہ ہوتے۔ تو بہت سے لوگ اس دعوٰۓ امیّت کی تکذیب کرنے والے پیدا ہوجاتے۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے کسی ایسے ملک میں یہ دعوٰے نہیں کیا تھا۔ کہ جس ملک کے لوگوں کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے حالات اور واقعات سے بیخبر اور ناواقف قرار دے سکیں۔ بلکہ
وہ تمام لوگ ایسے تھے۔ جن میں آنحضرتؐ نے ابتدا عمر سے نشوونما پایا تھا
اور ایک حصہ کلاں عمر اپنی کا انکی مخالطت اور مصاحبت میں بسر کیا تھا۔ پس
اگر فی الواقعہ صاحب ممدوح امی نہ ہوتے۔ تو ممکن نہ تھا۔ کہ اپنے امی ہونے
کا ان لوگوں کے سامنے نام بھی لے سکتے۔ جن پر کوئی حال ان کا پوشیدہ نہ
تھا۔ اور جو ہر وقت اس گھات میں لگے ہوئے تھے۔ کہ کوئی خلاف گوئی ثابت
کریں۔ اور اس کو مشتہر کر دیں۔ جنکا عناد اس درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ کہ اگر بس
چلتا تو کچھ جھوٹ موٹ ہی سے ثبوت بنا کر پیش کر دیتے۔ اور اسی جہت سے ان کو
انکی ہر ایک بدظنی پر ایسا مسکت جواب دیا جاتا تھا۔ کہ وہ ساکت اور لاجواب
رہ جاتے تھے۔ (براہین صفحہ ۴۷۸)

۵۰-۴۸ / ۲۹ پھر مضمون پڑھنے والے نے بیان کیا۔ کہ قرآن بائیبل کی نقل ہے۔ اس
سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی بیباکی اور دروغگوئی میں کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے
دنیا میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ قرآن شریف تئیس ۲۳ برس برابر
یہود اور نصاریٰ کے روبرو اترتا رہا۔ مگر کسی نے یہ اعتراض نہ کیا۔ کہ قرآن شریف
بائیبل کی نقل ہے۔ اور خود ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم امی
تھے۔ اور نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے۔ اور نصاریٰ اور یہود کے علماء سخت
دشمن تھے۔ اس صورت میں کیونکر ممکن تھا۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
نصاریٰ اور یہود کی کتابوں میں سے کچھ نقل کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں
قرآن شریف میں یہ آیات ہیں۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ط فَالَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ج وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ
وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ○ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ
وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ

بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ

(ترجمہ) اور اے پیغمبر جس طرح اگلے پیغمبروں پر ہم نے کتابیں اتاری تھیں اسی طرح تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ پس جنکو تجھ سے پہلے ہم نے کتاب دی ہے۔ ان کے مجدا اور سعید لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان مشرکین اہل مکہ سے بھی سوچنے والے لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اور ان دونوں فرقوں میں سے وہ لوگ ایمان نہیں لاتے جنہوں نے دیدہ دانستہ کفر کو اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ اور اے پیغمبر قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے تھے۔ اور نہ تم اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان بے دین لوگوں کو شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہوتی۔ مگر اب تو ان کا شبہ سراسر ہٹ دھرمی ہے۔ یعنی جبکہ یہ امر ثابت شدہ ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم محض ناخواندہ اور امی تھے۔ اور کوئی نہیں ثابت کر سکا۔ کہ آپ لکھ سکتے یا پڑھ سکتے تھے۔ تو پھر ایسے شبہات ایمانداری کے برخلاف ہیں۔ اور پھر فرمایا کہ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآن شریف کے حقائق اور معارف کا علم دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک تو قرآن شریف خدا کے کھلے کھلے نشان ہیں۔ یعنی اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو قرآن شریف میں تدبر نہیں کرتے۔ اور اس کے معجزانہ مرتبہ سے بےخبر ہیں۔ اور تدبر کرنے والے تو ایک ہی نظر سے شناخت کر جاتے ہیں کہ یہ کلام انسانی طاقتوں سے برتر ہے۔ کیونکہ وہ اعجازی صفت اپنے اندر رکھتا ہے

(چشمہ معرفت صـ۲۵۳)

$\frac{۵۰}{۲۹}$ قرآن بحیثیت ذکر ہونے کے قیامت تک محفوظ رہیگا۔ اور اس کے حقیقی ذاکر ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اس پر ایک اور آیت بھی بیّن قرینہ ہے اور وہ یہ ہے۔ بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی قرآن بینات ہیں۔ جو اہل علم کے سینوں میں ہیں پس ظاہر ہے۔ کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں۔ کہ مومنوں کو قرآن کریم کا علم اور نیز اس پر عمل عطا گیا ہے۔ اور جبکہ قرآن کی جگہ

مومنوں کے سینے ٹھیر گئے۔ تو پھر یہ آیت کہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون بجز اس کے اور کیا معنے رکھتی ہے۔ کہ قرآن سینوں سے محو نہیں کیا جاوے گا جس طرح کہ توریت اور انجیل یہود اور نصاریٰ کے سینوں سے محو کی گئی۔ اور گو توریت اور انجیل ان کے ہاتھوں اور ان کے صندوقوں میں تھی۔ لیکن ان کے دلوں میں محو ہو گئی یعنے ان کے دل اس پر قائم نہ رہے۔ اور انہوں نے توریت اور انجیل کو اپنے دلوں میں قائم اور بحال نہ رکھا۔ غرض یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے۔ کہ کوئی حصہ تعلیم قرآن کا برباد اور ضائع نہیں ہوگا۔ اور جس طرح روز اول سے اس کا پودہ دلوں میں جمایا گیا ہے۔ یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہیگا۔

(شہادۃ القرآن صفحہ ۵۲)

۵۱-۵۴/۲۹ وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ....

.... وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

یعنے کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتریں اس پر نشانیاں (جو تم مانگتے ہو یعنی عذاب کی نشانیاں) وہ تو خدا تعالےٰ کے پاس اور خاص اس کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں یعنی میرا کام فقط یہ ہے۔ کہ عذاب کے دن سے ڈراؤں نہ یہ کہ اپنی طرف سے عذاب نازل کروں۔ اور پھر فرمایا۔ کیا ان لوگوں کیلئے (جو اپنے پر کوئی عذاب کی نشانی وارد کرانی چاہتے ہیں) یہ رحمت کی نشانی کافی نہیں۔ جو ہمنے

تجھ پر (اے رسُول امی) وہ کتاب (جو جامع کمالات ہے) نازل کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ یعنی قرآن شریف جو ایک رحمت کا نشان ہے۔ جس سے درحقیقت وہی مطلب نکلتا ہے۔ جو کفار عذاب کے نشانوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ کفار مکّہ اس غرض سے عذاب کا نشان مانگتے تھے۔ کہ تا وہ ان پر وارد ہو کر انہیں حق الیقین تک پہنچا دے۔ صرف دیکھنے کی چیز نہ رہے۔ کیونکہ مجرد رؤیت کے نشانوں میں انکو دہوکے کا احتمال تھا۔ اور چشم بندی کا خیال۔ سو اس وہم اور اضطراب کو دُور کرنے کے لئے فرمایا۔ کہ ایسا ہی نشان چاہتے ہو جو تمہارے وجودوں پر وارد ہو جائے تو پھر عذاب کے نشان کی کیا حاجت ہے؟ کیا اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے رحمت کا نشان کافی نہیں یعنی قرآن شریف جو تمہاری آنکھوں کو اپنے پُر نور اور تیز شعاعوں سے خیرہ کر رہا ہے۔ اور اپنی ذاتی خوبیاں اور اپنے حقائق اور معارف اور اپنی فوق العادت خواص اس قدر دکھلا رہا ہے۔ جس کے مقابلہ اور معاوضہ کی تم عاجز رہ گئے ہو۔ اور تم پر اور تمہاری قوم پر ایک خارق عادت اثر ڈال رہا ہے اور دلوں پر وارد ہو کر عجیب در عجیب تبدیلیاں دکھلا رہا ہے۔ مدت ہائے دراز کے مردے اس سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور مادر زاد اندھے بیشمار پشتوں سے اندھے ہی چلے آتے تھے۔ آنکھیں کھول رہے ہیں۔ اور کفر اور الحاد کی طرح طرح کی بیماریاں اس سے اچھی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور تعصب کے سخت جذامی اس سے صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے نور ملتا ہے۔ اور ظلمت دور ہوتی ہے۔ اور وصل الٰہی میسر آتا ہے۔ اور اس کے علامات پیدا ہوتے ہیں۔ تم کیوں اس رحمت کے نشان کو چھوڑ کر جو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے۔ عذاب اور موت کا نشان مانگتے ہو۔ پھر بعد اس کے فرمایا۔ یہ قوم تو جلدی سے عذاب مانگتی ہے۔ رحمت کی نشانوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتی۔ ان کو کہدے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ کہ عذاب کی نشانیاں وابستہ باوقات ہوتی ہیں۔ تو عذابی نشانیاں کبھی کی نازل ہو گئی ہوتیں۔ اور عذاب ضرور آئیگا۔ کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

اب انصاف سے دیکھو کہ اس آیت میں کہاں معجزات کا انکار پایا جاتا ہے۔ یہ آیتیں تو بآواز بلند پکار رہی ہیں۔ کہ کفار نے ہلاکت اور عذاب کا نشان مانگا تھا۔ سو اول کہا گیا کہ دیکھو تم میں زندگی بخش نشان موجود ہے۔ یعنی جو تم پر وارد ہو کر تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ ہمیشہ کی حیات بخشتا ہے۔ مگر جب عذاب کا نشان تم پر وارد ہوا تو وہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ پس کیوں تم ناحق اپنا مرنا ہی چاہتے ہو۔ اور اگر عذاب ہی مانگتے ہو۔ تو یاد رکھو وہ بھی جلد آئے گا پس اللہ جلشانہ نے ان آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا۔ اور قرآن شریف میں جو رحمت کے نشان ہیں۔ اور دلوں پر وارد ہو کر اپنا خلق عادت اثر ان پر ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دلائی۔ پر معترض کا یہ گمان کہ اس آیت میں لا نافیہ معجزات کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔ جس سے کل معجزات کی نفی لازم آتی ہے محض صرف دنحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ نفی کا اثر اسی حد تک محدود ہوتا ہے۔ جو متکلم کے ارادہ میں متعین ہوتی ہے۔ خواہ وہ ارادہ تصریحاً بیان کیا گیا ہو۔ یا اشارۃً مثلاً کوئی کہے کہ اب سردی کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے بلدہ کی حالت موجودہ کے موافق کہا ہے۔ اور گو اس نے بظاہر اپنے شہر کا نام بھی نہیں لیا۔ مگر اس کے کلام سے یہ سمجھنا کہ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ کل کوہستانی ملکوں سے بھی سردی جاتی رہی۔ اور سب جگہ سخت اور تیز دھوپ پڑنے لگی۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کرنا۔ کہ جس لا کو اس نے استعمال کیا ہے۔ وہ نفی جنس کا لا ہے جس کا تمام جہان پر اثر پڑنا چاہیے۔ درست نہیں۔ مکہ کے مغلوب بت پرست جنہوں نے آخر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آنجناب کے معجزات کو معجزہ کر کے مان لیا اور جو کفر کے زمانے میں بھی صرف خشک منکر نہیں تھے بلکہ روم اور ایران میں بھی جا کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متعجبانہ خیال سے ساحر مشہور کرتے تھے۔ اور گو بیجا پیرایوں میں ہی سہی مگر نشانوں کا اقرار کر لیا

کرتے تھے۔ جن کے اقرار قرآن شریف میں موجود ہیں۔ وہ اپنے ضعیف اور کمزور کلام میں جو انوار ساطعہ نبوت محمدیہ کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ کیونکہ لا نافیہ استعمال کرنے لگے۔ اگر ان کو ایسا ہی لمبا چوڑا انکار ہوتا۔ تو وہ بالآخر نہایت درجہ کے یقین سے جو انہوں نے اپنے خونوں کے بہانے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے سے ثابت کر دیا تھا۔ مشرف باسلام کیوں ہو جاتے۔ اور کفر کے ایام میں جو ان کے بار بار کلمات قرآن شریف میں درج ہیں۔ وہ یہی ہیں۔ کہ وہ اپنی کوتاہ بینی کے دھوکہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ساحر رکھتے تھے۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ کہ وَإِنْ يَّرَوْا آيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ یعنے جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ پکا جادو ہے پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَعَجِبُوْا أَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ۔ یعنے انہوں نے اس بات سے تعجب کیا۔ کہ انہی میں سے ایک شخص انکی طرف بھیجا گیا۔ اور بے ایمانوں نے کہا۔ کہ یہ تو جادوگر کذاب ہے؛

اب ظاہر ہے کہ جبکہ وہ نشانوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد انہیں نشانوں کو معجزہ کرکے مان بھی لیا اور جزیرہ کا جزیرہ مسلمان ہو کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک معجزات کا ہمیشہ کے لئے سچے دل سے گواہ بن گیا۔ تو پھر ایسے لوگوں سے کیونکر ممکن ہے۔ کہ وہ عام طور پر نشانوں سے صاف منکر ہو جاتے اور انکار معجزات میں ایسا لا نافیہ استعمال کرتے۔ جو اُن کی حد حوصلہ سے باہر اور اُن کی مستمرہ رائے سے بعید تھا۔ بلکہ قرآن سے آفتاب کی طرح ظاہر ہے کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے۔ کہ کیوں اس پیغمبر پر کوئی نشانی نہیں اتری۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا ہے۔ کہ ان کا مطلب

یہ ہے۔ کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟
اب قصہ کوتاہ یہ کہ آپ نے آیت متذکرہ بالا کے لَا نافیہ کو قرآن
کی حد سے زیادہ کھینچ دیا ہے۔ ایسا لَا نافیہ عربوں کے کبھی خواب میں بھی
نہیں آیا ہوگا۔ ان کے دل تو اسلام کی حقیقت سے بھرے ہوئے تھے۔ تب
ہی تو سب کے سب بجز معدودے چند کہ جو اس عذاب سے بچ گئے تھے جبکہ

؎ واضح ہو کہ قرآن شریف میں نشان مانگنے کے سوالات کفار کی طرف سے صرف ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات میں یہی سوال کیا گیا ہے۔ اور ان سب مقامات کو نظر یکجائی دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار مکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین قسم کے نشان مانگا کرتے تھے۔ (۱) وہ نشان جو عذاب کی صورت میں فقط اپنے اختراع سے کفار مکہ نے طلب کئے تھے۔ (۲) دوسرے وہ نشان جو عذاب کی صورت یا مقدمۂ عذاب کی صورت میں پہلی امتوں پر وارد کئے گئے تھے۔ (۳) تیسرے وہ نشان جن سے پردۂ غیبی بکلی اٹھ جائے۔ جس کا اٹھ جانا ایمان بالغیب کے بکلی برخلاف ہے۔ سو عذاب کے نشان ظاہر ہونے کے لئے جو سوال کئے گئے ہیں ان کا جواب تو قرآن مجید میں یہی دیا گیا ہے۔ کہ تم منتظر رہو۔ عذاب نازل ہوگا۔ ہاں ایسی صورت کا عذاب نازل کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ جبکی پہلی تکذیب ہو چکی ہے تاہم عذاب نازل ہونیکا وعدہ دیا گیا ہے۔ جو آخر غزوات کے ذریعہ سے پورا ہو گیا لیکن تیسری قسم کا نشان دکھلانے سے بکلی انکار کیا گیا ہے۔ اور خود ظاہر ہے کہ ایسے سوال کا جواب انکار ہی تھا۔ نہ اور کچھ۔ کیونکہ کفار کہتے تھے کہ ہم تب ایمان لائینگے کہ جب ہم ایسا نشان دیکھیں۔ کہ زمین سے آسمان تک ایک نردبان رکھی جاوے۔ اور تو ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نردبان کے ذریعہ سے زمین سے آسمان پر چڑھ جائے اور فقط تیرا آسمان پر چڑھنا ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ جب تک آسمان سے ایک ایسی کتاب دلاوے۔ جسکو ہم پڑھ لیں۔ اور پڑھیں بھی اپنے ہاتھ میں لیکر یا تو ایسا کرکہ

ان کو وعدہ دیا گیا تھا۔ بالآخر مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ اور یاد رہے کہ ایسا آلا نافیہ حضرت مسیح کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے فریسیوں نے مسیح کے نشانات طلب کئے۔ اس نے آہ کھینچکر کہا۔ کہ اس زمانہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴

مکہ کی زمین میں جو ہمیشہ بیابانی کی تکلیف رہتی ہے۔ شام اور عراق کے ملک کی طرح نہریں جاری ہو جائیں۔ اور جسقدر ابتدا دنیا سے آجتک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں۔ سب زندہ ہوکر آجائیں اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو۔ کیونکہ وہ بڈھا ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ اس سے ہم پوچھینگے کہ تیرا دعوے حق ہے یا باطل۔ یہ سخت سخت خود تراشیدہ نشان تھے۔ جو وہ مانگتے تھے اور پھر بھی نہ صاف طور پر بلکہ شرط پر شرط لگانے سے جن کا ذکر قرآن شریف میں جابجا آیا ہے۔ پس سوچنے والے کے لئے عرب کے شریروں کی ایسی درخواستیں ہمارے سید و مولے نبی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات ظاہرہ و آیات بینہ و رسولانہ ہیبت پر صاف اور کھلی کھلی دلیل ہے۔ خدا جانے ان دل کے اندھوں کو ہمارے مولے و آقا محمد مصطفے صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انوار صداقت نے کس درجہ تک عاجز و تنگ کر رکھا تھا اور کیا کچھ آسمانی تائیدات و برکات کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ کہ جن سے خیرہ ہوکر اور جن کی ہیبت سے منہ پھیر کر سراسر ٹالنے اور بھاگنے کی غرض سے ایسی دور از صواب درخواستیں پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معجزات کا دکھلانا ایمان بالغیب کی حد سے باہر ہے۔ یوں تو اللہ جلشانہ قادر ہے۔ کہ زمین سے آسمان تک زینہ رکھدیوے جسکو سب لوگ دیکھ لیویں۔ اور دو چار ہزار کیا دو چار کروڑ آدمیوں کو زندہ کر کے ان کے منہ سے انکی اولاد کے سامنے صدق نبوت کی گواہی دلا دیوے۔ یہ سب کچھ وہ کر سکتا ہے۔ مگر ذرا سوچ کر دیکھو۔ کہ اس انکشاف تام سے ایمان بالغیب جو مدار ثواب و اجر ہے۔ دور ہو جاتا ہے۔ اور دنیا نمونہ محشر ہو جاتی ہے ٭

پس جس طرح قیامت کے میدان میں جو انکشاف تام کا وقت ہوگا۔ ایمان کام نہیں آتا

کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں. میں تم سے سچ کہتا ہوں. اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائیگا. دیکھو مرقس باب ۸ ؎

اب دیکھو کیسا حضرت مسیحؑ نے صفائی سے انکار کر دیا ہے. اگر غور فرمائیں تو آپ کا اعتراض اس اعتراض کے آگے کچھ بھی چیز نہیں. کیونکہ آپ نے فقط کفار کا انکار پیش کیا. اور وہ بھی نہ عام انکار بلکہ خاص نشانات کے بارے میں اور ظاہر ہے کہ دشمن کا انکار بکلی قابل اطمینان نہیں ہوتا. کیونکہ دشمن خلاف واقعہ بھی کہہ جاتا ہے. مگر حضرت مسیحؑ تو آپ اپنے منہہ سے معجزات دکھلانے سے انکار کر رہے ہیں. اور نفی صدور معجزات کو زمانہ کے ساتھ متعلق کر دیا ہے اور فرماتے ہیں. کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائیگا. پس اس سے بڑھ کر نشان معجزات کے بارے میں اور کونسا بیان واضح ہو سکتا ہے. اور اس لا نافیہ سے بڑھ کر اور کونسا لا نافیہ ہوگا؟۔

۲۹ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

یعنے جو لوگ ہماری راہ میں اور ہماری طلب کے لئے طرح طرح کی کوششیں اور محنتیں کرتے ہیں. ہم ان کو اپنی راہ دکھلا دیتے ہیں (لکچر لاہور صفحہ ۱۱)

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

...اسیطرح اس انکشاف تام سے بھی ایمان لانا کچھ مفید نہیں. بلکہ ایمان اسی حد تک ایمان کہلاتا ہے. کہ جب کچھ اخفا بھی باقی رہے. جب سارے پردے کھل گئے تو پھر ایمان ایمان نہیں رہتا. اسیوجہ سے سارے نبی ایمان بالغیب کی رعایت سے معجزے دکھلاتے رہے ہیں کبھی کسی نبی نے ایسا نہیں کیا کہ ایک شہر کا شہر زندہ کر کے ان سے اپنی نبوت کی گواہی دلاوے. یا آسمان تک نردبان رکھ کر اور سب کے روبرو چڑھ کر تمام دنیا کو تماشا دکھلاوے

تفسیر حاشیہ ... صفحہ ۲۷۳

وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ؕ

جو ہماری راہ میں مجاہدہ کرے گا۔ ہم اس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے۔ اور اُدہر یہ دعا ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم سو انسان کو چاہیے کہ اسکو مدنظر رکھ کر نماز میں بالحاح دعا کرے اور تمنا رکھے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہو جاوے۔ جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اُٹھایا جاوے (تحفہ سالانہ صٓ۳۹)

" یعنی جو لوگ ہماری راہ میں جو صراط مستقیم ہے۔ مجاہدہ کریں گے تو ہم ان کو اپنی راہیں بتلا دیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کی راہیں وہی ہیں۔ جو انبیاء کو دکھلائی گئیں تھیں (شہادۃ القرآن صٓ۵۳)

" اور پھر وہ لوگ (صحابہ کرام) روح القدس کی طاقت سے بہرہ ور ہو کر ان مجاہدات میں لگے کہ اپنے پاک اعمال کے ساتھ شیطان پر غالب آجائیں۔ تب انہوں نے خدا کے راضی کرنے کے لئے ان مجاہدات کو اختیار کیا۔ کہ جن سے بڑھ کر انسان کے لئے منصوبہ نہیں۔ انہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی خس و خاشاک کی طرح بھی قدر نہ کی۔ آخر وہ قبول کئے گئے۔ اور خدا نے ان کے دلوں کو گناہ سے بکلی بیزار کر دیا اور نیکی کی محبت ڈالدی جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیا کرتے ہیں۔ (چشمہ معرفت صٓ۵۵)

" بھلا یہ کیونکر ہو سکے۔ کہ جو شخص نہایت لاپرواہی سے سستی کرتا ہے۔ وہ ایسا ہی خدا کے فیض سے مستفیض ہو جائے۔ جیسے وہ شخص کہ جو تمام عقل اور تمام زور اور تمام اخلاص سے اسکو ڈھونڈھتا ہے۔ اسی کیطرف ایکدوسرے مقام میں بھی

اللہ تعالے نے اشارہ فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ والذین جاھدوا الخ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کو بالضرور اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔ براہین صفحہ ۴۷۵

" اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم پر مندرجہ ذیل حاشیہ رقم فرمایا ہے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ جب انسان سچے دین پر ہو تو اعمال صالحہ بجالانے سے خداتعالیٰ کیطرف سے ایک انعام پاتا ہے۔ اسی طرح سنت الٰہی جاری ہے۔ کہ سچے دین والا صرف اس حد تک ٹھیرایا نہیں جاتا۔ جس حد تک وہ اپنی کوشش سے چلتا ہے۔ اور اپنی سعی سے قدم رکھتا ہے۔ بلکہ جب اس کی کوشش حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اور انسانی طاقتوں کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ تب عنایت الٰہی اسکے وجود میں اپنا کام کرتی ہے۔ اور ہدایت الٰہی اس مرتبہ تک اس کو علم اور عمل اور معرفت میں ترقی بخشتی ہے۔ جس مرتبہ تک وہ اپنی کوشش سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالے فرماتا ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ اختیار کرتے ہیں۔ اور جو کچھ راہ سے اور ان کی قوتوں سے ہو سکتا ہے۔ بجالاتے ہیں تب عنایت حضرت احدیت انسان کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ اور جو کام ان سے نہیں ہو سکتا وہ آپ کر دکھلاتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص ۱۳۱)

" پس جسطرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے۔ کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے۔ اور وہ نتیجہ خدا تعالے کا فعل ہے۔ ایسا ہی دین کے متعلق بھی قانون ہے۔ جیسا کہ خدا تعالے ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا........ یعنی جو لوگ اس فعل کو بجالائے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی۔ تو اس فعل کے

لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا۔ کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیں گے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۰۶)

" اور جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ اور ہماری طلب میں کوشش کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔ انہیں کے لئے ہمارا یہ قانون قدرت ہے۔ کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھلایا کرتے ہیں۔ سو خدا کی راہ میں سب سے اوّل قربانی دینے والے نبی ہیں۔ ہر ایک اپنے لئے کوشش کرتا ہے مگر انبیا علیہم السلام دوسروں کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ لوگ سوتے ہیں اور وہ ان کے لئے جاگتے ہیں۔ اور لوگ ہنستے ہیں اور وہ ان کے لئے روتے ہیں۔ اور دنیا کی رہائی کیلئے ہر ایک مصیبت کو بخوشی اپنے پر وارد کر لیتے ہیں (حقیقۃ الوحی ص۱۴۳)

" پس یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان بغیر اعمال کے ایسا ہے۔ جیسے کوئی باغ بغیر انہار کے۔ جو درخت لگایا جاتا ہے۔ اگر مالک اس کی آبپاشی کی طرف توجہ نہ کرے تو ایکدن میں خشک ہو جائیگا۔ اسی طرح ایمان کا حال ہے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا یعنی تم ہلکے ہلکے کام پر نہ رہو۔ بلکہ اس راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہے۔ نفس کو بیل سے مشابہت دی گئی ہے۔

(آخری لیکچر ص۷)

" والذین جاھدوا الآیۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ جو حق کوشش کا اس کے ذمہ ہے۔ اسے بجا لائے۔ یہ نہ کرے کہ اگر پانی ۲۰ ہاتھ نیچے کھودنے سے نکلتا ہے۔ تو وہ صرف دو ہاتھ کھود کر ہمت ہار دے۔ ہر ایک کام میں کامیابی کی یہی جڑ ہے۔ کہ ہمت نہ ہارے۔

(تقریریں صفحہ ۳۵)

" جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ اور کریں گے ہم ان کو اپنی راہیں دکھلا رہے ہیں۔ اور دکھلائیں گے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ اگر اس جگہ مجرد استقبال مراد لیا جائے۔ تو اس سے معنے فاسد ہو جائیں گے۔ اور یہ کہنا پڑے گا کہ یہ وعدہ صرف آئندہ کے لئے ہے۔ اور حال میں جو لوگ مجاہدہ میں مشغول ہیں۔ یا پہلی مجاہدات بجا لا چکے ہیں۔ وہ خدا تعالےٰ کی راہوں سے بے نصیب ہیں۔ بلکہ اس آیت میں عادت مستمرہ جاریہ دائرہ بین الازمنۃ الثلثہ کا بیان ہے۔ جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ہماری یہی عادت ہے کہ مجاہدہ کرنے والوں کو اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔ کسی زمانہ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ سنت مستمرہ دائرہ سائرہ کا بیان ہے جس کے اثر سے کوئی زمانہ باہر نہیں (الحق دہلی صفحہ ۳۲۳)

" جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے۔ انہی کو یہ راہ ملیگی۔ الحکم ۱۷۔ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۵

" مجاہدہ ایک ایسی شے ہے کہ اس کے بدون انسان کسی ترقی کے بلند مقام کو پا نہیں سکتا۔ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ والذین جاهدوا فینا الایۃ جو لوگ ہم میں ہو کر مجاہدہ کرتے ہیں۔ ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ غرض مجاہدہ کرو اور خدا میں ہو کر کرو۔ تاکہ خدا کی راہیں تم پر کھلیں۔ الحکم بت ۲ جولائی ۱۹۰۱ء

" ہمارے راہ کے مجاہد رستہ پاویں گے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس راہ میں پیغمبر کے ساتھ ملکر مجاہد کا کام نہیں۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے طیار رہنا اس کا کام ہے۔ الحکم ۱۰ اجون ۱۹۰۳ء صفحہ ۷ فقط

اللّٰھم اغفر لکاتبہ ولمن سعی فیہ ولوالدیھم اجمعین